عظمتوں کے سفیر

محققِ عصر حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ

ترتیب و تہذیب:

محمد کاشف رضا

الحقائق پبلی کیشنز

عظمتوں کے سفیر

محققِ عصر حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ تعالیٰ

ترتیب وتذہیب : محمد کاشف رضا

الحقائق پبلی کیشنز

نام کتاب عظمتوں کے سفیر

مصنف محقق عصر حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ

ترتیب و تذہیب محمد کاشف رضا

سنِ اشاعت فروری 2022ء

صفحات 384

تعداد 500

مطبع اے ایس پرنٹرز ملک پارک لاہور

الحقائق پبلی کیشنز دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور

kashifraza786678@gmail.com
0333-7861895 0300-1090045

عنوانات

مقاماتِ صوفیہ

خودنوشت

مشاہیر علماء امرتسر

شخصیات

حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے رفیق کار

صاحبِ درد و سوز میاں محمد شفیع رضوی مرحوم کے نام

جن کی علمی صحبتیں اس خاکسار کو میسر آئیں۔

خاکِ راہِ دردمنداں

محمد کاشف رضا

میکدۂ علم کا ساقی

محمد کاشف رضاؔ

(مدیر اعلیٰ ماہنامہ جہانِ رضا)

حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمہ اللہ (1927ء/1999ء) میرے فکری نقوش کے اولیں معماروں میں سے تھے، نہایت بلند پایہ اور نستعلیق شخصیت تھے، خلوص و ایثار کے، علم دوستی کے اور صوفی دل کے مالک تھے۔ ریلوے روڈ لاہور میں اُن کا مطب روحانی وجسمانی شفاخانہ تھا، علم وفن کا وہ کونسا موضوع ہوگا جس کے ماہرین اور طلباء میں نے وہاں نہ دیکھے؟ ابنِ بطوطہ اس زمانے میں ہوتا اور اُس کا گزر حکیم صاحب کے مطب ہوجاتا تو وہ ایک باب علم وحکمت کے اس دانشکدے پہ ضرور لکھتا، بغداد ونیشاپور اور ثمرقند و بخارا کی علمی مجالس کی جھلک اس مطب میں جھلکتی تھی۔ میں اس میکدۂ علم کا ایک معمولی سا بادہ کش تھا، جس کو نمود ونمائش اور علمی دھاک بٹھانے سے نفرت ہوگئی، فروغِ علم کا وہ قافلہ جس کے میرِ کارواں حکیم صاحب تھے اس میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شرکت کی اور آج تک رواں دواں ہوں، الحمد اللہ

حکیم صاحب کے عشقِ رسول نے ''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیاد رکھوائی اور پھر پاک وہند سے نکل کر بیرونِ ممالک تک کتاب کے انقلاب نے دیدۂ حیرت زدہ کو مزید حیراں کر دیا۔ پاک و ہند کے مجدد، مسلمانوں کے امام، شاہ احمد رضا فاضل بریلوی رحمہ اللہ کی تعلیمات وافکار کا پرچار حکیم صاحب تادمِ مرگ کرتے رہے اور خود زندہ وجاوید ہو گئے، مجلس رضا نے لاکھوں کتب شائع کر کے ''فری'' تقسیم کیں،

اہل قلم سے مقالات و مضامین لکھوا کر لاتعداد اشاعت کے ساتھ ''یوم رضا'' منانے کا بابرکت کام کیا گیا، مجلس رضا نے وہ تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے کہ کوئی دیکھا کرے، اہل سنت و جماعت کی رگوں میں جمے لہو نے دوڑنا شروع کر دیا۔ جامعات، سرکاری اداروں اور عوام میں فکری زندگی کے آثار نظر آنے لگے اور یہ تمام کام نہایت خاموشی سے ہوا۔

حکیم صاحب نے خود بہت کم لکھا، ان کی برکتوں سے لبریز زندگی کے ماہ وسال فروغِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بسر ہوئے وہ امام احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے سچے عاشق تھے۔ وہ کس قدر خلوص اور ریاض سے جانب منزل گامزن رہے کہ خود لکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا، وہ خود عالمِ جلیل، فاضلِ نبیل اور محقق عصر تھے، وہ خود دانشور تھے، وہ ان چند اہل بصیرت میں سے تھے جو ملکی اور فکری سرحدوں کے محافظ تھے، انہوں نے ''نقوش'' ''فیض الاسلام'' کے شماروں میں مضامین لکھے، کچھ مضامین ایسے تھے جن کو حکیم صاحب نے اپنی ''دورِ جہالت'' کی یادگار قرار دے کر مسترد کر دیا۔ میری مرتبہ کتاب ''تذکرہ علماء امرتسر'' میں اُن ہی مضامین میں سے ایک دو مضامین شائع ہو گئے حالانکہ اُسکے پیچھے ایک سازش تھی مگر پھر بھی میں معافی کا طلب گار ہوں، روحِ حکیم موسیٰ سے بھی معافی چاہتا ہوں، زیر نظر کتاب حکیم صاحب کے دیباچے، مقدمات، مضامین کا مجموعہ ہے، جو مدتوں سے بکھرے تھے، خاکسار نے اُن کی باب بندی کر کے مرتب کر دیا ہے۔ اس خیال سے کہ حکیم صاحب نے بہت لوگوں کو صاحبِ کتاب بنا دیا، تنگ نظر اور چھوٹے لوگوں کو برداشت کیا، حکیم صاحب کے نام پر ''دکانداریاں'' کرنے والوں کو خدا راہِ حقیقت دکھائے۔ (آمین)

کتاب، مقاماتِ صوفیہ، صوفیہ کے تذکار اور اہل دل علماء کے ذکر سے لبریز ہے۔ اللہ کریم حکیم صاحب کے لیے اسے سامانِ آخرت بنائے اور حکیم صاحب کے وسیلہ سے میرے لیے بھی بخشش کا سامان۔

حکیم صاحب اہل علم و دانش کی نظر میں

شیخ الادب ڈاکٹر پیر محمد حسن

حکیم صاحب کی پرورش خاص سنی ماحول میں ہوئی اور انہیں اساتذہ بھی ایسے ملے جو ان کی سنی خیالات کو اور مضبوط کر دے اس طرح انہیں اپنی جماعت کے ساتھ گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ حکیم صاحب کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ دیگر فرقہ باطلہ کے اندر تنظیم ہے ان کا باہمی ربط ہے اگر نہیں ہے تو اہلسنت میں۔ اس فکر اور جذبے کے ماتحت انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ عزم کر لیا کہ اہل سنت کے عقائد اور تعلیمات کی ترویج و تشہیر کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے جس سے اگر پوری جماعت میں پوری طرح روح نہ پھونکی جا سکے تو کم از کم اتنا تو ہو کہ یہ جماعت زندہ کہلانے کے قابل ہو سکے اس سے ان کی قوت ایمانی اور جماعتی جذبہ کا پتہ چلتا ہے چنانچہ انہوں نے اس غرض سے ''مجلسِ رضا'' قائم کی۔ آپ سب جانتے ہیں جماعتوں کا قائم کرنا آسان ہوتا ہے مگر اسے مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر کھڑا کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کے دل میں خلوص تھا ساتھ دینے والوں کی کمی تھی مگر انہوں نے ان سب باتوں کے پروا نہ کرتے ہوئے اپنے عزم اور مشن کو جاری رکھا۔ انہوں نے نا صرف قلم سے اہل سنت کی تعلیمات کی اشاعت کی بل کہ اپنے مقدر کے مطابق مالی طور پر بھی اس کی اعانت کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادارہ اب مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔

مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی

جناب حکیم حضرت محمد موسیٰ امرتسری ثم لاہوری امانت و دیانت اور تقویٰ

وطہارت میں ایک مثالی درجہ رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد وحید زمان ومکان میں مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ تھا۔ سیکڑوں قلمکاران کے دامن سے وابستہ ہو کر میدان تحریر میں عشق مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو بکھیر رہے ہیں کیونکہ یہی اصل زندگی اور حاصلِ حیات ہے۔

علم کی دو قسمیں ہیں: علم الادیان اور علم الابدان۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر دو مراحل میں درجہ کمال عطا کیا تھا۔ ریلوے روڈ پر ان کا مطب غریب اور مسکین لوگوں کے لیے طبی امداد اور قیمتی مشوروں کا مرکز تھا۔ علم الادیان میں ان کے علمی تصرفات یہ ہیں کہ شریعت اور طریقت کی روحانیت پر ایک کے قلب میں مرتکز کر دیں اور عشق مصطفیٰ ﷺ کے جذبہ سے ایک وابستہ لوگوں کو شرشار کیا۔ امام اہلسنت اعلیٰ حضرت مجدد ماتہ سابقہ وحاضرہ شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور تعلیمات کو ہر کہ ومہ تک پہنچانے کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور انہی کی مساعی جمیلہ سے مرکزی مجلسِ رضا کا تبلیغی سلسلہ شروع ہوا اور آج نہ صرف پاک وہند بلکہ UK اور دوسرے مغربی ممالک میں جاری وساری ہے۔ حکیم صاحب مرحوم متواضع اور منکسر المزاج مردمومن تھے ان کا خلوص اور محبت ہر شخص کو گرویدہ بنا لیتا تھا۔ خاکسار راقم الحروف کے عشق رسول ﷺ نے ان کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

محسنِ ملت محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ العالی اہلسنت کی آبرو اور اہل سنت کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ آپ کا اہم علمی اور اعتقادی کارنامہ مرکزی مجلسِ رضا، لاہور کا قیام ہے جس کی وجہ سے پاک وہند کی علمی فضائیں امام احمد رضا کے یوم منائے جانے لگے۔ مجالسِ مذاکرہ شروع ہونے لگیں۔ عالمی اور علاقائی سطح پر مقالہ نگاری کے مقابلے

ہونے لگے۔ مجلس رضا کی شاخیں ملک و بیرون ملک پھیلنے لگیں۔ نئے نئے علمی ادارے اور مکتبے قائم ہونے لگے۔ اہلسنت کی کتابیں اس طرح مارکیٹ میں آنے لگیں بقول ماہرِ تعلیم سید الطاف علی بریلوی مرحوم جیسے بارش ہو رہی ہو۔ بلاشبہ حکیم صاحب ابر بہار بن کر اہلِ سنت کی فضاؤں پر چھا گئے اور اہلسنت میں حیرت انگیز بیداری پیدا کی۔

مشفق خواجہ (کراچی)

حکیم محمد موسیٰ کے انتقال کی خبر سنی، بے حد افسوس ہوا۔ ایسے صاحب فضل و کمال کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ میری بدقسمتی کہ ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی وہ ان چنیدہ افراد میں سے تھی کہ جس سے بھی ذکر ہوا تعریف ہی سنی وہ صحیح معنوں میں مقبول خلائق تھے معرفت کرے کہ ان کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

سید سبط الحسن ضیغم

دنیا جہاں سے آنے والے سکالروں کی ان تک پہنچنے کی مجبوری دنیا بھر سے تحقیق کے حوالے سے خط و کتابت نے حکومتی اداروں کے نزدیک ان کی اہمیت کو دو چند کر دیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا خود حکومت بھی ان سے راہنمائی حاصل کرتی مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ حکیم صاحب مرحوم کی خط و کتابت بھی تنقیدی طور پر دیکھنے کے لیے سنسر ہوتی اور ساتھ ہی ان کی نگرانی کے لیے کہ انہیں کون ملتا ہے۔ حکیم صاحب سے کس کی کیا گفتگو ہوتی ہے وہ کیا رائے زنی کرتے ہیں۔ یہ سب معلومات حاصل کرنے کے لیے حکومت نے ان پر نگرانی کی غرض سے ہمہ وقتی "شرطے" لگا دیئے۔ جنہوں نے ہدایات ملنے پر حکیم صاحب کے حلقہ احباب کو کم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔

مقاماتِ صوفیہ

- مقامِ غوثِ اعظم اور معارفِ قصیدہ غوثیہ
- داتا گنج بخش اور کشف المحجوب
- حضرتِ مجدد اور اُن کے مکتوبات
- حضرت سید برکت علی امرتسری

مقامِ غوثِ اعظم اور معارفِ قصیدہ غوثیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ سیّدنا ومولانا محمّد والہٖ واصحابہٖ واولیآء امّتہٖ اجمعین

سیدنا ومولانا حضرت غوث الثقلین شیخ محی الدین سید عبدالقادر جیلانی حسنی حسینی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (م ۵۶۱ھ) کا ارشادِ گرامی ہے:

قدمی ھٰذہٖ علیٰ رقبۃ کلّ ولیّ اللہ

اس الہامی کلام کی تمام اولیائے وقت نے پرزور تائید فرمائی اور اکثر علماء واولیاء امت نے اس امر پر اتفاق کیا کہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرات صحابۂ کرام اور ائمۂ اہلِ بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سوا، سب زمانوں کے اولیاء کرام کے سردار ہیں، معاصرین، اولین اور آخرین، سب کے سب آپ سے فیض یافتہ ہیں اور آپ ہی کے تابع ہیں...... امام اہلِ سنت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ (م ۱۳۴۰ھ) کا مسلک بھی یہی ہے، فرماتے ہیں

نامد زِ سلَف عدیل عبدالقادر   ناید بخلَف بدیلِ عبدالقادر
مثلش گراز اہل قرب جوئی گوئی   عبدالقادر مثیلِ عبدالقادر

☆☆☆

جو ولی قبل تھے یا بعد ہوئے

بقسم کہتے ہیں شاہانِ صریفین وحریم ا؎ ۲؎ کہ ہوا ہے نہ ولی ہو کوئی ہمتا تیرا

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کا اظہار اپنی متعدد تصانیف میں کیا ہے، مگر بعض حضرات نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے حضور غوث پاک کی صرف اپنے زمانے میں اولیاء پر فضیلت مانی ہے اور بعض نے معاصرین و آخرین پر ان کا تفوق تسلیم کیا ہے مگر اولین پر نہیں...... رسالہ ''رموز خمریہ'' یعنی شرح قصیدہ غوثیہ، تالیف حضرت عارف کامل محمد فاضل کلانوری رحمۃ اللہ علیہ کے شروع میں بطور پیش لفظ زیر عنوان ''فائدہ'' ناشر نے حسب ذیل عبارت نقل کی ہے:

''حضرت شاہ حبیب اللہ چشتی کہ حال کمالات شاں از کتاب مآثر الکرام وغیرہ ظاہر ۳؎ است۔ در مناقب الاولیاء فرمودہ، سوال: از کلام الہامی قدمی ھٰذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ مراد اولیاء ہمہ عصر اند یا اولیاء ہم عصر؟ جواب: مشہور آن ست کہ مراد اولیائے ہمہ عصر اند اما شیخ احمد صاحب نقشبندی ۴؎ گفتہ کہ ایں

۱؎ حضرت ابو عمرو عثمان صریفین

۲؎ حضرت ابو محمد عبدالحق حریمی۔ (یہ دونوں بزرگ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ کے ہم عصر تھے)

۳؎ مآثر الکرام میں شاہ حبیب اللہ چشتی کے حالات درج نہیں، مؤلف کو تسامح ہوا ہے۔ غالباً یہ شاہ حبیب اللہ چشتی قنوجی (م ۱۱۴۰ھ) مرید و خلیفہ حضرت شاہ عبدالجلیل چشتی الہ آبادی ہیں، ان کا ترجمہ متعدد تذکروں میں موجود ہے۔ ان کے پیر (شاہ عبدالجلیل) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ حبیب اللہ کی تصانیف میں تذکرۃ الاولیاء کا نام بھی ملتا ہے جس سے مراد غالباً مناقب الاولیاء ہے، ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند، حدائق الحنفیہ، نزہۃ الخواطر، عہد بنگش۔

۴؎ یعنی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ۔

حکم مخصوص بہ اولیاء آں وقت است، اولیاء ماتقدم و ماتأخر ازیں حکم خارج اند، چنانچہ از کلامِ جناب شیخ حماد معلوم می شود کہ قدم اودر وقت او بر گردن ہمہ اولیاء خواہد بود و ہمچناں از کلام غوثے کہ در بغداد بود۔ وایں فقیر (شاہ حبیب اللہ چشتی) می گوید بر گاہ کہ غوثِ اعظم از حق سبحانہٗ بہ تکلم ایں کلام مامور گشت و تکلم نمود از اں وقت ہر کہ داخلِ ولایت است مندرج است تحت ایں کلام چنانچہ عموم و کلّیتِ آں کلام منادی است و از اں ہنگامی کہ امر الٰہی بہ لفظ کلّی صادر گشتہ و ہیچ حکمی ناسخ آں بظہور نہ پیوستہ، ہمیشہ وقتِ اوست تا کہ ولایت باقی است، چنانچہ بحیرا راہب وغیرہ از علوِّ شان جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم خبر دادہ کہ در وقتِ او کفر ذلیل گردد و ادیان دیگر نسخ پذیرد، مراد از اں یک وقت مخصوص نیست بلکہ از وقت نزولِ امر الٰہی تا قیامت وقت اوست و بالفرض اگر اولیاء آں عصر مراد داشتہ شوند یقینی است کہ اولیاء آں عصر پیرانِ اولیاء ماتأخر شدند، ہر گاہ پیراں منقاد شدند و گردن نہادند مریداں بطریق اولیٰ، و کلامِ شیخ حماد وغیرہ باوجود آنکہ دلالت بر نفی ماتقدم و ماتأخر نمی کند ناسخ کلامِ الٰہی نمی تواند بود......[1]

حضرت شاہ حبیب اللہ چشتی علیہ الرحمۃ نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ السامی (م ۱۰۳۴ھ) کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ ’’ایں حکم

---

[1] رموزِ خمریہ یعنی شرح قصیدہ غوثیہ، مطبع صبح صادق سیتاپور، ۱۳۰۶ھ

مخصوص بہ اولیاء آں وقت است، اولیاءِ ماتقدم وماتأ خراز یں حکم خارج اند" اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ امام ربانی قدس سرہ نے آخری ایام میں اس باب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، وہ اس قول کا ناسخ ہے۔ حضرت شیخ مجدد نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حضرت غوثِ اعظم کی افضلیت کو بیان کیا ہے اور اپنے آپ کو ان کا نائب لکھا ہے لہٰذا حضرت مجددِ الفِ ثانی قدس سرہ کے ایک سابق قول کو پیش کرنا اور زیرِ بحث لانا غیر مناسب ہے، لہٰذا اس مقام پر یہ قول اُن ہی کا سمجھا جائے جو ایسا عقیدہ رکھتے ہیں، اب آپ حضرت شیخ مجدد کی وہ نورانی تحریر ملاحظہ کیجئے جس میں حضرت غوثِ اعظم کی افضلیت در ہر عصر کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

"وہ راستے جو اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچانے والے ہیں، دو ہیں، ایک وہ راہ ہے جو قربِ نبوت سے تعلق رکھتی ہے، علیٰ اربابہا الصلوٰۃ والسلام اور اصل الاصل تک پہنچانے والی ہے، اس راہ سے واصل ہونے والے اصل میں تو انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں اور ان کے صحابہ اور باقی اُمتوں میں سے جس کو بھی اس دولت سے نوازیں، اگرچہ وہ تھوڑے ہوتے ہیں بلکہ بہت ہی تھوڑے اور اس راہ میں توسط وحیلولت نہیں ہے، جو بھی ان واصلین میں سے فیض حاصل کرتا ہے، وہ بغیر کسی وسیلے کے اصل سے حاصل کرتا ہے اور کوئی بھی دوسرے کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔

اور بُدَلاء و نُجباء اور عام اولیاء اللہ اسی راہ سے واصل ہیں اور راہ سلوک اسی راہ سے عبارت ہے، بلکہ جذبہ متعارفہ بھی اسی میں داخل ہے اور اس راہ میں توسط و حیلولت ثابت ہے اور اس راہ کے واصلین کے پیشواوؤں سرداروں اور ان کے بزرگوں کے منبعِ فیض حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم ہیں اور یہ عظیم الشان منصب ان سے تعلق رکھتا ہے، اس راہ میں گویا رسول اللہ ﷺ کے دونوں قدم مبارک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک سر پر ہیں اور حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مقام میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت امیر اپنی جسدی پیدائش سے پہلے بھی اس مقام کے ملجاء و ماویٰ تھے جیسا کہ آپ جسدی پیدائش کے بعد ہیں اور جس کو بھی فیض و ہدایت اس راہ سے پہنچی ان کے ذریعے سے پہنچی، کیونکہ وہ اس راہ کے آخری نقطہ کے نزدیک ہیں اور اس مقام کا مرکز ان ہی سے تعلق رکھتا ہے اور جب حضرت امیر کا دور ختم ہوا تو یہ عظیم القدر منصب بالترتیب حضرات حسنین کے سپرد ہوا اور ان کے بعد وہی منصب ائمہ اثنا عشر میں سے ہر ایک کو ترتیب وار اور تفصیل سے مقرر ہوا اور ان بزرگواروں کے زمانہ میں اور اسی طرح ان کے انتقال کے بعد جس کو بھی فیض اور ہدایت ملی ان بزرگواروں کے ذریعہ اور

حیلولت سے ملی ، اگرچہ وہ اقطاب ونجبائے وقت ہی کیوں نہ ہوں اور سب کے ملجاؤ وماویٰ یہی بزرگ ہیں ، کیونکہ اطراف کو اپنے مرکز کے ساتھ الحاق کرنا لازمی ہے یعنی اس کے بغیر چارہ نہیں یہاں تک کہ نوبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ تک پہنچی اور جب اس بزرگوار تک نوبت پہنچی تو منصب مذکور آپ کے سپرد ہوا اور ائمہ مذکورین اور حضرت شیخ کے درمیان کوئی بھی اس مرکز پر مشہود نہیں ہوا اور اس راہ میں فیوض و برکات کا وصول جس کو بھی ہوا خواہ وہ اقطاب ونجباء ہوں ، آپ کے واسطہ ہی سے مفہوم ہوتا ہے کیونکہ یہ مرکز ان کے علاوہ اور کسی کو میسر نہیں ہوا ، یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا ہے۔

افلت شموس الاولین وشمسنا

ابدًا علٰی افق العُلٰی لاتغربُ

ترجمہ: ''پہلے لوگوں کے سورج غروب ہو گئے اور ہمارا سورج ہمیشہ بلندی کے کناروں پر رہے گا اور وہ کبھی غروب نہ ہوگا۔''[1]

شمس سے مراد فیضانِ ہدایت وارشاد کا آفتاب ہے اور اس کے غروب ہونے کا مطلب فیضانِ مذکور کا عدم ہے اور جب حضرت شیخ کے وجود سے وہ معاملہ جو پہلے لوگوں سے تعلق رکھتا تھا ، مقرر ہوا اور رشد وہدایت کے وصول کا واسطہ ہوئے جیسا

---

[1] منظوم ترجمہ از اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ

سورج گلوں کے چمکتے تھے چمک کر ڈوبے   افقِ نور پہ ہے مہر ہمیشہ تیرا

کہ ان سے پہلے کے بزرگ تھے اور پھر یہ بھی ہے کہ جب تک فیض کے توسط کا معاملہ قائم ہے، ان ہی کے وسیلہ سے ہے تو لازماً درست ہوا کہ:

افلت شموس الاولین وشمسنا الخ

سوال:۔ یہ حکم مجدد الف ثانی سے ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ مجدد الف ثانی کے معنیٰ کے بیان میں جلد ثانی کے ایک مکتوب میں درج ہوا ہے کہ جو کچھ بھی فیض کی قسم سے اس مدت میں امتوں کو پہنچتا ہے، وہ اسی کے ذریعہ سے ہوتا ہے، اگرچہ وہ اقطاب واوتاد ہوں یا نجباء وبدلاء وقت؟

جواب:۔ میں کہتا ہوں کہ مجدد الف ثانی اس مقام میں حضرت شیخ کے نائب مناب میں اور حضرت شیخ کی نیابت ہی سے یہ معاملہ، اس سے (مجدد الف ثانی سے) وابستہ ہے، جیسا کہ کہا ہے:

نور القمر مستفاد من نور الشمس

(چاند کا نور سورج کے نور سے مستفاد ہے)

لہٰذا کوئی استحالہ واشکال نہ رہا۔[1]

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے اس حقیقت کو ذرا اختصار کے ساتھ رسالہ ''مکاشفاتِ غیبیہ'' میں بھی بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

''باید دانست کہ واصلانِ ذات ازیں بزرگواراں کہ بہ ''افراد'' ملقب اند نیز اقل قلیل اند واکابر صحابہ وائمہ اثنا عشر از اہل بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بایں دولت فائض اند واز اکابر

---

[1] مکتوبات امام ربانی مترجمہ مولانا محمد سعید احمد نقشبندی (تبغییر قلیل) دفتر سوم مکتوب نمبر ۱۲۳

اولیاء اللہ قطب، غوث الثقلین قطب ربانی محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی است قدس اللہ تعالیٰ سرہ الاقدس بایں دولت ممتاز اندودریں مقام شانِ خاص دارند کہ اولیاء دیگر ازاں خصوصیت قلیل النصیب اندہمیں امتیاز فضلے باعثِ علوِ شان ایشاں شدہ است، فرمودہ اند قدمی ھٰذہٖ علیٰ علیٰ رقبة کل ولی اللہ، اگرچہ دیگراں راہم فضائل وکرامات بسیار است اما قرب ایشاں بآں خصوصیت از ہمہ زیادہ تر است درعروج وبآں کیفیت کسے بہ ایشاں نمی رسد، باصحاب وائمہ اثنا عشر دریں باب مشارک اند ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل اعظیم‘‘[1]

حضرت شیخ سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۵۳ھ) نے خلاصۃ المعارف ونکات الاسرار میں وہی کچھ تحریر فرمایا ہے جو ان کے مرشدِ ارشد حضرت امامِ ربانی قدس سرہ نے بیان فرمایا ہے۔

سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے فاضل اجل بزرگ حضرت شاہ فقیر اللہ علوی شکارپوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۹۵ھ) نے افضلیت غوث پاک رضی اللہ عنہ پر نہایت شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے، کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا، اختتام بحث پر رقم فرماتے ہیں:

’’پس ثابت شد حکم کشفاً قطعاً بر ثبوت قدم مبارک برفوق رقابِ

---

[1] مکاشفات غیبیہ، طبع کراچی، ص ۴۰

جمیع اولیاء کرام اولین و اخرین قدس اللہ تعالیٰ اسرار ہم واز جمیع ماذ کردانستہ باشی۔"[1]

حضرت شیخ مجدد قدس سرہ کے منقولہ الصدر مکتوب شریف پر اکثر علماء و مشائخ نے توجہ نہیں کی، لہٰذا اولیاء متقدمین ومتاخرین پر حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت کے بارے میں مشوش رہے۔

الحاج محمد عارف ضیائی بیان کرتے ہیں کہ سیدی حضرت مولانا ضیاء الدین احمد صاحب قادری رضوی مہاجر مدنی مدظلہ العالی نے دوتین مرتبہ بیان فرمایا کہ "پنجاب کے ایک مشہور نقشبندی بزرگ نے مجھے کہا کہ ہم اولیاء متقدمین ومتاٗخرین پر حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی فضیلت نہیں مانتے، اس پر میں (حضرت مدنی) نے حضرت مجددِ الفِ ثانی قدس سرہ کا یہ مکتوب ان پیر صاحب کو پڑھوایا تو فرمانے لگے کہ پورے ستر سال سے اس غلط خیال میں مبتلا رہا مگر اب میں آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں، حضرت مجدد نے جو فرمایا ہے، وہ حق ہے" ان پیر صاحب علیہ الرحمۃ کا رجوع فرمالینا ان کی انسانی عظمت کی دلیل ہے۔

اس مکتوب شریف کا مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے بعض لوگ اس سوء ظنی میں بھی مبتلا رہے کہ حضرت مجددِ الف ثانی قدس سرہ نے حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت (درہمہ عصر) کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا، تھا جیسا کہ شاہ حبیب اللہ چشتی کی اس تحریر سے ظاہر ہے جو ابتداء میں درج ہو چکی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ یہ مکتوب ان فضلاء کی نظر سے کیوں اوجھل رہا؟

---

[1] مکتوبات شاہ فقیر اللہ علوی نقشبندی شکارپوری، طبع لاہور، ص ۲۱۰ مکتوب نمبر ۴۹۔

سرخیل سلسلۂ نقشبندیہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس سرح السامی (م ۸۹۸ھ) نے اس سلسلے میں متعدد بزرگوں کے کشف نقل فرمائے ہیں، ان میں سے ایک بزرگ کی کشفی شہادت درج ذیل ہے:

''شیخ ابوسعد قیلوی گفتہ کہ چوں شیخ عبدالقادر گفت قدمی هذه علی رقبة کل ولی الله حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ بردلِ وے تجلی کردورسول اللہ ﷺ بردست طائفہ از ملائکہ مقربین بحضر اولیاء متقدمین ومتاخرین کہ آنجا حاضر بودند، احیاء باجساد خود واموات بارواحِ خود خلعتی دروے پوشانیدند و ملائکہ و رجال غیب مجلس ویرا درمیان گرفتہ بودند وصفہا درہوا ایستادہ بودند، بروی زمین ہیچ ولی نماند مگر کہ گردن خود راپست کرد وبعضے گفتہ اند کہ یک کس ازعجم تواضع نہ کرد، وحال وے از وے متواری شد''[1]

ترجمہ: ''جس وقت حضور غوثِ پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ ارشافرمایا: کہ ''میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے'' اس وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے دل پر ایک تجلی ہوئی اور حضور نبی کریم ﷺ کی طرف سے ملائکہ مقربین کی ایک جماعت کے ہاتھ ان کے پاس ایک خلعت آئی جو اولیاء متقدمین ومتاخرین کی موجودگی میں انہیں پہنائی گئی، زندہ اولیاء تو اپنے اجسام کے ساتھ حاضر تھے اور جو وصال پا چکے تھے، ان کی ارواح موجود

---

[1] نفحات الانس (فارسی) طبع لاہور ۱۹۲۷ء، ص ۳۵۴

تھیں اور اس وقت ملائکہ اور رجال غیب نے اس مجلس کو گھیرے
میں لیا ہوا تھا اور ہوا میں صف بستہ کھڑے تھے، اس وقت روئے
زمین کا کوئی ایسا ولی نہ تھا جس نے اپنی گردن کو نہ جھکا دیا ہو، مگر
ایک عجمی نے تواضع سے کام نہ لیا، تو اس کا حال محو ہو گیا یعنی اس
کی ولایت سلب ہو گئی۔"

مولانا جامی نے یہ روایت بہجۃ الاسرار سے لی ہے، ملاحظہ ہو ص ۹ طبع مصر۔
حضرت خلیفہ بن سے موسیٰ نہر ملکی قدس سرہ کا ایک خواب حضور غوث الثقلین کی جلالتِ شان کی زبردست دلیل ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے حضور پُرنور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وبارک وسلم کو خواب میں دیکھا تو عرض کی کہ شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں قدمی ھٰذہٖ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ، حضور علیہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدق الشیخ عبدالقادر کیف لا وھو القطب وانا ارعاہ۔

"یعنی شیخ عبدالقادر نے سچ کہا اور وہ کیوں نہ سچ کہیں کہ خود
قطب ہیں اور میں ان کا نگہبان ہوں۔"[1]

یاد رہے کہ انبیاء کا کرام و اولیاء عظام کے رُؤیا بیداری کا حکم رکھتے ہیں، حضرت شاہ فقیر اللہ علوی شکار پوری لکھتے ہیں:

"پوشیدہ نیست برذوی العرفان والا تقان کہ رؤیائے انبیاء
واولیاء در حکم یقظہ است حتیٰ کہ اگر بچیزے مامور شوند در خواب

---

[1] بہجۃ الاسرار ص ۱۰، الزمزمۃ القمریہ فی الذب عن الخمریہ از اعلیٰ حضرت بریلوی، طبع لاہور، ص ۲۳۔

واجب می گردد برایشاں امتثال برآں واگراز چیزے نہی کردہ شوند لازم می گردد برایشاں اجتناب ازاں چنانکہ در سیر ایشاں مُبیَّن است۔''[1]

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نقشبندی (م ۱۱۷۶ھ) نے سلسلہ عالیہ قادریہ اور حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت کو اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے:

''در اولیاء امت و اصحابِ طرق اقوی کسیکہ بعد تمام راہ جذب بآ کد وجوہ باصل ایں نسبت میل کردہ است، و در آنجا بوجہ اتم قدم زدہ است، حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی اند ولہذا گفتہ اند کہ ایشاں در قبرِ خود مثلِ احیاء تصرف می کنند۔''[2]

ترجمہ: ''اولیائے امت اور ارباب سلاسل میں سے راہِ جذب کی تکمیل کے بعد جو اس نسبت (اویسیہ) کی طرف سب سے زیادہ مائل اور اس مرتبہ پر بدرجہ اتم فائز ہوئے ہیں، وہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی ہیں۔ اسی لئے (مشائخ) نے کہا ہے کہ وہ اپنی قبر میں احیاء (زندوں) کی طرح تصرف فرماتے ہیں۔''

شاہ ولی اللہ تفہیمات میں لکھتے ہیں:

''لَقَدْ فُهِمَ للطريقة القادرية والنقشبدية والجشتية خاصية علٰى حدتها فالقادرية قريبة من الاويسية

---

[1] مکتوبات شاہ فقیر اللہ علوی، ص ۲۰۳

[2] ہمعات (فارسی) از شاہ ولی اللہ دہلوی، طبع حیدرآباد (پاک) ۱۹۶۴ء، ص ۶۱

والروحانية وان التعليم من الشيخ ظاهرولها قدم فی الارتباط بالشيوخ وتوجه المشائخ الیٰ الطالب ليست لغيرها وذلک ظاهر لان الشيخ عبدالقادر له شعبة من السريان فی العالم وذلک انه لمامات صار بهيئة الملأالاعلیٰ والطبع فيه الوجود الساری فی العالم کله فحصل من هٰذا الوجه روح فی طريقة''[1]

ترجمہ:''سلسلہ قادریہ نقشبندیہ اور چشتیہ کی الگ الگ خاصیت سمجھی گئی ہے۔ سلسلہ قادریہ میں اگرچہ تعلیم بہ ظاہر شیخ ہی سے ہوتی ہے، تاہم یہ سلسلہ، طریقہ اویسیہ روحانیہ کا مظہر ہے۔ اس سلسلہ میں مشائخ کے ساتھ تعلق اور مشائخ کی توجہ طالب کی طرف اس قدر رہوتی ہے کہ دوسرے سلاسل میں نہیں پائی جاتی اور یہ امر ظاہر وعیاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کو عالم میں اثر ونفوذ کا ایک خاص مقام حاصل ہے، اس لئے کہ انہیں وصال کے بعد ملاء اعلیٰ کی ہیئت حاصل ہو گئی ہے اور ان میں وہ وجود منعکس ہو گیا ہے جو تمام عالم میں جاری وساری ہے، لہٰذا ان کے طریقے (سلسلہ قادریہ) میں بھی ایک خاص روح اور زندگی پیدا ہو گئی ہے۔''

---

[1] تفہیمات الٰہیہ، جلد دوم

شاہ فقیر احمد علوی نقشبندی شکارپوری سلسلہ قادریہ اور قادریوں کی فضیلت و افضلیت بیان کرتے ہوئے مریدان سلسلہ قادریہ اور دیگر سلاسل میں منسلک لوگوں کے لئے نہایت مفید ہدایت لکھ گئے ہیں، فرماتے ہیں:

''فضل طریقۂ علیہ قادریہ بر جمیع طرق وفضلِ تابعانِ او بر تابعانِ جمیع طرق، فضلِ تابع بہ فضل متبوع است و قد قال اللہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس وازیں جا ظاہر گردید کہ مرید طریقہ علیہ قادریہ را باوجود مرشد قادری نشاید کہ ارادۂ استفادہ از طرق دیگر کند، چہ اصحابِ طرقِ دیگر بتوسطِ شریف حضرت غوث الثقلین استفادہ می نمایند و دراول وآخر کار بتوسط جناب ایشاں فتح باب می یابند، اگرچہ اقطابِ وقت ونجباء ساعت باشند پس اصحابِ طرق دیگر اگر استفادہ از طریقۂ علیہ قادریہ نمایند درحق ایشاں سبب مزید فیض خواہد بود۔''[1]

خلاصہ یہ کہ سلسلہ قادریہ کو سب سلسلوں پر فضیلت حاصل ہے اور اس سلسلے کے مریدین دیگر سلاسل کے مریدین فوقیت رکھتے ہیں، اس لئے کہ تابع کی فضیلت متبوع کے سبب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس. (تم بہتر ہوان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں) سلسلۂ قادریہ کے مرید کے لئے نامناسب ہے کہ وہ کسی اور سلسلہ کے پیر سے روحانی استفادہ کرے، اس لئے کہ تمام سلاسل کے مشائخ حضور غوثِ پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وسیلے سے فیضیاب

---

[1] مکتوبات شاہ فقیر اللہ علوی نقشبندی، ص ۲۱۱

ہوتے ہیں اور اول وآخر ان ہی کے طفیل ان پر در معرفت وا ہوتا ہے، اگرچہ وہ اقطاب ونجباء وقت ہوں۔ ہاں! دیگر سلاسل کے لوگوں کا سلسلہ قادریہ کے مشائخ سے استفادہ ان کے لئے فیض کی زیادتی کا موجب ہوتا ہے۔

مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواروی چشتی قادری (م ۱۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"اے عزیز! تم سیر وتواریخ اولیاء اس زمانے تک کی پڑھ جاؤ، دیکھو گے کتنے طریقے پیدا ہوئے، پھر ان کا زور شور ہوا مگر ظاہر میں اب اس کا اجراء مسدود ہو گیا، بخلاف ہمارے طریقہ، شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ کے کہ وہ تمام طرق اولیاء میں سما گیا اور ہر طریقے میں اس کی زندگی اور ہر شجرے میں اس کی تازگی ہے، ہندوستان ہی کے موجودہ طرق وسلاسل کو دیکھ لو، کوئی طریقہ اس کی آمیزش (فیض) سے خالی نہیں، والحمدللہ علیٰ ذلک۔"[1]

شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۴۷ھ) یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا وظیفہ پڑھا کرتے تھے اور ان کی مسجد کی محراب میں بھی یہ مبارک جملہ لکھا ہوا تھا۔ آپ کے ایک مرید مولوی حکیم مظفر حسین قریشی فاروقی ساکن اجکے ضلع گوجرانوالہ نے اس سلسلے میں اپنے خدشات کا اظہار بذریعہ مکتوب حضرت میاں صاحب سے کیا، تو انہوں نے جو مختصر جواب دیا، وہ قابل توجہ ہے، و ھو ھذا۔

"ہر حال شکر اور ذکر، فکر، عبرت ضروری ہے، جو آج کل محال ہے، اس وسوسے (یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کے بارے میں

---

[1] شمس المعارف، طبع کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۶۰۴

خدشہ) میں پڑنا زیبا نہیں، غریب تو پڑھا کرتا ہے، بلکہ کل ولی اللہ سے امداد لینا جائز ہے، آپ کا دل چاہے تو خیر پڑھا کریں۔ حضرت میراں محی الدین حضرت شیخ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ عجیب طرز کی توحید میں فنا تھے، اس لئے جو لوگ ان کو یاد کرتے ہیں، ان کو خداوند کریم کی محبت کامل ہو جاتی ہے، اخیر سب کا رجوع رب کریم کی جانب ہے "**فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الرحمین**" آپ کا وجود غیر خدا سے نہیں بنا ہے، اس کا ثبوت قادری قلندروں سے لیں اگر کوئی نہ پڑھے تو خیر، خداوند کریم کی سنت جاری ہے، ہر ایک کو ایک کام سپرد کیا ہے، جیسا ہر اک چیز سے کام لیا جاتا ہے ویسا یہی ہے۔"[1]

حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایسی ذات گرامی ہے کہ ان کی بارگاہِ اقدس کی ادنیٰ سی گستاخی بھی موجب خسران و خذلان ہے۔ اکابر اولیاء اللہ سید الانبیاء ﷺ کے اس لاڈلے فرزند کا غایت درجہ ادب کرتے ہیں اور جو اس بارگاہِ عالی کے مؤدب نہیں ہیں، انہیں روحانیت سے کوئی علاقہ نہیں اور دین و دنیا کے سخت گھاٹے میں ہیں۔ بارگاہ غوثیت مآب کی بے ادبی کے انجام کے سلسلے میں سلطان المشائخ حضرت خواجہ خواجگان سید نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (م ۷۲۵ھ) کی ایک روایت ملاحظہ ہو:

---

[1] کلمات قدسیہ معروف بہ فیض نقشبندیہ، از سید شرافت نوشاہی، شائع شدہ از مرید کے ۱۳۹۲ھ، ص ۴۳

''ایک شخص حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہ العزیز کی خانقاہ میں آیا۔ اس نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ خانقاہ کے دروازے پر پڑا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے اور خراب حالت میں ہیں۔ آنے والا شخص حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دروازے پر پڑے ہوئے اس آدمی کا ذکر کیا اور حضرت شیخ سے دعا کی درخواست کی حضرت شیخ نے فرمایا: خاموش رہو، اس نے بے ادبی کی ہے۔ آنے والے شخص نے پوچھا کہ حضرت! اس نے کیا بے ادبی کی ہے؟ حضرت شیخ نے فرمایا: کہ وہ ابدال میں سے ہے، کل اُس قوت پرواز کے مطابق کہ ابدال کو بخشی گئی ہے، وہ اپنے دو ساتھیوں کی معیت میں ہوا میں اڑ رہا تھا۔ جب وہ تینوں اس خانقاہ کے قریب پہنچے تو اس کا ایک ساتھی اڑتے ہوئے خانقاہ سے ایک طرف ہٹ گیا اور ادب کے طور پر خانقاہ کی دائیں جانب سے نکل گیا۔ اس کا دوسرا ساتھ بھی اڑتا ہوا خانقاہ کی جانب سے نکل گیا، اس نے بے ادبی سے خانقاہ کے اوپر سے گزرنا چاہا، لہٰذا نیچے گر گیا۔''[1]

حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفعت وعظمت اور ان کے سلسلہ عالیہ کی فضیلت وافضلیت اکابر اولیاء اللہ کے کلام سے اس لئے واضح کی گئی ہے کہ

---

[1] فوائد الفواد: مترجم اردو، شائع کردہ علماء اکیڈمی اوقاف پنجاب، لاہور، ص ۴۶

قارئین کرام پر یہ واضح ہو کہ قصیدہ شریف جس عظیم و جلیل بزرگ اور سرورِ اولیاء کا کلام ہے، وہ حضور پُر نور سرورِ عالم و عالمیان ﷺ کا لاڈلا بیٹا اور نائب ہے اور سرکارِ دو جہاں سیدِ انس و جاں اس کے ہر دم محافظ و نگہبان ہیں، لہٰذا اس کا کہا اللہ کا کہا ہے

گفتۂ او گفتہ اللہ بود　　　　گر چہ از حلقوم عبداللہ بود

قصیدہ خمریہ یعنی غوثیہ کے بارے میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ حالت سکر کا کلام ہے، مگر پنجاب کے مایۂ ناز عالم اور مشہور ولی اللہ حضرت ابوالفرح محمد فاضل الدین قادری بٹالوی قدس سرہ (م ۱۱۵۱ھ) نے قصیدہ غوثیہ کی لاجواب و بے مثال عربی شرح "بیان الاسرار" میں بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

"قصیدہ غوثیہ کلام صحو ہے اور اس میں سکر کا شائبہ تک نہیں ہے۔"[۱]

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ بھی آپ کے کلام کو سکر سے پاک سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں:

"رب عزوجل نے حضور کو شطحیات سکر سے محفوظ رکھا اور حضور کے اقوال و افعال و احوال و اعمال سب کو احیائے ملّت و اقتضائے سنت کا مرتبہ بخشا۔ نہیں کہتے جب تک کہلوائے نہ جائیں اور نہیں کرتے جب تک اذان نہ پائیں۔"[۲]

قصیدہ غوثیہ کی حضور غوثِ پاک سے نسبت کے بارے میں بعض کور باطن لوگوں نے شک کا اظہار کیا ہے اور بعض نے اپنی جہالت کی بناء پر اس کی عربی پر

۱　دربار قادریہ فاضلیہ کا قرطاس التعارف: طبع لاہور ۱۳۸۹ھ، ص ۱۱

۲　الزمزمۃ القمریہ، از اعلحضرت بریلوی، ص ۲۵

اعتراضات کئے ہیں، ان اعتراضات کے مسکت جوابات اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے رسالہ الزمزمۃ القمریہ میں دئے ہیں، محققین یہ علمی رسالہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس قصیدہ مبارکہ کی نسبت کے بارے میں حضرت مولانا محمد اعظم قادری نوشاہی علیہ الرحمۃ، مدفون میرووال کی تحریر نہایت دلچسپ ہے، وھوھذا۔

بعض لوگ جب کسی کلام کے معنیٰ نہ سمجھ سکتے ہوں تو وہ اس کے کلام نہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا ثبوت مانگتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کا کیا کیا جائے...... ثبوت نسبتی دو طرح پر ہے:

۱۔ کوئی اپنا کلام ہونے کا دعویٰ کرے۔

۲۔ کئی سو سال سے راسخین اور صادقین بلا خلاف اس کلام کو کسی بزرگ کی طرف منسوب کرتے چلے آئے ہوں۔

فقہ اکبر ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ایک وجہ سے تو آپ کی ثابت نہیں، البتہ ایک زمانہ ان کی طرف منسوب کرتا ہے، اگرچہ بعض محققین مخالف ہیں۔ جامع محمد بن اسمٰعیل بخاری صرف شہرت کے لحاظ سے بلا خلاف ان کی تسلیم کی جاتی ہے، لیکن دوسرا ثبوت نہیں کیونکہ انہوں نے مثل دیگر مصنفین اَلَّفتُ یا صَنَّفتُ یا اور کچھ ایسا نہیں کہا۔ جامع کے بعض نسخوں کے شروع میں قال الامام الخ لکھا ہے، سو یہ ان کے کسی شاگرد کا لکھا ہوا ہے۔

غنیۃ الطالبین دونوں وجہ سے جناب عالی کا کلام ثابت نہیں کیوں نہ ان کا اپنا دعویٰ ہے نہ اس کی آپ سے نسبت اتفاقی ہے، مگر قصیدہ شریف کا آپ کا کلام ہونا بہ ہر دو وجہ ثابت ہے، اپنا دعویٰ فرماتے ہیں۔

انا الجیلیُّ محی الدّین اسمی　　　واعلامی علی راس الجبال

پھر زیادہ توضیح کے لئے:

انا الحسنی والمخدع مقامی   واقدامی علیٰ عنق الرجالِ

پھر اس

وعبدالقادر المشهورا سمی   وجدی صاحب العین الکمالِ

نسبت شہرت

شہرت کی یہ حالت کہ کسی کو بھی مجالِ مخالفت نہیں، خدا پرست، صاحبانِ کشف والہام، واصل باللہ، مقربانِ بارگاہِ احدیت اور علمائے محققین، آپ کے مرید، حلقہ نشین جو سب عالم فاضل، عارف، محدث، فقیہ اور اولیاء اللہ تھے اور ان سے فیض لینے والے اور ظاہری باطنی نسبت پانے والے مثلاً ایک سرے پر تو علی بن یوسف بن جریر لخمی شطنوفی، نور الدین ابوالحسن مصنف بہجۃ الاسرار، اور وسط میں عارف نامی مولانا عبدالرحمٰن جامی مصنف شرح کافیہ مشہور بہ شرح ملاّ، اور دوسرے سرے پر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے پڑھتے پڑھاتے اور مانتے اور منواتے چلے آئے ہیں۔ قصیدہ آپ کا قصیدہ ہونا توحدِ تواتر وشہرت سے آگے ہے، پھر ایسے دعوے اور شہرت نسبت بلاخلاف پر شک ہو تو بہت سی دینی کتابیں جو مصنفوں کی جلالتِ قدر اور دوفورِ مایۂ علمی وعملی پر تسلیم کی جاتی ہیں، ان کی طرف نسبت سے گر جائیں گے، فافهم وانصف والافابک[1]

میں اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ قصیدہ شریف کے بے مثال

---

[1] العصیدۃ الیوسفیہ لقاریٔ القصیدۃ الغوثیہ، از مولانا محمد اعظم طبع لاہور ۱۳۴۲ھ، ص ۱۸۱۷

اثرات اس امر پر شاہدِ عادل ہیں کہ یہ سرکارِ غوثیت مآب کا کلام ہے۔

قصیدہ غوثیہ کو جس طرح زمانہ قدیم سے اولیاء اللہ پڑھتے اور پڑھواتے آئے ہیں، اسی طرح اس نورانی کلام کے رموز وغوامض کو سمجھنے، سمجھانے کی خاطر جلیل القدر علماء کرام اور اولیاء عظام اس کے تراجم وشروح لکھنا باعث سعادت سمجھتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ اس موقع پر صرف چند شروح وتراجم کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ شرح قصیدہ خمریہ (فارسی، خطی) تالیف علامہ شیخ فضل اللہ بن روز بہان مصنف ''سلوک الملوک'' (م ۹۲۷ھ) مخزونہ اکادمی علوم لینن گراڈ (روس) نمبر B-۲۱۴۵ (۲۵۹۸ف) مکتوبہ ۱۲۹۹ھ (۳۸پ، ۵۶پ)[۱]

۲۔ رموزِ خمریہ یہ شرح قصیدہ غوثیہ (فارسی) از عالم ربانی محمد فاضل کلانوری، صفحات ۴۴، مطبوعہ مطبع صادق سیتاپور، سال تصنیف ۱۱۰۸ھ، سن طباعت ۱۳۰۶ھ، یہ شرح مولانا عبدالقادر بدایونی (م ۱۳۱۹ھ) بن حضرت علامہ مولانا فضل رسول بدایونی (م ۱۲۸۹ھ) کے ایماء سے طبع ہوئی۔ اس شرح کے متعلق اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

> ''مولانا محمد فاضل کلانوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ معاصر سید علامہ سیدی احمد حموی صاحب غمز العیون والبصائر شرح الاشباہ والنظائر نے اس کی شرح (قصیدہ غوثیہ) مسمی بہ رموزِ خمریہ لکھی اور

---

[۱] کیوشکین: ۳۴۶/۲ بحوالہ فہرست نسخہ ہائی خطی فارسی از احمد منزوی جلد دوم مطبوعہ تہران ۱۳۴۹ھ ش، ۲۴۵۔

اس میں ہر لفظ و معنی سے اس قصیدہ کے کلام پاک حضور فرزند
صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ فعلیہ و بارک وسلم ہونے کی
شہادت دی۔"[1]

۳۔ قصیدہ غوثیہ مترجم پنجابی، از حافظ رانجھا برخوردار، جو پنجاب کے مشہور عالم و عارف تھے، نے تقریباً ۱۱۰۹ھ میں قصیدہ غوثیہ کا پنجابی نظم میں ترجمہ کیا جو غالباً ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ قصیدہ مبارکہ کا یہ منظوم ترجمہ مجموعۂ وظائف مترجمہ حافظ رانجھا برخوردار میں شامل ہے۔ یہ نادر خطی مجموعہ صاحبزادہ سبط الحسن ضیغم صاحب کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

۴۔ بیان الاسرار فی شرح القصیدہ للشیخ سید عبدالقادر جیلانی (عربی) از حضرت ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی (م ۱۱۵۱ھ) بخط غلام رسول مرید مصنف، صفحات ۴۳۰، سطور ۲۰، تقطیع ۸۰۵×۱۰۔۹، مخزونہ ذخیرہ مولوی شمس الدین مرحوم و مغفور (م ۱۳۸۷ھ) تاجر کتب نادرہ لاہور۔

نوٹ: یہ مخطوطہ مولوی صاحب کی وفات کے بعد کراچی میوزیم میں منتقل ہو گیا ہے
بیان الاسرار قصیدہ غوثیہ کی نہایت مبسوط علمی شرح ہے اور شاید اس سے بہتر آج تک کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ اس نادر و نایاب شرح کا اردو ترجمہ دربار قادریہ فاضلیہ، فاضلیہ کالونی لاہور کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، مگر کسی اہل علم کو دیکھنا نصیب نہیں، خدا جانے اس فیض کو محدود و مسدود رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟

۵۔ شرح قصیدہ خمریہ غوثیہ (فارسی) از فخر المحدثین سید شاہ محمد غوث قادری

---

[1] الزمزمۃ القمریہ: ص ۴

لاہوری (م۱۱۵۲ھ)...... یہ مختصر شرح بڑے عالمانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کے خطی نسخے متعدد لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے دو خطی نسخے اکادمی علوم، لینن گراڈ (روس) میں بھی موجود و محفوظ ہیں۔[1]

یہ شرح لاہور کے مشہور صوفی بزرگ پیر عبدالغفار شاہ قادری نقشبندی علیہ الرحمۃ (م۱۳۴۰ھ) خطیب و امام مسجد تکیہ کشمیری سادھواں لاہور نے ۱۳۲۹ھ میں طبع کرادی تھی یہ شرح دیگر چند رسائل کے ساتھ شائع کی گئی ہے، اس مطبوعہ شرح کے کل صفحات بارہ ہیں

۶۔ شرح قصیدہ خمریہ، تصنیف محمد بن ملا پیر محمد شیرازی! نوشتہ ۱۲۹۹ھ، مخزونہ اکادمی علوم، لینن گراڈ B۔۱۲۴۵ (۲۵۹۹ف)[2]

۷۔ شرح قصیدہ غوثیہ، از مولانا غلام رسول علیہ الرحمۃ

مولانا محمد اعظم قادری نوشاہی نے اس شرح کا یوں تعارف کرایا ہے:

"گزشتہ صدی کے آگے پیچھے حضرت علامۃ الدھر حاوی فروع واصول مولانا غلام رسول صاحب قدس سرہ ساکن ٹانڈا ضلع ہوشیار پور نے قصیدہ شریفہ کی ایک بہت عمدہ شرح لکھی ہے جو باریک قلم کی لکھی ہوئی گلستان کے حجم کی ہے۔"[3]

مولانا موصوف نے یہ نہیں لکھا کہ یہ شرح قلمی ہے یا مطبوعہ؟

۱۔ کمیو شکین: ۱/۶/۳۴۶ بحوالہ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی: جلد دوم، ص: ۱۲۴۵

۲۔ ایضاً

۳۔ العصیدہ الیوسفیہ لقاریٔ القصیدۃ الغوثیہ ۷ ص: ۱۴

۸۔ الزمزمۃ القمریہ فی الذب عن الخمریہ: تصنیف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ، صفحات ۴۰، سنِ تصنیف ۱۳۰۶ھ۔

یہ رسالہ متعدد مطابع کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں قصیدۂ متبرکہ کی سند اور اس کی عربیت کے بارے میں لاجواب بحث ہے اور آخر میں قصیدہ شریفہ کا منظوم ترجمہ و شرح ہے۔

۹۔ قصیدہ غوثیہ: مترجم اردو، جو قصیدہ بردہ کے ساتھ مطبع عزیزی معروف بہ احمدی دہلی سے باہتمام سید ظہیر الدین عرف سید احمد (نبیہ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمہ اللہ (م ۱۲۳۳ھ) طبع ہوا۔ اس کی ابتداء میں قصیدہ شریفہ کے فوائد درج ہیں جو غالباً سید احمد صاحب نبیہ شاہ رفیع الدین کے مرقومہ ہیں، ملاحظہ ہوں:

قصیدہ متبرکہ حضرت غوث الثقلین شاہ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کا جو آپ نے حالت جذبات میں زبان گوہر فشاں سے فرمایا ہے۔ بہت خاصیتیں رکھتا ہے:

اول: یہ کہ جو اس کو ہر روز گیارہ دفعہ پڑھے، اللہ کا محبوب و مقبول ہو۔

دوم: یہ کہ جو اس کا ورد کرے اس کا حافظہ ایسا ہو جائے کہ جو پڑھے یا سنے، یاد رہے۔

سوم: یہ کہ اس کے پڑھنے سے عربی کی استعداد زیادہ ہو۔

چہارم: یہ کہ جس مقصد کے لئے چالیس روز پڑھے، چلّہ نہ گزرے کہ اس کا مقصد حاصل ہو جائے۔

پنجم: یہ کہ جو اس کو اپنے پاس رکھے اور ہر روز تین مرتبہ پڑھے اور جو پڑھنا نہ جانتا ہو، دوسرے سے پڑھوائے اور چپ سنے اور اعتقاد سے ہر صبح کو اس کو

دیکھے، انشاء اللہ تعالیٰ حضرت غوث الثقلین کو خواب میں دیکھے اور اُمراء اور بادشاہ کا مقبول ہو۔

ششم: یہ کہ جس نیت اور مقصد کے واسطے پڑھے، مراد حاصل ہو لیکن چاہئے کہ اعتقاد درست ہو اور شروع سے پہلے کچھ شیرینی پر فاتحہ حضرت کی دے اور پڑھنے سے پہلے یہ درود شریف پڑھے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ مَعْدَنِ الْجُوْدِ وَالْکَرَمِ مَنبَعِ الْعِلْمِ وَالْحِلْمِ وَالْحِکَمِ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ وَصَلِّ عَلَیْھِمْ

نوٹ: اس ترجمہ کا سن طباعت اور مترجم کا نام درج نہیں ہے۔

۱۰۔ شرح قصیدہ غوثیہ: از مولانا خواجہ احمد حسین خاں امروہوی مجمع السلاسل (م ۱۳۶۱ھ) خلیفہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت بریلوی (رحمہما اللہ تعالیٰ) شرح اردو نثر اور قصیدہ کا ترجمہ اردو اور فارسی اُشعار میں ہے۔ یہ شرح ۱۹۰۸ء/۱۳۲۶ھ میں مطبع ریاضی امروہہ سے طبع و شائع ہوئی۔[1]

۱۱۔ العصیدۃ الیوسفیہ لقاریٔ القصیدۃ الغوثیہ: تالیف حضرت مولانا محمد اعظم قادری نوشاہی علیہ الرحمۃ ساکن میروال ضلع شیخوپورہ (م ۱۳۷۵ھ) صفحات ۱۰۴، مطبوعہ لاہور، سنِ طباعت ۱۳۴۲ھ۔

یہ شرح بھی اپنی نوعیت کی بے مثال شرح ہے۔ اس میں خاص خوبی یہ ہے

---

[1] مکتوب محترمہ پاشا بیگم صاحبہ دختر مصنف بنام راقم الحروف۔

کہ حضرت غوثِ پاک کے جن جن فقرات کو معترضنین نے صرف دعاوی قرار دیا ہے، فاضل مصنف نے ان فقرات کو احادیث سے لفظاً و معنیٰ اور آثارِ صحابہ و سلف صالحین سے نقلاً صحیحاً مطابق کر دکھایا ہے، قول بہ قول، عمل بہ عمل۔

یہ شرح عرصہ سے نایاب تھی، اب اسے ہمارے دوست قادری محمد اسلم سلیم نوشاہی، ادارہ معارف نوشاہیہ اعظمیہ، مرید کے منڈی ضلع شیخوپورہ سے طبع کر رہے ہیں جو عنقریب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

۱۲۔ تحفۂ محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی المعروف شرح قصیدہ غوثیہ: از مولانا محمد نظام الدین ملتانی ثم وزیر آبادی، صفحات ۳۲، سن تصنیف ۱۳۵۲ھ، مطبوعہ لاہور۔

اس شرح کی کیفیت یہ ہے کہ قصیدہ کا پنجابی اشعار میں ترجمہ دیا گیا ہے اور اردو میں توضیح کی گئی ہے اور آخر میں مختصر شرح لکھی ہے۔

۱۳۔ قصیدہ غوثیہ، منظوم اردو ترجمہ، از حاجی شمس الدین شائق ایزدی، عرف شمس الہند صوفی معنوی لاہوری (م ۱۹۳۶ء) صفحات ۸، بار اول ۱۹۳۰ء میں کواپریٹو سٹیم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپا۔

ذیل میں چار ایسے شروح و تراجم کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے مصنفین کے نام اور زمانۂ تصنیف معلوم نہیں ہو سکا:

۱۴۔ شرح قصیدہ عبدالقادر، قاہرہ دار الکتب ۹۱۰ زکیہ فارسی (مخطوطات (۱/۳۴۲)) [۱]

۱۵۔ شرح قصیدہ، مجلس ۵/۳۷۰۷۔ مؤرخ ۱۲۴۳ [۲]

---

[۱] فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی از احمد منزوی طبع تہران ۱۳۴۹ش، جلد دوم: ص ۱۲۴۵

[۲] فہرست کتابخانہ مجلس شوریٰ ملی تہران جلد پنجم، از عبدالحسین حایری بحوالہ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، جلد دوم ص: ۱۲۴۵

۱۶۔ شرح قصیدہ غوثیہ۔ مخزونہ پنجاب پبلک لائبریری نمبر ۲۹۷۰۴۲۔ قا، اوراق ۳۸۔[1]

۱۷۔ شرح قصیدہ غوثیہ: مخزونہ کتاب خانہ گنج بخش راولپنڈی (پاکستان) اوراق ۴۴، نمبر ۱۵۷/۲۹۰۔[2]

۱۸۔ شرح قصیدہ غوثیہ۔ خطی فارسی، اوراق ۱۵۔ منظوم ترجمہ اور منثور شرح ہے۔[3]

پیش نظر شرح (الجواہر المضیہ فی شرح القصیدۃ الغوثیہ) کی افادیت و اہمیت علامۃ الدہر مولانا ابوالبرکات عبدالمالک رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۶۰ھ) کے نام نامی واسم گرامی سے ظاہر ہے۔ اس نادر شرح کے متعلق مولانا محمد اعظم قادری نوشاہی شارح قصیدہ غوثیہ فرماتے ہیں:

''موجودہ زمانہ میں قصیدہ شریفہ کی ایک شرح جناب مولوی فاضل ابوالبرکات عبدالمالک صاحب مشیر مال ریاست بہاول پور نے لکھی ہے، جو بس غنیمت ہے۔ تحقیق الفاظ و معانی کی خوب داد دی ہے، صرفی، نحوی، عروضی، قرأتی اعتراضوں کو بہ دلائل عقلی ونقلی اس خوبی سے اٹھایا ہے کہ اگر ترکِ ادبِ اسلاف مانع نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ مذاقِ زمانہ کے مطابق یہ شرح سب سے اچھی

۱۔ تفصیلی فہرست مخطوطات فارسیہ، پنجاب پبلک لائبریری لاہور۔ از منظور احسن عباسی طبع ۱۹۶۳ء: ص ۸۶

۲۔ فہرست نسخہ حای خطی کتاب خانہ گنج بخش، تالیف محمد حسین تسبیحی، جلد اول، ۱۹۷۱ء، ص ۲۷۶

۳۔ مخزونہ ذخیرہ حکیم اللہ بخش انصاری اسد نظامی (چک نمبر ۱۴ جہانیاں)

ہے۔ فاضل علامہ نے نہایت خلوص واعتقاد، محبت و وداد سے قلم اٹھا کر علمی شجاعت اور عملی حمایت کا وہ اثر دکھایا ہے جو اس کلام اور متکلم کے شایان شان ہے، جزاہ اللہ وابقاہ"[1]

حضرت علامہ عبدالمالک نے مقدمہ میں تاثیر وردِ قصیدہ شریفہ کے بارے میں حکیمانہ انداز میں گفتگو فرمائی ہے، نیز حضور غوثِ اعظم کے حالات ومقامات عالیہ کو نہایت عمدگی سے تحریر کیا ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ۔

علامہ ابوالبرکات عبدالمالک مرحوم ومغفور ساکن کھوڑی ضلع گجرات، مشیر مال ریاست بہاول پور، پنجاب کے ان چند اساتذہ عربی ادب میں سے تھے جن پر اہل پنجاب ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ علامہ عبدالمالک صاحب کا زمانہ ایسا مبارک زمانہ تھا کہ اس وقت ہر شہر اور ہر قصبے میں جید علماء وفقہاء تشنگانِ علوم دینیہ کی تشنگی دور کرنے میں مصروف تھے اور عربی زبان وادب کے ماہرین کی بھی کمی نہ تھی۔ ضلع گجرات میں متعدد حضرات عربی زبان وادب کی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ قلعدار کے علماء میں سے مولانا علامہ عبدالکریم (م ۱۳۷۷ھ) اور ان کے خاندان کے دیگر افراد، کھوڑی میں علامہ ابوالبرکات کے والد اور بھائی، چک عمر کے مولانا شیخ عبداللہ (م ۱۹۲۱ء) بھین ضلع جہلم کے علامہ محمد حسن فیضی (م ۱۳۱۹ھ) اور ان کے فرزند مولانا فیض الحسن (م ۱۳۴۷ھ)، لاہور میں مولانا محمد الدین فوقی مصنف روضۃ الادباء (م ۱۳۱۶ھ) اور علامہ اصغر علی روحی (م ۱۹۵۴ء) اور امرتسر میں علامہ مولانا محمد عالم آسی (م ۱۳۶۳ھ) وغیرہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین، یہ سب حضرات فن ادب میں ایسی

---

[1] العصیدۃ الیوسفیہ لقاریٔ القصیدۃ الغوثیہ ص ۱۴

کامل دستگاہ رکھتے تھے کہ اگر انہیں آسمانِ علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

ان سب حضرات کے حالات وکمالاتِ عالیہ پر کام ہونا چاہیے۔ فاضلِ محترم حکیم محمد مظفر علی صاحب زید مجدہ نے حضرت علامہ ابوالبرکات عبدالمالک کے حالات زندگی مختصراً تحریر فرمائے ہیں جو اس کتاب میں درج ہیں۔ حکیم صاحب موصوف کو اس فاضل اجل بزرگ پر تفصیلی کام کرنا چاہیئے۔

الجواہر المضیہ فی شرح القصیدۃ الغوثیہ از علامہ عبدالمالک رحمہ اللہ کے طابع و ناشر الحاج پیر سید محمد حسن شاہ قادری گیلانی نوری مدظلہ ابن الرشید پیر طریقت حضرت مولانا سید محمد معصوم شاہ قادری نوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۸۸ھ) سجادہ نشین چک سادہ شریف (گجرات) مالک نوری بکڈپو، لاہور کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا انہوں کہ انہوں نے قصیدہ غوثیہ مقدسہ کی یہ بہترین شرح طبع کر کے طالبان فیض غوثیت مآب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک دیرینہ آرزو پوری کردی ہے۔ میرے مکرم و محترم بزرگ حضرت الحاج مولانا پیر غلام قادر چشتی اشرفی قادری ضیائی زید مجدہٗ مقیم لالہ موسیٰ ضلع گجرات بھی سپاس گزاری کے مستحق میں کہ انہوں نے یہ نایاب شرح طباعت کے لئے مہیا فرمائی۔

حضرت مولانا غلام قادر اشرفی صاحب زبدۃ العارفین حضرت مولانا شاہ محمد علی حسین چشتی قادری اشرفی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۵۵ھ) سجادہ نشین کچھوچھ شریف کے مرید ہیں اور شرف خلافت واجازت سے بھی سرفراز ہیں، نیز شیخ العرب والعجم سیدی حضرت مولانا ضیاء الدین احمد قادری رضوی مہاجر مدنی مدظلہ العالی خلیفہ مجاز امام اہل

سنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ سے اجازت یافتہ ہیں۔

حضرت مولانا غلام قادر کے والد ماجد (مرحوم ومغفور) قطب دوراں، سراج السالکین عمدۃ الکاملین حضرت میاں محمد شاہ چشتی نظامی قدس سرہ (م ۱۳۳۲ھ) مدفون بسی نومتصل ہوشیار پور (مرشد ارشد شیخی ومرشدی شیخ العصر حضرت الحاج مولانا علامہ میاں علی محمد خاں چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ م ۱۳۹۵ھ) مدفون بسی نومتصل ہوشیار پور (مرشدِ ارشد شیخی ومرشدی شیخ العصر حضرت الحاج مولانا علامہ میاں علی محمد خاں چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ م ۱۳۹۵ھ) سے بیعت تھے۔ مولانائے موصوف زید شرفہ قادری اور چشتی نسبتوں کے لحاظ سے مجمع البحرین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چھٹی شریف کو آپ محفل سماع میں نظر آتے ہیں تو گیارہویں شریف کو ختم غوثیہ میں مستغرق دیکھے جاتے ہیں اور نسبت قادریہ ہی کی بنا پر آپ مرکزی مجلس رضا لاہور کے خصوصی معاون ہیں۔

جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

صوفی محمد رضاء المصطفیٰ چشتی المتخلص بہ رضا ونصیری ساکن کوٹلی لوہاراں مغربی مؤلف ''سوانح حضرت میاں علی محمد خاں رحمۃ اللہ علیہ'' اور عزیز محترم قاضی صلاح الدین رضوی اضیائی صاحب کا ذکر کرنا بھی ازبس ضروری ہے۔ یہ حضرات اس شرح کی طباعت کے سلسلے میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں، جزاہما اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

احقر راقم السطور یہ ہدیہ عقیدت (مقدمہ) سلسلہ عالیہ قادریہ کے شیخ کبیر سیدی حضرت مولانا ضیاء الدین احمد قادری رضوی مہاجر مدنی زید مجدہ کے توسط سے سلطان الاولیاء سیدنا حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضور بصد ادب، واحترام پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ ع

گر قبول افتدز ہے عزو شرف

آخر میں یہ دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بہ طفیل حضرت غوثِ اعظم قدس سرہ قارئین کرام اور احقر راقم السطور کو غریق بحرِ غفران فرمائے۔ ع

این دعا از بندہ آمیں از فلک

پوزش از بغداد اجابت از فلک

لاہور۔ یوم وصالِ غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ — گدائے کوئے غوث ومعین

۱۱ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ — محمد موسیٰ عفی عنہ

داتا گنج بخش اور کشف المحجوب

حامدًا و مصلیًا مخدوم الاولیاء، سلطان الاصفیاء، حضرت شیخ علی ہجویری معروف بہ حضرت داتا گنج بخش لاہوری قدس سرّہ العزیز، اُس قدسی گروہ کے سرخیل ہیں جو امام رُسل، ہادی سُبل، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ واصحابہ وبارک وسلم کی کمال محبت ومتابعت سے ولایت کے ارفع واعلیٰ مقام اور بلند مراتب پر فائز ہو کر خلافتِ الٰہیہ اور حضرت سید الانبیاء ﷺ کی نیابت کبریٰ کے منصب جلیلہ پر متمکن ہوتے ہیں اور چونکہ اُنہوں نے اپنے آپ کو محبوبِ خدا کی محبت میں فنا کر دیا ہوتا ہے، انہیں بھی مقامِ محبوبیت عطا ہو جاتا ہے اور وہ زمین پر خلیفۃ اللہ اور مظہرِ انوارِ خدا اور نائبِ محبوبِ خدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا:

۱۔ ان کی ظاہری زندگی میں بے پناہ فیضِ رُشد وہدایت جاری ہوتا ہے۔

۲۔ برزخی زندگی میں قاسمِ فیوض وبرکات ہوتے ہیں اور اُن کا روحانی فیض عوام وخواص کے لیے یکساں ہوتا ہے۔

۳۔ ان کی تعلیمات وارشادات طالبانِ راہِ خدا کے لیے مرشد طریق کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر مرتبہ و استعداد کے لوگ اپنی اپنی حیثیت اور ظرف کے مطابق ان سے مستفید ومستفیض ہوتے ہیں۔

چنانچہ بعطائے الٰہی وبفیض سرور عالم ﷺ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے:

i۔ اپنی حیات مبارکہ میں کفرستانِ ہند میں اسلام کا پرچم لہرایا اور اپنی روحانی قوت اور نظر کیمیا اثر کے ذریعے بے شمار گم گشتگانِ بادیہ کفر وضلالت کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا اور ان کے سینوں کو نورِ اسلام سے منور فرمایا۔

ii۔ بعد وصال حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پُر انوار فیض رسانِ عالم اور منبع روحانیت وطمانیت ہے:

نام فقیر تنہاندا باہو قبر جنہاندی جیوے ہُو

iii۔ ان کے ارشاداتِ گرامی وافاضاتِ عالی (کشف المحجوب) بجائے خود مرشدِ کامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرضیکہ ایسی محبوبیت ومقبولیت امتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے بہت کم اولیاء کرام کو حاصل ہوئی ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

حالاتِ زندگی:

حضرت داتا گنج بخش قدس سرّہ برصغیر پاک وہند کے اوّلین مبلغینِ اسلام میں سے ہیں اور اُن کا مزارِ گوہر بار اُن کے فیضان کی وجہ سے عرصہ نوسو سال سے مرجع خواص وعوام چلا آ رہا ہے اور ان کی کشف المحجوب اطراف واکنافِ عالم میں شہرت رکھتی ہے۔ بایں ہمہ ان کے حالاتِ بابرکات پر کوئی قدیم کتاب نہیں ملتی۔ میرے خیال میں اس کی وجوہ یہ ہیں:۔

(ا) جس زمانے میں حضرت داتا گنج بخش رحمہ اللہ نے لاہور میں شمعِ ہدایت روشن کی، اس وقت یہاں مسلمانوں کے نئے نئے قدم جمے تھے اور پورے طور پر سیاسی استحکام حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں جن مؤرخین نے تاریخ نویسی کا آغاز کیا، اُنہوں نے تاریخ کو اپنے آقایانِ نعمت (فاتحین) کے گرد گھمانا شروع کر دیا اور بعد کے مؤرخین نے صرف ان بزرگاں کے مختصر حالات لکھے جن کے آستانوں پر ان کے ممدوحین کو شرفِ حاضری نصیب ہوا۔

(ب) جن حضرات نے بادشاہوں سے ہٹ کر صرف ان نفوسِ قدسیہ، جن کی حکومت لوگوں کے دلوں پر تھی، کے حالاتِ زندگی اور ان کی اسلامی و روحانی خدماتِ جلیلہ کی تفصیلات کو قلم بند کیا، ان کی تالیفات کو اس خطے کی ازلی بدنصیبی (بہ سلسلہ اتلافِ کتب) نے محفوظ نہیں رہنے دیا۔

ظاہر ہے کہ بزرگانِ دین رحمہم اللہ کا تذکرہ نویسوں میں سے اکثر فنِ تاریخ کے ماہر نہ تھے۔ لہٰذا وہ بزرگوں کے حالات لکھتے وقت واقعات کے سنین کا صحیح تعین نہ کر سکے جس کے باعث تاریخ دانوں کو بدظنی کا موقع مل گیا۔

بہرحال حضرت داتا گنج بخش قدس سرّہٗ پر بھی ضرور کام ہوا ہوگا مگر وہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ جہانگیری عہد کے مشہور تذکرہ نگار محمد غوثی بن حسن شطاری، حضرت داتا صاحب کے حالات کے ذیل میں بسال ۱۰۲۲ھ لکھتے ہیں:

"تواریخ مشائخ کے سابقہ مصنفین کا خیال ہے **کشف المحجوب** کے مصنف وہ بزرگ ہیں جن کا مزار مبارک لاہور میں ہے۔"[1]

---

[1] اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، تالیف محمد غوثی، طبع آگرہ ۱۳۲۶ھ، ص: ۲۵

محمد غوثی نے سابقہ مصنفین کا جو حوالہ دیا ہے اس سے واضح ہے کہ حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ کے حالات کے بہت سے مآخذ تلف ہو چکے ہیں...... ان مآخذ کے اتلاف کا نتیجہ ہے کہ

ع: چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کے مصداق یہاں کے دانشور تاریخ و تحقیق کے نام پر کوئی نہ کوئی نیا افسانہ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔[1]

بحر حال موجودہ معلوم تذکرہ میں سے ''تذکرۃ الاولیاء'' از شیخ فرید الدین عطار قدس سرہٗ میں صرف دو جگہ حضرت داتا صاحب کا اسم گرامی درج ہے۔ محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' اور ''دُررِ نظامی'' میں بھی ان کا ذکرِ خیر ہوا ہے۔ ان کے بعد کے ایک ایسے ماخذ میں سے ایتھے (Ethe) نے علمی دُنیا کو متعارف کرایا ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ اس کا نام ''رسالہ ابدالیہ'' ہے جو حضرت مولانا محمد یعقوب بن عثمان[2] غزنوی کی تالیف ہے پھر مولانا جامی نے ''نفحات الانس'' میں شیخ احمد زنجانی نے ''تحفۃ الواصلین'' (غیر موجود) میں، ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں عبدالصمد بن افضل محمد نے ''اخبار الاصفیاء'' (خطی)[3] میں، لعل بیگ لعلی نے ''ثمرات القدس (خطی)'' میں، مولانا محمد غوثی نے

---

[1] اس سلسلہ کی ایک کڑی ''حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش'' مؤلفہ پروفیسر شیخ عبدالرشید ہے، جسے مرکزی اردو بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔

[2] رسالہ ابدالیہ، نمبر ۱۷۷۴، انڈیا آفس لائبریری لندن، ضمناً دو کشف المحجوب

[3] اس کے خطی نسخے بعض لائبریریوں میں موجود ہیں۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے داتا صاحب کے حالات کے سلسلے میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

''گلزارِ ابرار'' میں، محمد دارا شکوہ نے ''سفینۃ الاولیاء'' میں مولانا محمد بقا بقا اور بختاور خاں نے ''ریاض الاولیاء''[1] میں ذکر کیا ہے۔ حضرت داتا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات کے یہی قدیم ماخذ ہیں۔

ان کے بعد لالہ سجان رائے بٹالوی نے ''خلاصۃ التواریخ'' میں اور میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام'' میں ضمناً ذکر کیا ہے۔ متاخرین میں سے لالہ گنیش داس وڈیرہ نے ''چار باغ پنجاب'' میں، مفتی غلام سرور لاہوری نے ''خزینۃ الاصفیاء'' اور حدیقۃ الاولیاء'' میں، مولوی نور احمد چشتی نے ''تحقیقاتِ چشتی'' میں حالات لکھے ہیں اور ان کے بعد کے مؤلفین نے ان ہی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

مگر ان سب تذکروں اور تاریخوں کے مندرجات کے پڑھنے سے مستند اور قابل اعتماد تاریخی مواد بہت کم ملتا ہے۔ حتیٰ کہ صحیح سن پیدائش بھی معلوم نہیں ہوسکتا۔ تاریخ وصال میں بھی اختلاف ہے اور حضرت کے ورودِ لاہور کا مسئلہ بھی خاصا پریشان کُن ہے۔ غرض کہ حضرت داتا صاحب کے مستند حالات زندگی اسی قدر ملتے ہیں جتنے اُنہوں نے خود کشف المحجوب میں بیان کیے ہیں۔

نام و نسب:

ابوالحسن کنیت، علی اسمِ گرامی ہے...... مفتی غلام سرور نے بحوالۂ ''تاریخ متقدمین''، شجرۂ نسب اس طرح لکھا ہے۔

---

[1] کتب خانہ آصفیہ نمبر ۱۱۵

حضرت مخدوم علی، بن عثمان بن سید علی، بن عبدالرحمٰن، بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی، بن حسین اصغر، بن سید زید شہید، بن حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بن علی کرم اللہ وجہہ[1]

مشہور ماہر علم انساب پیر غلام دستگیر نامی (م ۱۳۸۱ھ) نے یہی شجرۂ نسب ''تاریخ جلیلہ''[2] اور ''بزرگانِ لاہور'' میں درج کیا ہے مگر پانچویں بزرگ کا نام عبداللہ اور قوسین میں شجاع شاہ[3] تحریر کیا ہے اور درج ذیل نوٹ دیا ہے:

''مفتی غلام سرور نے زید کے ساتھ جو لفظ ''شہید'' لکھا ہے، وہ ٹھیک نہیں، کیونکہ جو زید شہید مشہور ہیں وہ امام زین العابدین بن امام حسین بن علی کے فرزند تھے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)''

آریانا دائرۃ المعارف میں حضرت داتا صاحب پر جو مختصر اور تحقیقی مقالہ درج ہے، اس میں لکھا ہے:

''مولوی غلام سرور لاھوری در خزینة الاصفیاء در شرح حال او، از سیادت او ذکر می نماید، واز مآخذ خود نام نمی برد جزاینکه می گوید درتواریخ قدیم نسب اُوراچنیں شمرده اند...... به هرحال در ذکر نسب او آنچه مورد اعتماد است و جامی و

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، ص: ۲۳۳

[2] تاریخ جلیلہ، طبع دوم ص: ۲۰۴

[3] بزرگان لاہور، ص: ۱۸۴

داراشکوہ نیز آں را واثق دانستہ اند، ہماں ذکر مختصریست کہ خود شیخ در کشف المحجوب نمودہ ودراں ہیچ گونہ اشارتی نہ تصریحاو نہ کنایتابہ طرف سیادت خود نمودہ است تنہا در غزنی خانوادہ کہ خود رابہ شیخ منسوب واولاداومی دانند خود را سیدمی شمارند"[1]

ترکِ نسب، شانِ فقر اور نشانِ عشق ہے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اسی بناء پر سیّدنا الثقلین حضرت شیخ سیّد عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "قصیدۂ غوثیہ" جو ایک خاص حالت میں لکھا گیا، کے سوا کہیں اپنے آپ کو سیّد نہیں لکھا۔ لہٰذا صاحب مقالہ مذکور کا اس طرف خیال جانا تعجب کی بات ہے۔ بہر حال ایسے لوگوں کے اطمینان کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ داراشکوہ سے دو سو سال پہلے فوت ہونے والے سید محمد نور بخش جو ماہر انساب بھی تھے، نے اپنی کتاب "سلسلۃ الذہب مشجر الاولیاء" میں حضرت داتا صاحب کو سیّد لکھا ہے۔[2] اور جو یہ لکھا ہے کہ: "غزنی میں وہ خانوادہ جو اپنے آپ کو حضرت شیخ سے منسوب کرتا اور ان کی اولاد جانتا ہے اور اپنے آپ کو سادات میں شمار کرتا ہے۔" کچھ عجیب سی بات ہے۔ یہ لوگ

---

[1] آریانہ دائرۃ المعارف، جلد اوّل، طبع کابل، ص: ۹۴۷

[2] سلسلۃ الذہب مشجر الاولیاء، حصہ دوم، ص: ۲۲

حضرت داتا صاحب کے ہم جدّ ہوں گے۔

مولد وموطن:

حضرت داتا صاحبؒ قدس سرّہٗ افغانستان کے شہر غزنی کے رہنے والے تھے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

"علی بن عثمان بن علی الجلابی الغزنوی ثم الھجویری"

دارا شکوہ لکھتا ہے:

"حضرت، غزنی کے رہنے والے تھے۔ جلاب اور ہجویر غزنی کے محلوں میں سے دو محلے ہیں۔ پہلے جلاب میں قیام پذیر تھے، پھر ہجویر میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے ماموں تاج الاولیاء کے مزار سے متصل ہے اور ان کے خاندان کے تمام افراد صاحب زہد وتقویٰ تھے[1]..... مَیں ان کے والدین اور ماموں کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہوں"۔[2]

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے تحریر کیا ہے:

"زبیری صاحب کمشنر بہاولپور نے ۲۶/اکتوبر ۱۹۵۹ء کو مجھے بتایا کہ یہ قبریں اب بھی موجود ہیں وہ (زبیری صاحب) غزنی گئے تھے اور اُنہوں نے ان قبروں کو موجود پایا ہے۔"[3]

---

[1] سفینۃ الاولیاء (فارسی) از دارا شکوہ، طبع کانپور، ۱۹۰۰ء، بار دوم: ص: ۱۶۴

[2] ایضاً ص: ۱۶۵

[3] مقالات دینی وعلمی، حصہ اوّل، از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ۱۹۷۰، ص: ۲۲

سالِ ولادت:

حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ کا سالِ ولادت کسی قدیم کتاب میں درج نہیں۔ اس دور کے مؤلفین نے تخمین سے کام لیا ہے۔ پروفیسر نکلسن کا خیال ہے:

''اُن کی پیدائش دسویں صدی کے آخری عشرہ میں یا گیارھویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں ہوئی ہوگی۔ یعنی ۳۸۱ء یا ۴۰۱ء''

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''اندازے سے کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت پانچویں صدی کے شروع میں ہوئی ہوگی۔''[۲]

ڈاکٹر معین الحق کی رائے یہ ہے:

''بعض لوگوں نے ان کی پیدائش کا سال ۴۰۰ھ لکھا ہے لیکن اس کو یقینی نہیں کہا جا سکتا۔''[۳]

مفتی محمد دین فوق رقم فرماتے ہیں:

''ان کی پیدائش کا فخر ۴۰۰ھ یا ۴۰۱ھ کو حاصل ہوتا ہے۔''[۴]

سالِ ولادت کے باب میں مذکورۃ الصدر قیاس آرائیوں کی تائید ''رسالہ ابدالیہ'' سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی رسالہ مذکورہ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ حضرت علی ہجوری

---

[۱] کشف المحجوب انگریزی ترجمہ از نکلسن، ص:۱۱ (دیباچہ)

[۲] مقالات دینی و علمی، ص:۲۲۲

[۳] معاشرتی و علمی تاریخ طبع کراچی، ص:۲۱

[۴] داتا گنج بخشؒ از محمد دین فوق، ۱۹۲۰ء، ص:۵

وقتاً فوقتاً محمود غزنوی کے دربار میں جاتے تھے اور اُنہوں نے عنفوانِ شباب میں ایک ہندی فلسفی سے مناظرہ بھی کیا تھا۔[1] عنفوانِ شباب سے بیس اکیس سال عمر فرض کر سکتے ہیں۔ محمود ۴۲۱ھ میں فوت ہوا لہٰذا ''رسالہ ابدالیہ'' کی اس روایت کی بناء پر حضرت کا سالِ ولادت ۴۰۰ھ کے لگ بھگ قرار دیا جاسکتا ہے۔

بقولِ لین پول، محمود غزنوی ۳۸۸ھ/۹۸۸ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ گویا حضرت داتا صاحب، سُلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت میں اس وقت پیدا ہوئے جب کہ وہ پاک و ہند پر متعدد بار حملہ آور ہو چکا تھا اور حضرت داتا صاحب اس غازی کے پاس اس کی زندگی کے آخری دو برسوں میں آتے جاتے رہے ہوں گے۔

اساتذہ:

حضرت داتا صاحب قدس سرّہٗ علومِ ظاہری و باطنی کے بحرِ زخار تھے۔ ان کی یہ عظمت اس کی واضح دلیل ہے کہ اُنہوں نے متعدد علماء، وفضلاء سے اکتسابِ علوم کیا ہوگا۔ مولانا جامی نے صرف ''**عارف و عالم بوده**'' لعل بیگ علی نے ''**در فنون علم ماهر بود**'' اور مفتی غلام سرور نے ''**جامع بود میان علوم ظاهر وباطن**'' لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ مگر کشف المحجوب جہاں داتا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مختصر حالات سے آگاہ کرتی ہے، وہاں ان کے ایک باقاعدہ اُستاذ کے نام نامی کی نشاندہی بھی کرتی ہے..... حضرت نے اپنے ایک اُستادِ گرامی ابو العباس بن محمد شقانی کا ذکر نہایت ادب واحترام سے کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

---

[1] فہرست مخطوطاتِ فارسیہ، انڈیا آفس لائبریری، مرتبہ ایتھے (Ethe) ، ۱۹۰۳ء اور دیباچہ کشف المحجوب انگریزی ترجمہ از نکلسن، ص: ۱۰

مرا باوی انسی عظیم بود و وے را بر من شفقتی صادق، و در بعضی از علوم استاد من بود۔[1]

حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ جوان عمری ہی میں علوم ظاہری کی تکمیل کر چکے تھے۔ انہیں فطرتاً ولی اللہ ہونے کا مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ یعنی وہ بطنِ مادر ہی سے ولی کامل پیدا ہوئے تھے، صاحبِ رسالہ ابدالیہ کا بیان ہے:

''حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کی موجودگی میں بمقام غزنی ایک ہندو فلسفی سے مناظرہ کیا اور اسے اپنی روحانی قوت سے ساکت و صامت کر دیا۔''[2] ظاہر ہے کہ یہ مناظرہ سلطان محمود غزنوی کی زندگی کے آخری برسوں میں ہوا ہوگا اور اس وقت حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی عمر بیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔

مرشد ارشد:

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سلسلہ جنیدیہ میں حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی قدس سرہٗ[3] (م ۴۶۰ھ) سے بیعت تھے۔ شجرۂ طریقت سلطانِ ولایت حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم تک اس طرح منتہی ہوتا ہے:

''حضرت شیخ علی ہجویری مرید شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی کے،
وہ مرید حضرت شیخ حصری کے، اور مرید حضرت شیخ ابوبکر شبلی

---

[1] کشف المحجوب طبع تہران۔ ص: ۲۱۰

[2] دیباچہ کشف المحجوب (انگریزی ترجمہ از نکلسن)، ص: ۱۰

[3] ختل یا ختلان، بدخشاں کے مغرب میں دریائے جیجوں کے دائیں کنارے پر واقع ایک مقام کا نام ہے۔

کے، وہ مرید حضرت جنید بغدادی کے، وہ مرید شیخ سرّی سقطی کے، وہ مرید حضرت معروف کرخی کے، وہ مرید حضرت داؤد طائی کے، وہ مرید حضرت حبیب عجمی کے، وہ مرید حضرت حسن بصری کے اور وہ مرید حضرت علی المرتضیٰ کے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)''۔

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے پیرومرشد کے علومقام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صوفیاء متاخرین میں سے اوتاد کی زینت اور عابدوں کے شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی ہیں، طریقت میں میری اقتداء (بیعت) انہی سے ہوئی، علم اور تفسیر وروایات (حدیث) کے عالم تھے، تصوف میں حضرت جنید کا مذہب رکھتے تھے۔ حضرت حصری کے راز دار مرید تھے۔ ابوعمر قزوینی اور ابوالحسن سالبہ کے ہم عصر تھے۔ صحیح گوشہ نشینی کے لیے ساٹھ سال تک تنہائی کی تلاش میں پھرتے رہے اور مخلوق کے ذہنوں سے اپنا نام محو کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ زیادہ تر جبلِ لگام[1] میں قیام پذیر رہے، عمر طویل پائی، اپنی ولایت کی بہت سی دلیلیں اور نشانیاں رکھتے تھے لیکن صوفیاء کے رسوم ولباس کے پابند نہ تھے اور رسوم میں جکڑے ہوئے صوفیوں سے درشتی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان

---

[1] جبل لگام سلسلہ کوہِ لبنان کا وہ حصہ ہے جو انطاکیہ اور مضیفہ سے متصل ہے۔

سے زیادہ کسی کو باہیبت نہیں دیکھا۔''[1]

جس روز حضرت ختلی کا وصال ہوا، حضرت داتا صاحب اُن کی خدمت میں حاضر تھے اور مُرشد ختلی نے مرید ہجویری کی گود میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی تھی۔ اس واقعہ کو یوں بیان فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ ختلی بروزِ وصال بیت الجن میں تھے، یہ ایک گاؤں ہے کھاٹی پر، جو بانیار (رود بانیاں) اور دمشق کے درمیان واقع ہے۔ دم رحلت اُن کا سر میری گود میں تھا اور میرا دل انسانی فطرت کے مطابق ایک سچے دوست کی جدائی پر رنجیدہ تھا۔ اس حالت میں اُنہوں نے فرمایا: اے بیٹا! میں تمہیں اعتقاد کا ایک مسئلہ بتاتا ہوں، اگر اس پر مضبوطی سے عامل رہو گے تو تمام تکلیفوں سے محفوظ رہو گے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ تمام مواقع اور حالات میں نیک اور بد کو پیدا کرنے والا خدائے عزوجل ہے، لہٰذا اس کے کسی فعل پر کبیدہ نہ ہونا اور رنج کو اپنے دل میں جگہ نہ دینا...... اس کے علاوہ اور کوئی لمبی وصیت نہیں کی اور جاں بحق تسلیم ہو گئے''[2]

حضرت بایزید بسطامی اور مشائخ طیفوریان (رحمہم اللہ تعالیٰ) ''سُکر'' کو ترجیح دیتے تھے اور حضرت جنید اور ان کے پیروکار ''صحو'' کو ''سُکر'' پر فضیلت کے قائل تھے۔ کشف المحجوب میں اپنے مرشد کی رائے نقل فرماتے ہیں کہ ''سُکر'' بازیچۂ اطفال اور

---

[1] کشف المحجوب، طبع تہران، ص:۲۰۸

[2] ایضاً، ص:۱۰۹

"صحو" مردوں کا میدان فنا ہے:

"شیخ من گفتی ووی جنیدی مذهب بود که سُکر بازی گاه کودگان است وصحوفنا گاه مردان ومن که علی بن عثمان الجلابی ام، می گویم: برامرافقت شیخم"[1]

سید محمد نور رحمہ اللہ تعالیٰ (م ۸۶۹ھ) بانی سلسلہ نوربخشیہ جن کے سلسلے سے منتسبین اپنے شیخ کے مسلک سے ہٹ کر گمراہ اور بے دین ہو چکے ہیں، نے حضرت داتا صاحب کو دو بزرگوں شیخ ختلی اور شیخ ابوالقاسم گرگانی کا مرید خلیفہ لکھا ہے:

"......حضرت علی هجویری هم ازیں سلسله (جنیدیه) منسلک است که او مرید(و) خلیفه دو مشائخ اند، یکے شیخ ابوالقاسم گرگانی...... ودوم شیخ ابو الفضل ابن ختلی"[2]

مگر حقیقت یہ ہے کہ شیخ گرگانی، داتا صاحب کے شیخِ صحبت یا شیخِ تربیت ہیں، نہ کہ پیر بیعت۔

ہم عصر مشائخ سے استفادہ:

حضرت شیخ ختلی کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کرام فیض صحبت وشرف مکالمت سے بہرہ یاب ہوئے جن کا ذکرِ خیر کشف المحجوب میں مسطور ہے۔ مثلاً

---

1. کشف المحجوب، طبع تہران، ص:۲۳۲
2. کتاب سلسلۃ، شجر الاولیاء از سید نور بخش، طبع لاہور ۱۹۷۲ھ، حصہ دوم، ص ۲۲

ابوالقاسم بن قاسم بن عبداللہ الکرگانی قدس سرّہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مرا باوی اسرار بسیار بود و اگر باظہارِ آیات مشغول شوم از مقصود باز مانم"[1]

ابوالقاسم امام قشیری قدس سرّہٗ سے بھی صحبتیں رہیں اور اُن کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے:

"استادِ امام وزین اسلام عبدالکریم ابوالقاسم بن ہوازن القشیری اندر زمانہ خود بدیع ست وقدرش رفیع ست و منزلت و بزرگ و معلوم ست اھل زمانہ را از روزگارِ وی و انواع فضلش، اندر ہرفن وے الطائف بسیار است وتصانیف نفیس جملہ باتحقیق و خداوند تعالیٰ حال و زبان ویرا از حشو، محفوظ گردا نیدست"[2]

حضرت شیخ احمد حمادی سرخسی قدس سرہٗ کے ساتھ ماوراء النہر میں محبت و دوستی رہی۔ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"خواجہ احمد حمادی سرخسی مبارز وقت و مدتی رفیقِ من بود و اذکار وے عجائب بسیار دیدم وے از جوان مردان متصوّفہ بود......"[3]

---

[1] کشف المحجوب، طبع تہران ص:۲۱۲

[2] ایضاً ص:۲۰۹ [3] ایضاً ص:۲۱۶

حضرت ابوجعفر محمد بن المصباح الصید لانی قدس سرّہٗ جو صاحبِ تصانیف عالم وعارف تھے، ان کی تصانیف ان ہی کے روبرو پڑھیں:

"شیخ بزرگوار ابوجعفر محمد بن المصباح الصید لانی ازروساء متصوّفه بودو زبانی نیکو داشت اندر تحقیق، و میلی عظیم داشت به حسین بن منصور و بعضی از تصانیف وی بروخواندم"[۱]

حضرت ابوسعید ابوالخیر شیخ ابواحمد المظفر بن احمد بن حمدانِ رحمہم اللہ تعالیٰ اور متعدد دیگر اولیاء اللہ سے ملاقاتوں کا حال کشف المحجوب کے مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ صرف خراسان میں تین سو صوفیاء سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔[۲]

حضرت خضر علیہ السلام سے استفادہ:

لعل بیگ لعلی ہے حضرت شیخ علی ہجویریؒ بہت سے اولیاءِ وقت کو ملے اوران کے ہم صحبت رہے۔ نیز حضرت خضر علیہ السلام سے گہری دوستی رکھتے تھے اوران سے علم ظاہری وباطنی حاصل کیا تھا:

"وبسیاری از اولیاء وقت رادریافته وبا ایشان هم صحبت بوده و باخضر علیه السلام دوستی عظیم داشته واز وی علم ظاهری و باطنی فرامی فرستده"[۳]

۱۔ کشف المحجوب، طبع تہران، ص:۲۱۱

۲۔ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص:۲۱۶

۳۔ ثمرات القدس (خطی) مملوکہ صاحبزادہ نصرت نوشاہی، شرقپور شریف)

حنفی المذہب:

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ حنفی المذہب تھے۔ سیدنا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ اسی سبب سے انہوں نے امام موصوف کا نام نامی واسمِ گرامی نہایت تعظیم وتکریم سے اس طرح رقم فرمایا ہے:

"امام اماماں و مقتدائے سُنیاں ، شرفِ فقہاء وعز علماء،

ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الخراز رضی اللہ عنہ"[1]

حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے کمالات کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اپنا ایک ایمان افروز خواب بیان کیا ہے اور اس سے ایک نہایت لطیف نکتہ اخذ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"میں ملک شام میں تھا کہ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مؤذّنِ رسول (ﷺ) کے روضۂ اطہر کے سرہانے سو گیا اور خواب مَیں دیکھا کہ میں مکہ معظمہ میں ہوں اور جناب پیغمبر ﷺ باب بنی شیبہ سے اندر تشریف لائے ہیں اور ایک بوڑھے شخص کو گود میں لیے ہوئے ہیں، جس طرح کہ بچے کو شفقت سے گود میں لیتے ہیں۔ میں دوڑ کر حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سرکار ﷺ کے پائے اقدس کو بوسہ دیا...... میں حیران تھا کہ یہ بزرگ کون ہیں جنہیں حضور نے اُٹھایا ہوا ہے؟ حضور ﷺ بہ قوتِ معجزہ میرے اس باطنی خیال سے آگاہ ہو گئے اور ارشاد فرمایا: یہ شخص تیرا اور

---

[1] کشف المحجوب: طبع سمرقند، ص: ۱۱۷

تیرے ملک والوں کا امام یعنی ابو حنیفہ ہے۔

مجھے اس خواب سے اپنے آپ اور اپنے وطن والوں سے بڑی اُمیدیں قائم ہو گئیں اور مجھے اس خواب سے یہ راز بھی منکشف ہوا کہ حضرت امامِ اعظم رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے ذاتی اوصاف سے فانی ہو چکے ہیں اور صرف احکام شرع کے لیے باقی و قائم ہیں، اس لیے کہ ان کے حامل اور رہبر خود جناب پیغمبر خدا ﷺ ہیں اور انہیں خود چلتے دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ وہ باقی الصفت ہیں اور جو باقی الصفت ہوتا ہے وہ اجتہادی امور میں مخطی ہوتا ہے یا مصیب۔ چونکہ اُنہیں اُٹھا کر لے جانے والے حضور پُرنور ﷺ ہیں۔ اس لیے وہ اپنی ذاتی صفات سے فانی اور رسول اللہ ﷺ کی صفات سے باقی ہیں۔ جب پیغمبر سے کسی خطا کا صدور ممکن نہیں تو جو آنحضرت ﷺ میں اپنے آپ کو فنا کر چکا ہے، اس سے بھی خطا کا صدور ممکن نہیں۔ یہ ایک لطیف رمز ہے۔"[1]

نکاح:

عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

"قید ازدواج سے، معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ آزادی رہی، البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں کہ جیسے غائبانہ کسی سے تعلقاتِ محبت قائم ہو گئے ہوں اور ایک سال تک اس زخم لطیف کے بسمل بنے رہے، پھر آخر اس سے نجات مل گئی۔ بیان اتنا مجمل ہے کہ تفصیلات کا کچھ پتہ نہیں چلتا"، لکھا ہے:[2]

---

[1] کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص: ۱۲۱

[2] تصوف اسلام: طبع سوم، ص: ۴۷

''منکه علی بن عثمان الجلابی ام ازپس آنکه مراحق تعالیٰ یازده سال از آفت تزویج نگاه داشته بود، هم بتقدیروی بفتنه اندر افتادم وظاهر وباطنم اسیر صفتی شد که بامن کردند بی آنکه رویت بوده ویک سال مستغرق بودم، چنانکه نزدیک بود که دین برمن تباه شود تاحق تعالیٰ مرابکمالِ لطف وتمام فضلِ خود عصمت رابااستقبالِ دل بیچارۂ من فرستاد وبرحمت خلاصی ارزانی داشت والحمدﷲ علی جزیل نعمائه''[1]

پروفیسر نکلسن نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''ازدواجی زندگی کے متعلق ان کا تجربہ بہت مختصر اور ناخوشگوار تھا۔''[2]

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

''شادی کے متعلق ان کو جو معاملہ پیش آیا، وہ خوش آئند ثابت نہ ہوا۔''[3]

اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

میور (۲۸۹) یہ خیال کرتا ہے کہ: ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت بغیر شادی کے رہے۔''

---

[1] کشف المحجوب: طبع سمرقند، ص:۴۲۷

[2] دیباچہ کشف المحجوب (انگریزی ترجمہ نکلسن) ص:۱۰

[3] مقدمہ کشف المحجوب: نسخہ مولوی محمد شفیع، ۱۲۶۸ھ، ص:۳۰

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن رقمطراز ہیں:

"تعلقاتِ زناشوئی سے پاک رہے۔"[۱]

مگر اسی مجمل عبارت سے جناب محمد دین فوق مرحوم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حضرت نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں، لکھتے ہیں:

"حضرت نے اپنی پہلی شادی کا ذکر کہیں نہیں کیا کہ کب ہوئی، کہاں ہوئی؟ جہاں اُنہوں نے دوسری شادی کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ: "گیارہ سال سے خدا تعالیٰ نے نکاح کی آفت سے بچایا ہوا تھا، آخر مقدر نے اس میں پھنسا دیا اور میں عیال کی محبت میں دل و جان سے بن دیکھے ہی گرفتار ہو گیا"...... یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ بچپن میں ہی مناکحت کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے تھے اور پہلی بیوی کے انتقال کے بعد گیارہ سال تک دوسرا نکاح نہیں کیا تھا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی پہلی شادی بھی والدین کی موجودگی میں ہی ہوئی تھی اور دوسری شادی بھی ان کی موجودگی بلکہ یقیناً ان ہی کے اصرار سے ہوئی ہوگی۔"

پھر ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

"چنانچہ (داتا صاحب) لکھتے ہیں ایک سال تک اس آفت میں غرق رہا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی اور بخشش اور رحمت سے مجھے خلاصی عطا کی۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ایک سال کے بعد آپ کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا اور پھر آپ نے تادم وصال نکاح کا نام نہیں کیا......"[۲]

۱۔ بزم صوفیہ: از سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن، ص: ۷

۲۔ داتا گنج بخش: مطبوعہ، ۱۹۲۰ء، ص: ۱۳۔۱۴

فوق صاحب نے اس عبارت کا ٹھیک ترجمہ نقل نہیں کیا اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ بھی درست نہیں۔ لہٰذا زیر بحث اقتباس کا ترجمہ یہاں پیش کرنا ضروری ہے۔

حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

''اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے گیارہ سال تک نکاح کی آفت سے محفوظ رکھا ہوا تھا...... مگر بہ تقدیر الٰہی میں پھر اس فتنہ میں گرفتار ہو گیا اور میرا ظاہر و باطن اس (کسی عورت) کی صفات کا جو مجھ سے دوسروں نے بیان کی تھیں، اسیر ہو گیا اور اسے دیکھے بغیر ہی ایک سال تک اس کے خیال میں مستغرق رہا۔ چنانچہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال لطف اور فضلِ تمام سے عصمت (گناہ سے بچنے کی قوت) کو میرے بیچارہ دل کے استقبال کے لیے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے اس فتنہ سے نجات دلائی۔''[ا]

(ا) حضرتؒ نے نکاح کیا تھا مگر اہلیہ جو اُن کی مزاج شناس نہ تھیں، وفات پا گئیں۔ پھر گیارہ سال تک تزویج کے تصور خیال سے بھی نا آشنا رہے۔

(ب) گیارہ سال بعد ایک عورت جسے انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا، محض دوسروں سے اس کی خوبیاں معلوم ہونے پر اس کی محبت میں اسیر ہو گئے اور ایک سال تک اس عشق مجازی میں مبتلا رہے۔

(ج) صوفیاء کے نزدیک عشق مجازی میں گرفتار ہونا، ابتلاء میں مبتلا رہنا ہے۔ یہ حضرات مجاز میں گرفتاری کو مصیبت و آفت سمجھتے ہیں، اس لیے کہ یہ منزل نہیں ہے۔ المجاز قنطرة الحقيقة. تو قدرت الٰہی نے انہیں مجاز سے

ا کشف المحجوب: طبع سمرقند، ص: ۳۶۶

نکال کر حقیقت کی راہ پر ڈال دیا اور جو لوگ صورتِ ظاہری اور مظاہرِ محسوسہ کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں، وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ شیخ عطار فرماتے ہیں:

ہر کہ شد در عشق صورت مبتلا

ہم ازاں صورت افتد در صد بلا

حاصل کلام یہ کہ حضرت نے ایک شادی کی تھی، اہلیہ کی وفات کے گیارہ سال بعد ایک ایسی عورت کی خوبیوں پر فریفتہ ہو گئے جسے اُنہوں نے دیکھا نہیں تھا اور ایک سال تک اس کے عشق میں مبتلا رہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل سے اس عورت کا خیال محو فرما دیا۔ لہٰذا دوسری شادی کا افسانہ محض اختراعِ طبع ہے۔

تصانیف:

حضرت داتا صاحب قدس سرّہٗ کی آخری تصنیف **کشف المحجوب** کے مطالعہ سے ان کی نو (۹) اور تصانیف کے نام معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں سے ایک بھی دستیاب نہیں۔ بعض کے سرقہ اور دوسروں کا اپنی طرف منسوب کر لینے کے واقعہ حضرت نے خود لکھا ہے۔ بہر حال! ان نو تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱۔ دیوان: اس دیوان کو کسی نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔ (**کشف المحجوب**: ص:۲) مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ مجموعۂ اشعار فارسی میں تھا یا عربی میں اور اپنا تخلص بھی ظاہر نہیں فرمایا۔ اس کے باوجود کشفِ اسرار کے واضع نے ان کا ''علی'' تخلص گھڑ کر ایک غیر معیاری غزل اور چند اشعار بھی شامل کر دیئے ہیں۔

۲۔ کتاب فنا و بقا: مسئلہ فنا و بقا میں۔ (**کشف المحجوب**: ص:۶۷)

۳۔اسرار الخرق والمؤنات: ظاہری اور باطنی مرقعہ کے آداب میں۔(کشف المحجوب :ص:۶۲)اس کتاب کا نام فارسی کے تمام ایڈیشنوں میں یہی لکھا ہے مگر ژوکوفسکی ایڈیشن میں ''اسرار الخرق والملونات'' درج ہے۔

۴۔الرعایۃ بحقوق اللہ تعالیٰ: مسائل توحید پر۔(کشف المحجوب:ص۳۶۰)

اس نام کی ایک تصنیف شیخ احمد بن خضرویہ متوفی ۲۴۰ھ کی بھی ہے جو کشف المحجوب کے مآخذوں میں شامل ہے اور اسی نام کی ایک کتاب ابوعبداللہ الحارث بن اسد المحاسبی (م ۲۴۳ھ) کی تصنیف بھی ہے جو لندن سے چھپ چکی ہے۔

۵۔کتاب البیان لاہل العیان: در معنی جمع وتفرقہ۔(کشف المحجوب:ص۳۳۳)

۶۔نحو القلوب: مسئلہ جمع پر مفصل کتاب ہے۔(کشف المحجوب:ص۳۳۳)

۷۔منہاج الدین: طریقت، تصوف اور مناقب اصحابِ صفہ پر مشتمل ہے اور حسین بن منصور حلاج کا حال بھی بیان کیا ہے۔(کشف المحجوب:ص:۲،۹۶،۱۹۲) دیوان کی طرح اسے بھی کسی نے اپنی طرف منسوب کرلیا۔

۸۔ایمان: ایمان اور اثباتِ اعتقادِ مشائخ میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام نہیں بتایا۔(کشف المحجوب:ص۳۳۳)

۹۔شرح کلامِ منصور: حسین بن منصور حلاج کے کلام کی شرح۔

(کشف المحجوب:ص۱۹۲)

ژوکوفسکی کا سہو:

فاضل موصوف نے حضرت شیخ کی تصانیف میں ایک نام ''فرقِ فِرَق'' دیا ہے[1]۔

---

[1] مقدمہ کشف المحجوب از ژوکوفسکی: طبع طہران، ص:۵۰

حالانکہ یہ اُن کی کسی مستند تصنیف کا نام نہیں بلکہ یہ کشف المحجوب کے ایک باب کا نام ہے۔ تفصیل اس کی اس طرح ہے کہ حضرت داتا صاحب نے بعداد شریف کے نواح میں ملاحدہ کا ایک ایسا گروہ دیکھا جو حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کا مدعی تھا اور ان کے کلام سے اپنی زندیقیت کو سہارا دیتا تھا اور حلاج کے معاملہ میں مبالغہ کرتا تھا، جس طرح کہ روافض حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی محبت میں غلو کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اندر ردّ کلماتِ ایشان بابی بیاورم اندر فَرْقِ فِرَق انشاء اللہ عزوجل."[۱]

"بابی بیاورم" سے ژوکوفسکی کا ذہن ایک مستقل تصنیف کی طرف منتقل ہو گیا، حالانکہ اس کی مصححہ و محشی کشف المحجوب کا تیرھواں اور مطبوعہ سمرقند کا یہ چودھواں باب ہے۔

"باب فِیْ فَرْقِ فِرَقِھِمْ ومَذَاھِبِھِمْ و آیَاتِھِمْ وَمَقَامَاتِھِمْ وَحِکَایَاتِھِمْ"[۲]

کشف الاسرار: آٹھ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ حضرت داتا صاحب کی طرف منسوب ہے جو غالباً پہلی بار مطبع محمدی لاہور میں طبع ہوا۔[۳] پھر اس کے متعدد اُردو ترجے

---

۱ کشف المحجوب: طبع تہران، ص: ۱۹۲

۲ ایضاً: ص ۲۱۸

۳ اس رسالہ پر سن اشاعت تحریر نہیں مگر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کا بیان ہے کہ چھ ورق کا ایک رسالہ "فقر نامہ" مشہور بہ "کشف الاسرار" کے نام سے کشف المحجوب ہی پر مبنی کر کے شاید ۱۸۷۰ء میں لاہور ہی سے شائع ہوا۔ (مقالات دینی و علمی: حصہ اول، صب ۲۲۸)

ہوئے۔ طرفہ یہ کہ اکثر محققین نے اسے حضرت داتا صاحب کی تصنیف سمجھ لیا اور اس سے استفادہ کرتے رہے۔ حالانکہ یہ رسالہ بزبان حال اپنے وضعی ہونے کی خود شہادت دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں سیر حاصل مقالہ پھر کبھی لکھا جائے گا۔ سر دست اس کی صرف نقاب کشائی کرنا مقصود ہے:

(ا) کشف الاسرار کے جعلی ہونے کا بین ثبوت یہ ہے کہ یہ سبک ہندی میں ہے اور **کشف المحجوب** کے نثر دورِ اوّل یعنی دورِ سامانیاں کی ہے اور ان دونوں کی زبان میں فرق کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

(ب) اس کا مؤلف اپنے پراگندہ خیالات کو ایک مشہور معروف بزرگ کے نام سے مشتہر دیکھنے کا خواہاں تھا یا اپنے کسی بڑے (جیسا کہ حسام الدین کا نام لیا ہے) کو داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے کا بزرگ ثابت کر کے اپنی دکان چمکانا چاہتا تھا۔[1] علمی اعتبار سے بھی بے مایہ ہے۔

(ج) یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ''پنج ھزاری'' اور ''ہفت ھزاری'' خطابات مغلیہ دور

---

[1] حضرت داتا صاحب کے مزار کی مرجعیت کے پیش نظر کئی اور مزاروں کے مجاوروں نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ داتا صاحب سے پہلے کے بزرگ ہیں، داتا صاحب یہاں حاضری دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ سید احمد توختہ ترمذی کی صاحبزادیوں کے مزارات (قبور بیبیان پاک دامن) کے مجاوروں نے دورِ آخر کے مؤلفوں سے یہ لکھوا دیا کہ یہ سیدزادیاں کربلا کے حادثۂ فاجعہ کے بعد لاہور آ گئی تھیں۔ اس طرح حضرت پیر مکی کے مجاوروں نے عوام میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ داتا صاحب کا فرمان ہے کہ میرے پاس آنے سے پہلے اُن کے مزار پر حاضری دیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض لوگ تو حضرت پیر مکی کو حضرت داتا صاحب کا استاد کہنے سے بھی نہیں چوکتے وغیرہ وغیرہ۔

میں ایجاد ہوئے۔ یعنی حضرت داتا صاحب کے کئی سو سال کے بعد...... مگر کشف الاسرار کا واضع لکھتا ہے کہ:

''بفهم اگر هفت هزاری گردی چه شد مشت گرد هستی'' [1]

''ہفت ہزاری'' کی تو بات ہی کچھ ایسی ہے کہ آج کوئی صاحب اپنے ابا جان کا تذکرہ لکھنے بیٹھیں تو یہ بیان فرمائیں کہ وائسرائے ہند نے اُنہیں اعلیٰ خدمات کے صلے میں ''ستارۂ خدمت'' کا خطاب عطا کیا تھا۔

(د) لکھا ہے: **پسری تولد شدامام بخش نام نهادند......** [2] ظاہر ہے کہ داتا صاحب کے زمانہ میں ایسے نام رائج نہ تھے۔

(ہ) رسالہ کے آخر میں تحریر ہے:

''از گفته من رنجی نه کنی وغصه نه کنی که من راست گفته ام''

ع **''بر رسولاں بلاغ باشد و بس''** [3]

شیخ سعدیؒ کا مصرع داتا صاحب کا نقل کرنا کرامت ہی سمجھا جا سکتا ہے [4]

(و) لکھا ہے:

''اے علی! ترا خلق می گوید گنج بخش دانه پیش خود نه داری در دل خود جامده که پندار است گنج بخش ورنج بخش حق است'' [4]

''کشف الاسرار'' پر اعتماد کرنے والے مؤلفین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ

---

[1] کشف الاسرار، طبع لاہور، ص:۴ [2] ایضاً، ص:۷

[3] ایضاً، ص:۸ [4] ایضاً، ص:۵

حضرت شیخ علی ہجویری اپنی زندگی ہی میں اس لقب سے ملقب ہو گئے تھے۔ مگر یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے، حضرت شیخ اس صحیح اور جائز لقب سے تقریباً پانچ سو سال بعد ملقب ہوئے۔ مفتی غلام سرور نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہٗ نے انہیں ''گنج بخش'' کہا، قدیم تذکروں اور ملفوظاتِ خواجگانِ چشت سے ہرگز اس کی تائید نہیں ہوتی:

(ز) اس وضاع (مؤلف کشف الاسرار) کی دین سے خبرداری ملاحظہ ہو:

''در تفسیر آمده است واز حسام الدین لاهوری
شنیدم اگر مردی بر گور مادروپدر سجور کند
کافر نمی شود''[1]

اب ''کشف الاسرار'' اور ''کشف المحجوب'' کے بیانات میں تضاد ملاحظہ ہو:

کشف الاسرار	کشف المحجوب
از قبلہ خودشنیده بودم زاد من هجویر است[2]	علی بن عثمان بن علی الجلابی ثم الهجویری

یعنی ہجویران کا دوسرا مسکن تھا:

''معشوق بگزیں و جان خود را فدای او کن وبگو که اگر جان درراہِ اوفداشود به است''[3]	''من که علی بن عثمان الجلابی ام ازبس آنکه مرا حق تعالیٰ یازده سال از آفت ترویج نگاه

---

[1] کشف الاسرار، ص:۳
[2] کشف الاسرار، ص:۴
[3] کشف الاسرار، ص:۲

داشته بود، هم به تقدیر وی بفتنه
اندر افتادم وظاهر و باطنم اسیر
صفتی شد که بامن کردند بی آن
که رویت بوده ویک سال
مستغرق بودم چنانکه نزدیک
بود که دین برمن تباه شود تاحق
تعالیٰ به کمالِ لطف وتمام فضل
خود عصمت راباستقبالِ دلِ
بیچاره من فرستاده وبرحمت
خلاصی ار زانی داشت
والحمدلله علی جزیل نعمائه"[۱]

حضرت داتا صاحب عشق مجازی سے نجات پر خدا تعالیٰ کا شکر بجالا رہے ہیں، اس لیے کہ اس میں دین کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا مگر صاحبِ کشف الاسرار معشوق پر فدا ہونے کی تلقین کر رہا ہے۔ اگر اس سے عشق حقیقی مراد ہو تو بھی یہ داتا صاحب کا اندازِ بیان نہیں ہے:

چون درهند و ستان آمد
نواحی لاهور راجنت مثال
یافتم[۲]

من اندر دیار هند در بلده
لهانور که از مضافات ملتان
است درمیان ناجنسان گرفتار
شده بودم.[۳]

---

۱ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص ۴۲۷
۲ کشف الاسرار، ص: ۲
۳ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص ۱۵۱

''کشف المحجوب'' کی عبارت تو یہ واضح کر رہی کہ حضرت داتا صاحب لاہور میں اپنے آپ کو ناجنسوں میں قید سمجھ رہے ہیں اور ''کشف الاسرار'' ان کے لیے اس ماحول کو جنت مثال قرار دے رہی ہے اور داتا صاحب کے زمانے میں لاہور کو ''لہانور'' یا ''لہاور'' وغیرہ کہا جاتا تھا۔ لاہور اس وقت نہیں لکھا جاتا تھا۔

''...... مرااایں حادثہ افتاد دوبار، یکی آنکہ دیوان شعرم کسی بخواست و باز گرفت واصل نسخہ جز آن نہ بود، آن جملہ بگر دانیدو نام من ازسر آن بیفگند ورنج من ضائع گردانید تاب اللہ علیہ''[1]

''بیت و اشعار بسیار گفتہ ام دیوانے گفتم بسیار مطبوع و پسندیدہ واز نظر خود گزیناں بر آمدہ'' اے طالب من! ہرروز برائے دیدن دیداریارمی روم، لیکن گاھی گاھی بنظر من آن ماہ خنداں می آید ودیوان رابدیں حالت گفتہ بودم وقتی کہ روی یار دیدمی غزل از دہانم بے تحربر آمدی دراں فکری نہ کردہ ام''[2]

''کشف الاسرار'' کے ان اقتباسات سے واضح ہے کہ یہ اندازِ بیاں اور طرزِ زندگی صاحب صحو داتا صاحب کا نہیں ہے اور انہوں نے اپنے دیوان کے سرقہ کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہے۔ نیز پوری کشف المحجوب میں اپنا کوئی شعر درج نہیں کیا۔ مگر اس وضاع نے ایک غیر معیاری غزل اور دو اشعار بھی ان کے سر منڈھ دیئے ہیں:

قارئین کرام کی تفریح طبع کے لیے ایک اور اقتباس نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں:

---

[1] کشف المحجوب، ص ۲ [2] کشف الاسرار: ص: ۷

”پیری بود شیخ بزرگ نام او شان مرا گفتند که اے علی اکتابی درین عمر تصنیف بکن که یاد گاری تو بماند گفتم ”یا ایها الشیخ ان لا یعلم من علم“ بسیار چسپید من الحال اثنا عشر که هستند، درمیان همیں عمر در بلده هجویر تصنیف کرده ام، اورا دوام اومرا گفت که تو بزرگ خواهی شد.......“[1]

اس کی خوبیاں اور لطافتیں تو عیاں ہیں مگر کشف المحجوب میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا...... تفریح طبع کا سامان اس میں یہ ہے کہ اس کا مؤلف چونکہ لاہور کا باشندہ ہے اور یہاں بے حد اصرار کرنے والے کو کہتے ہیں کہ ”چمڑا ای گیا اے“ یعنی چمٹ ہی گیا ہے۔ لہٰذا اس نے شیخ بزرگ کے بہت زیادہ اصرار کو ”بسیار چسپید“ کے ذریعے واضح کیا ہے۔

کشف المحجوب:

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف منیف ”کشف المحجوب“ جو انہوں نے آغوش رحمت خداوندی میں بیٹھ کر لکھی ہے، مسائلِ شریعت وطریقت اور حقیقت ومعرفت کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے اور اولیاء متقدمین کے حالات بابرکات اور ان کی مقدس تعلیمات کا بہترین خزینہ ہے۔ نیز فارسی زبان میں تصوف واحسان پر لکھی جانے والی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔[2] اور اسے ہر دَور کے اولیاء اللہ اور

---

[1] کشف الاسرار، ص:۴

[2] اگرچہ کتاب ”التعرف المذهب اهل التصوف“ (عربی) تالیف امام ابوبکر بخاری کلاباذی قدس سرہٗ (م ۳۸۵ھ یا ۳۹۰ھ) کی نفیس فارسی شرح بنام ”شرح تعرف“ تالیف امام ابراہیم بن اسمٰعیل مستملی بخاری قدس سرہٗ (م ۴۳۴ھ) جو ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں پہلی بار لکھنؤ سے طبع ہوئی، کشف المحجوب سے پہلے لکھی گئی تھی مگر یہ مستقل تصنیف نہیں، بلکہ عربی متن (تعرف) کی فارسی شرح ہے۔

صوفیاء کرام رحمہم اللہ علیہم نے تصوف کی بے مثل کتاب قرار دیا ہے۔ کشف المحجوب کاملین کے لیے رہنما ہے تو عوام کے لیے پیر کامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ عوام میں سے اس کا مطالعہ کرنے والوں کو دولت عرفان وایقان حاصل ہوتی ہے اور شکوک و شبہات کی وادی میں بھٹکنے والے یقین کی دنیا میں آباد ہو جاتے ہیں اور اس کے بار بار کے مطالعہ سے حجابات اُٹھ کر نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ اس نادر و بے مثل کتاب کو جو پذیرائی و مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس موضوع کی کسی اور فارسی میں لکھی جانے والی کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ اکابر اولیاء اللہ نے خود اس سے استفادہ کیا اور طالبانِ حق کو اس سے مستفید ہونے کی تلقین فرمائی۔ اس لیے کہ اس میں ناقصوں اور کاملوں کے لیے سامانِ ہدایت موجود ہے اور اس کے برعکس بعض کتب تصوف، فصوص الحکم وغیرہ میں صرف خواص بلکہ اخص الخواص کے لیے رہنمائی ہے اور ناقصین کے لیے حیرانی و سرگردانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وجہ تسمیہ و کیفیت کشف المحجوب:

کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تصنیف ہے جو اُنہوں نے جناب ابوسعید ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی درخواست پر لکھی اور ان کے سوالات کی اساس پر یہ نورانی صحیفہ تیار ہوا۔ اس مبارک کتاب کی وجہ تسمیہ اور غایت تصنیف حضرت شیخ کے قلم اعجاز رقم نے یہ لکھی ہے:

"یہ مَیں نے کہا ہے کہ اس کتاب کو **کشف المحجوب** (پنہاں کو عیاں کرنے والی) کے نام سے موسوم کیا ہے، اس سے

میرا مقصد یہ ہے کہ کتاب کا نام ہی اس کے موضوع اور مطالب کو عیاں کر دے اور اہل بصیرت اس کا نام سنتے ہی جان لیں کہ اس میں کیا ہے اور واضح رہے کہ اولیاء اللہ اور عزیزانِ بارگاہِ خداوندی کے سوا تمام عالم (وعالمیاں) رموز واسرارِ خداوندی کے حقائق کو سمجھنے سے محجوب ومستور ہیں۔ چونکہ یہ کتاب سیدھی راہ بتانے اور عارفانہ کلمات کی تشریح وتوضیح اور بشریت کے حجاب رفع کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے، لہٰذا اسے کسی اور نام سے منسوب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حجاب کا اُٹھنا محجوب (پوشیدہ) کی موت ہوتا ہے اس طرح حجاب کا آنا مکاشف (ظاہر شدہ) کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔......"[1]

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری حصے میں تحریر فرمائی اور اس کا تین چوتھائی حصہ یقیناً لاہور میں لکھا۔ وہ ایک مقام پر رقم فرماتے ہیں:

"اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہیں، اس لیے کہ میری کتابیں غزنی (حرسہا اللہ) میں رہ گئی ہیں اور مَیں ہند کے شہر لاہور میں جو مضافاتِ ملتان میں سے ہے، ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔"[2]

حضرت نے اپنی کتابوں کے غزنی رہ جانے کا جو ذکر کیا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ آپ کے پاس کتابیں بالکل نہیں تھیں بلکہ وہ شاکی اس بات کے ہیں کہ

---

[1] کشف المحجوب، طبع تہران، ص:۴

[2] کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص:۱۱۵

ایک متبحر عالم اور فاضل مصنف کو جس بہتات سے کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ یہاں پوری نہیں ہوسکتی تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"امام قشیری کی طرح شیخ ہجویری نے تصوف کو اسلامی شریعت سے قریب لانے[1] اور غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ کے خیالات میں بڑی صفائی اور اندازِ بیاں میں بڑی گہرائی ہے۔ تصوف کی کتابیں ابھی تک عربی میں تھیں، اس لیے عوام کو استفادہ کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی۔ حقیقی تصوف کو عوام تک پہچانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔"[2]

پھر لکھتے ہیں:

"شیخ ہجویری کی اس کتاب نے ایک طرف تصوف سے متعلق عوام کی غلط فہمیوں کو دُور کیا، دوسری طرف اس کی ترقی کی راہیں کھول دیں"۔[3]

"شیخ ابوسعید ابوالخیر نے اپنی رباعیات، شیخ عبداللہ ہروی نے اپنی مناجات اور شیخ ہجویری نے اپنی **کشف المحجوب** کے ذریعے تصوف کے خیالات کو عوام تک پہنچا کر تصوف کے عوامی تحریک بننے اور سلاسل کے منظم ہونے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔"[3]

---

[1] نظامی صاحب نے یہ فیشن کے طور پر لکھ دیا ہے، وگرنہ وہ جانتے ہیں کہ تصوف اور شریعت جدا جدا نہیں ہیں۔

[2] تاریخ مشائخ چشت، طبع دہلی، بار اول ۱۹۵۳ء، ص:۹۸

[3] ایضاً، ص:۹۹ — [3] ایضاً، ص:۱۰۲

کشف المحجوب

صوفیاء کرام اور مؤرخین کی نظر میں

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی دہلوی قدس سرہٗ (م ۷۲۵ھ) کی نہایت اہم رائے ان کے ملفوظات ''دُررِ نظامی'' (خطی)[1] مرتبہ شیخ علی محمود جاندار میں درج ہے:

''ومی فرمودند کشف المحجوب از تصنیف علی ھجویری است قدس اللہ روحہ العزیز: اگر کسے راپیری نہ باشد چوں ایں رامطالعہ کند اوراپیدا شود...... من ایں کتاب رابہ تمام مطالعہ کردہ ام''[2]

چنانچہ حلقہ بگوشان حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ جن کتب تصوف کے مطالعہ کے شائق تھے، ان میں کشف المحجوب شامل تھی۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:

''واشراف واکابر کہ بخدمتِ شیخ پیوستہ بودندر مطالعہ کتب سلوک و صحائفِ احکام طریقت مشاہدہ می شدو کتاب قوت القلوب واحیاء العلوم وترجمۂ احیاء العلوم وعوارف و کشف المحجوب وشرح تعرف ورسالۂ قشیری ومرصادالعباد و مکتوبات عین القضاۃ ولوائح خریدارانِ بسیار پیدا آمدند ومرد مان پیشتر از

---

[1] دُررِ نظامی کا ترجمہ دہلی سے چھپ چکا ہے مگر اس وقت پیش نظر نہیں۔

[2] بحوالہ تصوف اسلام از عبد الماجد دریا آبادی، طبع اعظم گڑھ، بار سوئم: ص ۵۲

کتابیان از کتب سلوک وحقائق باز پرس کردند"
ولوامع قاضی حمید الدین ناگوری وفوائد الفواد
امیر حسن رابواسطه ملفوظاتِ شیخ "[1]

سلطان التارکین حمیدالدین حاکم (م ۷۳۷ھ) خلیفۂ حضرت شیخ رُکن الدین سہروردی ملتانی نے اپنے مرشدارشد (حضرت رکن الدین) کی شان میں متعدد مدحیہ نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں اپنے مرشد کے کمالات کوتیس معتبر کتب کے اسماء سے بیان کیا ہے۔ "کشاف" اور "کشف المحجوب" کی بندش ملاحظہ ہو:

گشت کشاف کشف هم محجوب......
فهم تول فهیم ذوالا قدار[2]

شہزادہ محمود داراشکوہ (م ۱۰۶۹ھ) نے لکھا ہے:

"حضرت پیر علی هجویری راتصانیف بسیار
است اما کشف المحجوب مشهور و معروف است
وهیچ کس رابرآں سخن نیست و مرشدی است
کامل درکتب تصوف بخوبی ، آن درزبانِ فارسی
کتابی تصنیف نه شده "[3]

شیخ محمد اکرم براسوی صابری علیہ الرحمۃ (م ۱۱۵۹ھ) اپنی مشہور تصنیف "اقتباس الانوار" جو۱۱۳۲ھ میں لکھی گئی، میں رقم طراز ہیں:

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، برنی، سرسید ایڈیشن، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص:۳۴۶

[2] گلزار (دیوانِ حاکم) مرتبہ نامی، طبع لاہور، ۱۹۴۶ء، ص:۱۴۰

[3] سفینۃ الاولیاء: طبع کانپور، ص:۱۶۴

”صوفیاء کے طبقۂ اوّل میں علوم واسرارِ مشائخ، طالبوں کو رموز واشارات میں تعلیم کیے جاتے تھے اوران پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور چند تصانیف بھی ان کی تھیں، جنہیں عوام پر ظاہر نہیں کرتے تھے مگر طبقہ ثانی میں جب سید الطائفہ جنید بغدادی، خواجہ ابوالحسن نوری، خواجہ ابوسعید خراز اور خواجہ ابوبکر شبلی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا دور دورہ ہوا تو اُنہوں نے رموز واشارات یعنی اخفا کے طریقہ کو ترک کر کے طالبوں کو ان علوم کا علانیہ درس دینا شروع کر دیا۔ اس وقت سے ہر سلسلہ کے مشائخ نے تصوف پر کتابیں لکھنا شروع کر دیں جن کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی، لہٰذا اس موقع پر صرف ان چند معتبر کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا مطالعہ جمیع مشائخ کا معمول ہے۔ پہلی کتاب جو خانوادۂ جنیدیہ میں لکھی گئی ”طبقاتِ صوفیہ“ تصنیف ابوعبدالرحمٰن سلمی ہے اور اس کے بعد شیخ علی بن عثمان ہجویری غزنوی جنیدی نے ”کشف المحجوب“ لکھی[1] (ترجمہ بتغیرِ یسیر)

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:

”شیخ علی ھجویری راتصانیف بسیاراست امّا کشف المحجوب از مشهور و معروف ترین کتب وی است وهیچ کس رابروی جائے سخن نے، بلکه پیش ازیں در کتب تصوف هیچ کتابی به زبان فارسی تصنیف نه شده بود“[2]

---

[1] اقتباس الانوار (فارسی) مطبوعہ مطبع اسلامیہ، لاہور ۱۸۹۵ء، ص: ۲۹

[2] خزینۃ الاصفیاء: طبع لکھنو، جلد دوم، ص: ۲۳۲

محمد بن عبدالوہاب قزوینی (ایران) مقدمہ تذکرۃ الاولیاء میں رقم طراز ہیں:

"ولے درزبان فارسی آنچه در نظر است دو کتاب است که قبل از تذکرة الاولیاء تالیف شده، یکی کشف المحجوب لارباب القلوب[1] لابی الحسن علی بن عثمان الجلابی الهجویری الغزنوی المتوفی سنة ۴۶۵......دیگر ترجمه طبقات الصوفیه...... للسلمی که آں راشیخ الاسلام ابو اسمٰعیل عبدالله بن محمد الانصاری الخزرجی المتوفی ۴۸۱ھ درمجالس وعظ وتذکیر املا نموده"[2]

کشف المحجوب

بحیثیت مآخذ کتبِ تصوف

کشف المحجوب کو صوفیاء کرام کے مشہور و مستند تذکروں اور تصوف کی معتبر کتابوں کا مآخذ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۲۷ھ) نے اپنی معروف ترین کتاب تذکرۃ الاولیاء میں کشف المحجوب سے صوفیاء متقدمین کے حالات اوران کے اقوال معمولی تبدیلی الفاظ کے ساتھ نقل کیے ہیں۔

ملک الشعراء بہار نے لکھا ہے:

---

[1] کشف المحجوب کے نام کے ساتھ "لارباب القلوب" کا اضافہ غلط ہے۔ اس غلطی کا سبب آئندہ بیان ہوگا۔

[2] مقدمہ تذکرۃ الاولیاء: طبع تہران سو بار سوم، ص:۸

"عطار ظاهراً از کتاب کشف المحجوب استفاده کردہ است وغالباً عباراتِ آں بدون ذکرِ خود کتاب یا مؤلف باندک تصرّفی که تبدیل کهنه به نو باشد نقل نموده ست"[1]

ملک الشعرا بہار نے سبک شناسی (ص:۲۰۶۔۲۰۹) میں اس کی واضح مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

روسی مستشرق ژوکوفسکی کی تحقیق یہ ہے:

"شیخ عطار در تذکرۃ الاولیاء، خود مکرر از کشف المحجوب هجویری جلابی غزنوی استفاده کرده ودر موارد...... حدد بدونِ ذکر مأخذ، ازواقتباساتے کرده است ودر اغلب ایں موارد فقط بذکر عبارت (نقلست) اکتفادرزید"[2]

حضرت شیخ عطار رحمۃ اللہ علیہ نے "تذکرۃ الاولیاء" میں صرف دو مقام پر حضرت داتا گنج بخش قدس سرہٗ کا اسم گرامی تحریر کر کے ان کے اقوال نقل کیے ہیں۔

اوّل: سیدنا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ (م ۱۵۰ھ) کے حالات میں[3] دوم: حضرت ابنِ عطار رحمہ اللہ تعالیٰ (م ۳۰۹ھ) کے ذکر میں۔[4]

---

[1] سبک شناسی یا تاریخ تطور نثر فارسی از شادروان محمد تقی بہار "ملک الشعراء" جلد دوم، طبع تہران، بار دوم، ص: ۳۶۰

[2] ترجمہ مقدمہ روسی بہ فارسی کشف المحجوب، مصحح ژوکوفسکی، طبع تہران، ص: ۶۰

[3] تذکرۃ الاولیاء: طبع لاہور، ص ۱۳۴۔ طبع تہران حصہ اوّل، ص: ۱۹۰

[4] ایضاً، ص: ۳۵۰۔ طبع تہران، حصہ دوم، ص: ۵۸

حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا استفادہ:

''نفحات الانس'' میں مولانا جامی نے **کشف المحجوب** سے، چند بزرگوں کے حالات لیے ہیں۔ مثلاً حضرت شیخ قدس سرہٗ کے حالات **کشف المحجوب** ہی سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح دیگر مقامات پر بھی اخذ و استفادہ کیا ہے......اس موقع پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ زمانہ قدیم میں اخذ و استفادہ کا یہی طریقہ تھا، لہٰذا اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہٗ (۷۸۲ھ) اپنے مکاتیب شریفہ میں **کشف المحجوب** کی عبارات بطور سند نقل کرتے ہوئے حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا یوں اعتراف کرتے ہیں:

> **''صاحب کشف المحجوب که مقتدائے عصر خود بوده است''**[۱]

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ (م بعد از ۸۲۵ھ) کے مجموعۂ ملفوظات ''لطائف اشرفی'' مرتبہ حضرت نظام غریب یمنی میں متعدد مقامات پر **کشف المحجوب** کے حوالے ملتے ہیں: مثلاً

۱۔ **''می فرمودند که صاحب کشف المحجوب را......''**[۲]

۲۔ **''صاحب کشف المحجوب گوید......''**[۳]

---

[۱] سہ صدی مکتوبات از شیخ یحییٰ منیری: طبع لاہور، ۱۳۱۹ھ۔ حصہ اول، ص: ۲۶۷

[۲] لطائف اشرفی: طبع دہلی ۱۲۹۸ھ جلد اوّل: ص ۱۵، ۱۶۲

[۳] ایضاً، جلد دوم، ص: ۱۹، ۵۸

حضرت خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ (م۸۲۲ھ) کا استفادہ

حضرت خواجہ پارسا نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''فصل الخطاب'' کی متعدد فصول اور مختلف مقامات پر کشف المحجوب کی عبارتیں کی ہیں اور نہایت تعظیم وتکریم سے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا ہے، ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''شیخ عالم، عارف، زاهد، مجاهد، شیخ الشیوخ، قدوة اهل الطریقة، کاشفِ اسرار الحقیقت ابوالحسن علی بن عثمان بن ابی علی الغزنوی رحمه الله که از اَقرانِ سلطان طریقه وبرهان حقیقت شیخ ابوسعید بن ابوالخیر فضل الله بن محمد بن احمد المیهنی است قدس الله تعالیٰ روحهٗ واقتدائے هر دو بزرگوار درطریقت بزین اوتادو شیخ عباد ابوالفضل محمد بن الحسن السرخسی است قدس الله روحه درکتاب کشف المحجوب لا رباب القلوب آورده است......''[1]

التباس حضرت پارسا رحمہ اللہ تعالیٰ:

حضرت خواجہ پارسا رحمہ اللہ نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت شیخ علی ہجویری اور حضرت ابوسعید بن ابی الخیر (رحمہما اللہ) حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن سرخسی رحمہ اللہ کے مرید تھے، صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگوں کے پیران طریقت کا

---

[1] فصل الخطاب (خطی)، ص:۶۰ (لائبریری حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ لاہور) یہ کتاب تاشقند سے طبع ہو چکی ہے مگر یہاں کمیاب ہے۔

ایک ہی نام تھا مگر مسکن علیحدہ علیحدہ...... محض ہم نامی کی وجہ سے انہیں یہ اشتباہ ہو گیا۔

حضرت ابو سعیدؒ کے حالات کے سلسلے میں **کشف المحجوب** میں بتایا گیا ہے کہ ان کے مرشد سرخس میں رہتے تھے:

"دوران وقت والیٔ سرخس شیخ ابوالفضل حسن بود"[1]

مولانا جامی قدس سرہٗ نے شیخ ابوالفضل بن حسن السرخسی قدس سرہٗ کے حالات کے شروع میں لکھا ہے:

شیخ ابوالفضل بن حسن السرخسی قدس سرہٗ نام وی محمد بن الحسن است، وی مرید ابونصر سراج است و پیر شیخ ابوسعید ابوالخیر[2]

پھر شیخ ابوسعید کے حالات میں رقم فرمایا ہے:

"پیروی در طریقت شیخ ابوالفضل بن حسن سرخسی است"[3]

ہم نامی کی وجہ سے جو التباس و اشتباہ پیدا جاتا ہے اس کے پیش نظر حضرت داتا صاحب کے مرشد ارشد کے حالات لکھتے وقت شروع ہی میں وضاحت کر دی ہے:

"ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی قدس سرہٗ وے غیر ابوالفضل بن حسن سرخسی است"[4]

---

[1] کشف المحجوب: طبع تہران، ص: ۲۰۶

[2] نفحات الانس: طبع لکھنؤ، ص: ۲۶۴

[3] نفحات الانس: طبع لکھنؤ، ص: ۲۷۷

[4] نفحات الانس: طبع لکھنؤ، ص: ۲۹۰

معلوم ہوتا ہے کہ فضل الخطاب، حضرت خواجہ یعقوب چرخی غزنوی صاحب رسالہ ابدالیہ کے پیش نظر تھی۔ لہٰذا اُنہوں نے فصل الخطاب کے اس بیان پر اعتماد کرتے ہوئے لکھ دیا کہ حضرت ابوسعید ابوالخیر اور حضرت علی ہجویری دونوں بھائی (پیر بھائی) تھے اور خواجہ پارسا کے تتبع میں کشف المحجوب کے نام کے ساتھ "لارباب القلوب" کے اضافے پر بحث آگے آئے گی۔ انشاءاللہ۔

حضرت ابوفتح سید محمد حسینی گیسودراز قدس اللہ سرہ العزیز (م ۸۲۵ھ)

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے اپنی بے مثل تصانیف میں کشف المحجوب کے حوالے دیئے ہیں۔ ان کے مکتوبات شریف کا مجموعہ پیش نظر ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"آں محقق مدقق آں شیخ برحق آں صوفی معنوی وصوری ابوعلی عثمان (علی بن عثمان) ھجویری قدسی نقل کردہ است"[۲]

ان مکاتیب شریفہ کا متن اغلاط سے پُر ہے۔ مصحح نے تصحیح کی امکانی کوشش کی ہے۔ مگر پھر بھی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ حضرت داتا صاحب کے اس گرامی کو جو "ابوعلی عثمان" لکھا ہے یہ بھی کتابت کی غلطی ہے۔ شیخ محمد اکرم صابری نے "اقتباس الانوار" کے ماخذوں کی فہرست اس کے صفحہ ۳۰ پر دی ہے۔ جس میں کشف المحجوب کا نام درج

۱۔ فہرست مخطوطات فارسیہ، انڈیا آفس لائبریری، نمبر ۱۷۷۹

۲۔ مکتوبات حضرت خواجہ گیسودراز مرتبہ مولانا رکن الدین ابوفتح علاء قریشی، طبع حیدرآباد دکن، ۱۳۶۲ھ، ص: ۸۰

ہے۔ژوکوفسکی لکھتا ہے:

''درتالیف و تدوین سفینۃ الاولیاء خزینۃ الاصفیاء نامہ دانشوران[1] وطریق الحقائق[2]، نیز از کشف المحجوب استفادہ ھای بسیار و اقتباسات مکرر و متعددے شدہ است''[3]

(ل) فیض عالم قدس۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ)[4] ''جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔'' (اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ)[5] ''جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا، وہ اپنے پروردگار کی طرف سے نور (روشنی) پر ہوتا ہے۔'' اور جس کا سینہ اللہ تعالیٰ شرح صدر کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے تو اسے اپنے انوار و تجلیات سے نوازتا ہے اور عالم قدس سے جو انوار اس کے قلب پر وارد ہوتے ہیں، اس کی برکات سے کشف حقائق ہوتا ہے اور رموزِ حقیقت و اسرارِ معرفت منکشف ہوتے ہیں، قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کا صحیح فہم و ادراک حاصل ہوتا ہے۔ غرض کہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف منیف

---

[1] عصر حاضر کی مشہور تصنیف جو ایران کے متعدد فضلاء کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

[2] طریق الحقائق تالیف نائب الصدر حاجی میرزا معصوم بن رحمت علی شاہ قزوینی نعمت اللہ شیرازی متوفی ۱۳۴۴ھ، جلد۲، تہران (فہرست فارسی کتب ہائی چاپی جلد اول از خان بابا مشار، طبع تہران (کالم ۱۰۹۰)

[3] ترجمہ مقدمہ روسی بہ فارسی کشف المحجوب: طبع تہران، ص ب ۶۱

[4] سورۃ الانعام: ۱۲۵ [5] سورۃ الزمر: ۲۲

کامنبع اول یہی فیضِ عالم قدس ہے۔ وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ

(ب) قرآن مجید

(ج) احادیث نبوی ﷺ

پروفیسر ژوکوفسکی نے کشف المحجوب کے دقیق مطالعہ کے بعد اس کے منابع وماخذ تلاش کیے ہیں اور اپنے مقدمہ کشف المحجوب میں ان کے نام درج کیے ہیں:

۱۔ تاریخ اہل صفہ۔ تالیف حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی متوفی ۴۱۲ھ (کشف، ص:۹۹)[۱] حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس تالیف کا نام نہیں لکھا مگر تاریخ اہل الصفوۃ کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ زیر بحث کتاب ہی ہو۔ (جلد دوم نمبر شمار:۲۱۶۸)

۲۔ کتاب سلمی۔ (کشف: ص:۱۴۱) جو بعد میں ''طبقات الصوفیہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

۳۔ کتاب قشیری۔ (کشف :ص:۱۴۱) جو''الرسالۃ القشیریہ'' کے نام سے معروف ہے۔

۴۔ کتابِ محبت۔ (کشف، ص:۳۹۹) تالیف عمر بن عثمان مکی (متوفی ۲۹۷، ۲۹۶ھ) شیخ عطار نے بھی ''تذکرۃ الاولیاء'' میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ (تذکرہ طبع لاہور، ص:۲۳۳)

۵۔ لمع (فی التصوف)۔ تالیف ابونصر سراج (یافعی نے مرآۃ الجنان[۱] میں لکھا

---

[۱] کشف المحجوب کے صفحات نمبر چاپ تہران سے دیئے گئے ہیں اور کشف سے مراد کشف المحجوب ہے۔

ہے کہ اس کا سال اتمام تصنیف ۴۷۸ھ ہے۔

۶۔ تاریخ المشائخ۔ تالیف محمد بن علی حکیم ترمذی (کشف: ص:۵۰)

۷۔ کتابِ مقدسی۔ (کشف: ص:۳۳۴) ممکن ہے کہ یہ وہی ''رسائل اخوان الصفا'' ہوں جن کے مؤلفین میں سے ایک ابوسلیمان البستی المقدسی ہے۔

۸۔ حکایاتِ عراقیاں۔ (کشف: ص:۵۶) از تصانیف شیوخ صوفیاء عراق۔

۹۔ حکایات۔ حضرت علی ہجویری قدس سرہٗ نے کشف المحجوب میں بار بار فرمایا ہے: ''اندر حکایات یافتم'' بنابریں یہ واضح ہے کہ یہ کتاب کشف المحجوب کے مآخذوں میں سے ہے۔

منابع درجہ دوم:

مشہور اور اہم کتابیں جو کشف المحجوب کی تصنیف کے وقت دوسرے درجہ پر حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر رہیں، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) تصانیف حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ: کشف المحجوب کے بیان کے مطابق ان کی تعداد پچاس اور اقطار و اکناف خوزستان، فارس اور خراسان میں منتشر ہو چکے ہیں۔ (کشف: ص:۱۹۱)

(۲) تالیف ابوجعفر محمد بن مصباح صیدلانی: (کشف: ص:۲۱۴، ۳۳۴)

(۳) رسائل ابوالعباس سیاری: حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے پیروؤں کو مرو اور نسا میں دیکھا، لہٰذا یہ رسائل بھی ان ہی شہروں میں دیکھے ہوں گے۔

(۴) رسائل حکیم ترمذی: یہ رسائل حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ کی توجہ کا مرکز رہے۔ (کشف: ص:۱۷۸، ۴۳۹) اور ان کے نام یہ ہیں: بیان آداب المریدین، ختم

الولایت، کتاب النہج نوادرالاصول (فی معرفت اخبار الرسول)

(۵) کتاب سماع: از ابوعبدالرحمٰن سلمی (کشف: ص:۵۲۳)

(۶) روایات: از ابوالفضل ختلی، مرشد ہجویری رحمہا اللہ (کشف: ص:۱۱۰)

(۷) غلط الواجدین: از تصانیف ابومحمد رویمی۔ (کشف: ص:۱۷۰)

اب ان کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مستقلاً حضرت ہجویری قدس سرّہٗ کا مرجع نہیں رہیں، بلکہ کبھی کبھی ان کی طرف رجوع کیا گیا:

(۱) تصحیح الارادہ: از تصانیف حضرت جنید بغدادی قدس سرّہٗ (کشف: ص:۴۳۹)

(۲) الرعایہ بحقوق اللہ: از تالیف احمد بن خضرویہ۔ (کشف: ص:۴۳۹)

(۳) کتاب اندر اباحتِ سماع: مؤلف نامعلوم (کشف: ص:۵۲۴)

(۴) کتاب اندر مرقعہ: از تصانیف ابومعمار اصفہانی (کشف: ص:۶۲)

(۵) کتاب رغایب: از تصانیف ابوعبداللہ الحارث بن اسد المحاسبی، در اصولِ تصوّف (کشف: ص:۱۳۴) حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۶) مرأۃ الحکماء: از تصانیف شاہ شجاع کرمانی (کشف: ص:۱۷۴)

آخر میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ مذکورۃ الصدر کتب ورسائل کے علاوہ اور تصانیف وتوالیف بھی صاحب کشف المحجوب کے زیرِنظر رہی ہیں، جن کے مصنفین ومؤلفین کے صرف اسماء گرامی تحریر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مثلاً تصانیف یحییٰ رازی (کشف: ص:۱۵۳) تالیف ابوبکر وراق (کشف: ص:۴۳۹-۱۷۹) آثار سہل بن عبداللہ (کشف: ص:۴۳۹) کتب مشائخ (کشف: ص:۳۳۴) اور ابوحمدون قصار وصوفیہ قصاری کے اقوال مکرر نقل کیے ہیں۔ (کشف، ص، ۳۲۸)[۱]

---

[۱] بہ تغیر قلیل از مقدمہ کشف المحجوب، طبع تہران، ص:۶۰-۵۸۔

رسالۂ قشیریہ اور کشف المحجوب:

حضرت امام ابوالقاسم قشیری قدس سرہٗ (م ۴۶۵ھ) حضرت شیخ علی ہجویری قدس سرہٗ کے معاصر ہیں اور حضرت مخدوم علی ہجویری نے ان سے ملاقات بھی کی ہے اور کشف المحجوب میں ان کی جلالتِ شان کے معترف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ حضرت داتا صاحب کے اُستاد بھی ہیں۔ مگر کشف المحجوب سے اس خیال کی تائید وتصدیق نہیں ہوتی۔ امام قشیری نے ''الرسالة القشیریه'' ۴۳۷ھ میں لکھنا شروع کیا اور اوائل ۴۳۸ھ میں مکمل کر لیا تھا اور رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب کی تصنیف کے وقت حضرت داتا صاحب کے پیش نظر تھا۔ یہ دونوں کتابیں جو ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں اور ہم عصر بزرگوں کی تصانیف ہیں، ان دونوں میں جو نمایاں فرق ہے، اسے سمجھنے کے لیے درج ذیل آراء مفید ثابت ہوں گی:

ڈاکٹر پیر محمد حسن مترجم ومحشی رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں:

> ''ہجویری نے اس کتاب (کشف المحجوب) میں قشیری کے رسالہ کا تتبع کیا ہے اور بعض ایسے امور سے بحث کی ہے، جن کا رسالہ میں کوئی ذکر نہیں۔''[1]

مخدومی پیر صاحب نے حضرت داتا صاحبکو امام قشیری کا تتبع لکھنے کے ساتھ یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ شیخ ہجویری نے ''بعض ایسے امور سے بحث کی ہے، جن کا رسالہ میں کوئی ذکر نہیں۔'' مگر کشف المحجوب کے مُصحح اور مقدمہ نگار ژوکوفسکی، امام قشیری کو حضرت داتا صاحب کے شیوخ صحبت میں شمار کرنے کے باوجود یہ تسلیم

---

[1] مقدمہ رسالہ قشیریہ مترجم اردو، طبع راولپنڈی ۱۹۷۰ء، ص: ۳۹

نہیں کرتا کہ ہجویری نے اپنی تصنیف میں قشیریؒ کا تتبع کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"الرسالة القشیریه فی علم التصوف للامام العالم ابی القاسم عبدالکریم ہوازن القشیری و کشف المحجوب هجویری جلابی، غزنوی، اولی بتازی ودومی بپارسی هر دواز کتب طراز اوّل تصوّف، وهر دو در حدود اواسط قرن پنجم هجری تالیف شده است، باوجود وحدت کامل موضوع، هر بحث، نه در کیفیت و کمیت مسائل مورد نظر، ونه در تعبیر و تفسیر مطالب مطروحه هیچ گونه وجه اشتراکی بین این دواثر نفیس واصیل مشاهده نمی شود، فقط گاهے گاهے دربعضی اصطلاحات فنی اندک مشابهتی بین آں دو ملاحظه من گردد (فی المثل قشیری گوید: المحوو الاثبات) (ص: ۴۶ رساله) وهجویری می نویسد: النفی والاثبات (ص: ۴۹۴ کشف) لاغیر"[1]

عبدالماجد دریابادی جو رسالہ قشیریہ اور کشف المحجوب میں سے کسی کے بھی دیباچہ نگار نہیں ہیں، ان کی رائے یہ ہے:

"اس کتاب کے تقریباً ہم عمر امام ابوالقاسم قشیری کا عربی "رسالہ القشیریہ" ہے۔ موضوع اس کا بھی تصوف ہے۔ دونوں کے طرزِ تصنیف میں فرق یہ ہے کہ امام موصوف نے زیادہ تر متقدمین

---

1. ترجمہ مقدمہ کشف المحجوب، روسی بفارسی، طبع تہران، ص: ۵۷

کے اقوال وحکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے، بہ خلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک محققانہ، مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات، واردات، مجاہدات وغیرہ بھی قلم بند کرتے جاتے ہیں اور مباحث سلوک پر ردّ وقدح کرنے میں تأمل نہیں کرتے، اس لیے ان کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعۂ روایات وحکایات کی نہیں، بلکہ ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔"[1]

سُبک کشف المحجوب:

ملک الشعراء بہار نے کشف المحجوب کی نثر کو دَورِ اوّل یعنی دورِ سامانیاں میں شامل کیا ہے، لکھتے ہیں:

"این کتاب از حیث سبک بالاتر و اصیل تر و بدورۂ اوّل نزدیک تر است، تا سائر کتب صوفیه، دومی توان آن را یکی از کتب طراز اوّل شمرد که هر چند در قرن پنجم تالیف شده وبیش از کتب قدیم را از دست خوش تازی ولغت های آن زمان است، اما باز نمونه سبک قدیم را از دست نداده وروی همرفته دارای سبک کهنه است. افعال ولغات کهنه وغریب و استعمالات دورۂ اوّل بتمامها درین کتاب دیده می شود وازیں گزشته اصطلاحات خاصی نیز از خود دارد که غالب آن هابعد ازین

---

[1] تصوف اسلام از عبدالماجد دریا آبادی: طبع سوم، ص: ۵۴،۵۳

در کتب تصوّف مصطلح گردیده است"[1]

اس کے بعد ملک الشعراء نے ذیل کے عنوانات کے تحت دادِ تحقیق دی ہے:

"لغات فارسی...... اصطلاحات وکلمات تازۂ عربی ...... موازنہ وسجع ......

حذف افعالِ بقرینہ"[2]

کشف المحجوب کے نام اورزبان کے بارے میں

غلط فہمیوں کا ازالہ

کشف المحجوب کے تمام قدیم خطی نسخوں میں اس کا پورا نام "کشف المحجوب" ہی لکھا ہے اور قدیم ترین مصنفین نے بھی اس کا یہی نام تحریر کیا ہے۔ مگر بعض مصنفین نے اس کا پورا نام "کشف المحجوب لارباب القلوب" سمجھا ہے۔ اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ حضرت خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ نے "فصل الخطاب" میں یوں لکھا ہے:

"در کشف المحجوب لارباب القلوب آوردہ است"[3]

چونکہ کشف المحجوب حاجی خلیفہ کے پیش نظر نہ تھی، اس لیے انہوں نے "کشف الظنون" میں اس کا نام اور کیفیت "فصل الخطاب" سے نقل کی۔

ژوکوفسکی لکھتا ہے:

"دریں مورد می تواں گفت کہ مشارالیہ (حاجی خلیفہ) اصلاخود متنِ کتاب کشف المحجوب

---

[1] سبک شناسی یا تاریخ تطور فارسی، ص:۱۸۷

[2] ایضاً، ص:۱۸۷۔۱۹۷

[3] فصل الخطاب خطی، ص:۶۰ (مملوکہ حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری، لاہور)

رانه دیده بوده است، زیرا معمولاً حاجی خلیفه
هنگام بحث از کتابهائ که شخصاً برای العین دیده،
آغاز وانجام نسخه نیز نقل می کند ولے درمورد
کشف المحجوب چنیں چیزی نیاورده است"[1]

لہٰذا"کشف الظنون "پراعتماد کرتے ہوئے متاخرین نے اس کا نام "کشف المحجوب لارباب القلوب" لکھنا شروع کردیا۔

پھر لکھا ہے:

"خواجه محمد پارسا از عرفائ طریقه نقشبندیه
متوفی هشت صدوبیست ودو هجری قمری، که
درحدود دوقرن قبل از حاجی خلیفه می زیسته،
درتالیف خود بنام فصل الخطاب لوصل الاحباب
اظهار داشته که کشف المحجوب عنوان اختصاری
کتاب هجویری است ونام کامل آن چنیں می باشد
کشف الحجب المحجوب لارباب القلوب"[2]

اور حاشیہ میں لکھا ہے:

"درفهرست آغاز نسخه بدین عنوان آمده: کتاب کشف سرالمحجوب لارباب القلوب باضافة کلمه "سر"[3] اس اقتباس میں ژوکوفسکی کی دو باتیں محلِ نظر ہیں: اوّل یہ کہ "فصل الخطاب" کے نام کے ساتھ

---

[1] مقدمہ ژوکوفسکی، کشف المحجوب، طبع تہران، ص:۵۲

[2] مقدمہ ژوکوفسکی کشف المحجوب (نسخہ خطی، دانش گاہ لینن گراڈ) طبع تہران، ص:۵۲

[3] ایضاً، حاشیہ، ص:۵۲

''لوصل الاحباب'' کا اضافہ غلط ہے، اس کتاب کا جو قلمی نسخہ راقم السطور کے پیش نظر ہے، اس سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ دوم: حاجی خلیفہ نے اس کا نام ''فصل الخطاب فی المحاضرات'' لکھا ہے۔[1] پھر آگے چل کر ایک اور کتاب کا تعارف کرایا ہے جس کا نام ''فصل الخطاب لوصل الاحباب'' ہے۔ ''کشف الظنون'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

''فَصْلُ الْخِطَابِ لِوَصْلِ الْاَحْبَابِ. منظومه فی اثنی عشر الف بیت للشیخ بدر الدین محمد بن محمد المعروف بابنِ رضی الدین الغزی م ۹۸۴''[2]

معلوم ہوتا ہے کہ ژوکوفسکی کو کشف الظنون دیکھتے وقت غلطی لگی ہے۔

دوسرے جو یہ لکھا ہے کہ:

''فصل الخطاب میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ کشف المحجوب اختصاری نام ہے اور پورا نام ''کشف الحجب المحجوب لارباب القلوب'' ہے''

عجیب بات ہے! ۱۱۷ صفحات پر مشتمل ''فصل الخطاب'' پیش نظر ہے، اس میں ہمیں تو کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ملا۔ اس کتاب میں ساٹھ ستر جگہ ''کشف المحجوب'' کے اقتباسات صرف کشف المحجوب کے نام سے نقل ہوئے ہیں۔ بلا کسی وضاحت کے اور صرف دو مقام پر اس طرح کے نام نظر آئے ہیں:

۱۔ کشف المحجوب لارباب القلوب.[3]

۲۔ کشف حجب المحجوب لارباب القلوب.[4]

---

[1] کشف الظنون (فلوگل ایڈیشن) نمبر ۹۰۵۸ جلد چہارم، ص: ۴۲۲

[2] ایضاً، نمبر ۹۰۶۰

[3] فصل الخطاب، قلمی، ص: ۶

[4] ایضاً، ص: ۴۲۱

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ پارسا جوشِ عقیدت اور کتاب کے موضوع کی مزید وضاحت کی خاطر اپنی طرف سے الفاظ بڑھاتے رہے ہیں۔ جیسا کہ نسخہ مخزونہ دانش گاہ لینن گراڈ کی فہرست میں ایک تیسرا اضافہ یہ ہے: ''کشف سر المحجوب لارباب القلوب''

غرض یہ کہ ''فصل الخطاب'' کے مطالعہ ہی سے ''رسالہ ابدالیہ'' اور ''کشف الظنون'' کے مؤلفین کو اشتباہ ہوا ہے وگرنہ حضرت داتا صاحب کی کتاب کا نام صرف اور صرف ''کشف المحجوب'' ہی ہے۔

پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ یونیورسٹی) جو بھارت کے مسلمانوں کے اذہان کو کمیونزم کے زہریلے اثرات سے مسموم کرنے پر مامور تھے، اسی لیے انہیں داراشکوہ کے دورِ الحاد و زندقہ کی تحریریں بہت پسند تھیں۔ یہ صاحب ۱۹۳۱ء میں کابل گئے تو بقول ان کے، حضرت نور المشائخ ملا صاحب شور بازار رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے اس خیال کا اظہار کیا کہ کشف المحجوب عربی زبان میں لکھی گئی تھی، اس کا فارسی ترجمہ بعد کو ہوا، عربی اصل ضائع ہوگئی، فارسی ترجمہ باقی رہ گیا۔ پروفیسر صاحب نے اس رائے کو قبول کرلیا اور آخر تک اس پر قائم رہے۔[1]

خدا جانے حضرت نور المشائخ نے کیا فرمایا اور اُنہوں نے کیا سمجھا۔ بہر حال! یہ رائے بالکل غلط ہے۔ اس کتاب کی نثر سبک قدیم میں ہے جو بعد میں نہیں لکھی جا سکتی تھی۔ نیز قدیم کتابوں میں جو اس کے اقتباسات ملتے ہیں، وہ بالکل اس کے مطابق ہیں۔

---

[1] رسالہ میڈیویل، انڈیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جلد ۲، ص ۱۲

کشف المحجوب فارسی کے مطبوعہ نسخے

اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس کے خطی نسخے بہت جلد اطراف و اکناف عالم میں پھیل گئی تھے۔ جیسا کہ ''تذکرۃ الاولیاء'' میں اس کے حوالے ملتے ہیں اوراس کے قلمی نسخے دنیا کی تمام بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں اور بعض لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں مگر بخوفِ طوالت اس وقت ان کی تعداد اور ضروری کوائف بیان نہیں کیے جاسکتے۔ صرف مطبوعہ فارسی نسخوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ کشف المحجوب: مطبوعہ مطبع پنجابی لاہور، صفحات ۲۶۷۔ راقم الحروف کے سامنے اس کا جو نسخہ (مملوکہ میاں محمد الدین کلیم) ہے، اس کا پہلا صفحہ بوسیدہ ہونے کے باعث سن طباعت بچشم خود پڑھ نہیں سکا۔ ڈیوگن نے اپنے مضمون میں اس کا سن طباعت ۱۸۷۴ء دیا ہے۔[۱]

۲۔ مطبوعہ بہاول پریس لاہور: سن طباعت ندارد، صفحات ۳۲۸۔ اس نسخہ میں مطبع پنجابی کے نسخہ کے حواشی من وعن درج ہیں، گویا یہ اسی کی نقل ہے۔ یہ ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔ اس پر سن طباعت درج نہیں مگر ڈیوگن نے اس کا سن طباعت ۱۹۰۳ء دیا ہے۔[۲] خدا جانے اس نے یہ کیسے جانا۔ بہرحال یہ نسخہ خاصہ قدیم ہے۔

۳۔ مطبوعہ مطبع نامی کرامی حرمت مند سلیانوف (سمرقند): سن طباعت ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء۔ یہ نسخہ بہت شوق سے چھاپا گیا ہے اور آخر میں مصنف کے سوانح داراشکوہ کی

۱۔ جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال: کلکتہ، جلد: ۸، ۱۹۴۲ء مقالہ کشف المحجوب از ایل۔ ایس۔ ڈیوگن

۲۔ ایضاً

''سفینۃ الاولیاء'' سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔

۴۔ مطبوعہ مطبع اسلامیہ: اسٹیم پریس لاہور، سن طباعت ۱۳۴۲ھ، ۱۹۲۳ء۔ صفحات ۳۲۹، یہ نسخہ نمبر ۱ اور ۲ کی نقل ہے اور اس کی مصحح مولانا سید احمد علی شاہ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور ہیں۔ آخر میں مصنف کے مختصر سوانح بزبان فارسی مرقومہ منشی حبیب اللہ درج ہیں اور یہ نسخہ سنہ مذکورہ میں دوبارہ طبع ہوا

۵۔ مطبوعہ رفاہ عام: اسٹیم پریس لاہور، سن طباعت ۱۹۳۱ء۔ صفحات ۳۲۸۔

۶۔ نسخہ ژوکوفسکی: مطبوعہ لینن گراڈ (روس) سن اشاعت ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء۔ صفحات مع فہارس ۲۰۷۔ یہ نسخہ اس کے مرتبہ پروفیسر والنٹین ژوکوفسکی (م ۱۹۱۸ء) کی تصحیح مقدمہ بزبان روسی اور ضمیمہ ہشت فہارس کے لحاظ سے سب نسخوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ چونکہ اس کے صرف اڑھائی سو نسخے طبع ہوئے تھے، اس لیے نایاب کے حکم میں داخل ہے۔ راقم نے بھی اس کی زیارت نہیں کی۔

۷۔ نسخہ ژوکوفسکی طبع تہران: ژوکوفسکی کا تصحیح کردہ نسخہ ادارہ انتشارات امیر کبیر تہران نے ۱۳۳۶ھ/۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ ژوکوفسکی کے مقدمہ کو فارسی میں منتقل کر کے شامل کیا گیا ہے۔ فاضل محمد لوی عباسی نے اس کی ابتداء میں دو مقالے ''تجلیات تصوفِ ایرانی'' اور ''تحقیقات نوین راجع بکشف المحجوب'' شامل کر کے اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ محمد لوی عباسی کے پہلے دو مقالے اور ژوکوفسکی کا مقدمہ ۶۲ صفحات کو محیط ہیں اور متن کتاب کے ۵۴۶ صفحات ہیں۔ آخری آٹھ فہرستوں کے ۶۱ صفحے ہیں۔ غرض کہ یہ بہترین نسخہ ہے۔

۸۔ مطبوعہ نامی پریس: لاہور، سن اشاعت ندارد، صفحات ۳۲۸ کاغذ اور صحت کے لحاظ

سے بہت ناقص ہے۔ اس پر سنِ اشاعت تحریر نہیں لیکن راقم کو معلوم ہے کہ قریباً ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں ۲۸ صفحات پر مشتمل فصول وابواب کی وضاحتی فہرست موجود ہے۔

۹۔ نسخہ مولوی محمد شفیع: مطبوعہ نوائے وقت پرنٹرز، لاہور، سن طباعت ۱۹۶۸ء، صفحات ۴۸۱، ناشر: احمد ربانی۔ اس کے شروع میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کی نشری تقریریں بطور پیش لفظ اور مقدمہ دے دی گئی ہیں، چونکہ یہ نسخہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبہ نسخے کی نقل بتایا جاتا ہے، اس لیے حضرت زکریا قدس سرہٗ کے حالاتِ زندگی مرقومہ مولوی صاحب موصوف بھی شامل کر دیئے گئے ہیں مگر اہل علم اس خطی نسخے کا حضرت زکریا سے انتساب صحیح نہیں سمجھتے۔ مولانا نور احمد خان فریدی، تذکرہ حضرت بہاء الدین ومؤلف کتب کثیرہ رقم فرماتے ہیں:

''العزیز'' بہاولپور کے شمارہ فروری ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں صاحب مضمون نے تحریر کیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام نے سید ہجویریؒ کی مشہور عالم تصنیف **کشف المحجوب** کو بھی اپنے ہاتھ سے سپرد قلم فرمایا تھا، یہ قیمتی نسخہ جیسا کہ صاحب مضمون نے تحریر کیا، پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے، مترجم ''عجائب الاسفار'' کے کتب خانہ میں موجود تھا، خاکسار نے ان کے قریبی رشتہ داروں سے ہر چند دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اس گنج شائیگان کا پتہ نہیں چل سکا۔ حال ہی میں جناب احمد ربانی صاحب نے محکمہ اوقاف کی اعانت سے **کشف المحجوب** کا ایک فارسی نسخہ طبع کرایا ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے۔ جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔ اُنھوں نے اس نسخے کا پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھی دیا ہے، مگر اسے

حضرت شیخ الاسلامؒ سے منسوب کرنے میں چند اشکال حائل ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر تاریخ ارقام ۶۶۴ھ درج ہے حالانکہ حضرت کا سن وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے۔ دوسرے یہ کہ دستخط کی عبارت بہاء الدین زکریا پر مشتمل ہے لیکن حضرت شیخ الاسلام کا نام صرف زکریاؒ ہے۔ ''ابومحمد'' کنیت اور ''بہاء الدین'' لقب ہے۔ کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اپنے قلم سے لقب نہیں لکھا کرتا، چہ جائیکہ حضرت شیخ الاسلام جیسی منکسر المزاج شخصیت اپنے نام سے پہلے اپنے لیے ''بہاء الدین'' لکھنا پسند کرتی۔ لہٰذا اس قلمی نسخے کا حضرت سے انتساب صحیح نہیں۔''

مولانا فریدی صاحب نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت کا سن وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے، صحیح نہیں، اختلاف ہے۔ کسی نے ۶۶۱ھ تو کسی نے ۶۶۶ھ لکھا ہے۔ اگر ۶۶۶ھ ہی کو صحیح قرار دے دیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۹۵ برس سے کچھ اُوپر ہوگی۔ کیا اس عمر میں وہ اتنی ضخیم کتاب کی نقل کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے؟ مزید طرفہ یہ کہ ترقیمہ میں ''بہاء الدین'' کو ''بہاؤالدین'' واؤ کے اضافہ کے ساتھ اور ''زکریا'' کو ''ذکریا'' ذال کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ہرگز ہرگز اس طرح کی غلطیاں نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا اس نسخے کا حضرت شیخ الاسلام کی طرف انتساب کاتب کا جعل ہے۔ بہرحال! یہ نسخہ صحت کے اعتبار سے سمرقندی نسخہ سے بہتر ہے۔

تراجم:

پروفیسر نکلسن (م ۱۹۴۵ء) کے کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ کیا جو پہلی

۱۔ تاریخ ملتان، جلد اوّل، ملتان ۱۹۷۱ء، ص: ۱۸۵، ۱۸۶

بار ۱۹۱۱ء میں گب میموریل لندن نے شائع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن چھپا۔ پھر ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۷ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو! یہ اس کتاب کی مقبولیت کی واضح دلیل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی چار بار چھپ چکا ہے۔

بیس سے زائد اُردو تراجم چھپ چکے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بارہا شائع ہوئے۔ اس وقت ان سب تراجم کی تفصیل دینے کی گنجائش نہیں۔

سیاحت:

مردانِ خدا کی زیارت اور مزاراتِ اولیا اللہ سے استفادہ واستفاضہ کی غرض سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا بہت بڑا مجاہدہ ہے جو مشاہدہ کی دولت سے نوازتا ہے۔ حضرت داتا صاحب نے یہ مجاہدہ بھی حدِ کمال کو پہنچا دیا۔ قریباً تمام عالم اسلام کی سیاحت کی اور وقت کے اعاظم مشائخ وصوفیاء سے اکتسابِ فیض کیا۔ انہوں نے جن جن ملکوں اور شہروں کے بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا، اس کا ذکر **کشف المحجوب** میں کیا گیا ہے ان اماکن کی نامکمل فہرست درج ذیل ہے:

ماوراُ النہر، آذربائیجان، بسطام، خراسان، کمش، کمند، نیشاپور، بخارا، سمرقند، سرخس، طوس، شام، بیت الجن، دمشق، رملہ، عراق، بغداد، فارس، نواحی خورزستان، فرغانہ، شلاتک، اوزکند۔ مہینہ، مرو، ترکستان، پاک وہند

کشف المحجوب حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ نہیں ہے۔ اس میں ان کے سفر وسیاحت کا ذکر ضمناً ہوتا چلا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اتنے ہی ملکوں اور شہروں کی سیاحت کی، جن کے نام ان کی کتاب میں مذکور ہوئے ہیں اور ان کا سفر پاک وہند بھی صرف اس حد تک محدود نہیں سمجھنا چاہئے

کہ وہ غزنی سے چل کر لاہور پہنچ گئے۔

کشف المحجوب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پاک و ہند کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی، یہاں کے علماء سے ملے تھے اور یہاں کی تہذیب وتمدّن ورسم ورواج اور ہندوؤں کے عقائد سے گہری واقفیت حاصل کی تھی۔

فناء وبقا کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلے پر ہندوستان میں میرا صرف ایک عالم سے مناظرہ ہوا تھا۔ آپ فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے اندر میں نے ایک ایسا شخص دیکھا جو تفسیر وتذکیر اور علم کا مدعی تھا۔ اس نے مجھ سے فناء وبقا کے مسئلے پر مناظرہ کیا۔ جب میں نے اس کی تقریر سنی تو معلوم ہوا کہ یہ خود فناء وبقا کو بالکل نہیں سمجھتا اور قدیم ومحدث کے فرق کو بھی نہیں جانتا۔''[۱]

حلولیہ کے عقائد باطلہ کے بیان میں روح کے مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...... اور جملہ اہل ہند وتبت اور چین وماچین یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ شیعوں، قرامطیوں اور باطنیوں کا بھی اسی پر اجماع ہے......''[۲]

محبت کی شہرت اور تعریف کی بحث کے دوران، سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہنود کی قلبی ناراضی اور ان کی بے بسی کا ذکر نہایت لطیف پیرائے میں کیا ہے:

''ہندوؤں کے نزدیک محبت کی قید محمود کی قید سے بھی زیادہ مشہور ہے اور محبت کا زخم اور داغ ہندوؤں کے نزدیک اس زخم سے بھی زیادہ شہرت رکھتا ہے جو محمود نے انہیں لگایا تھا۔''[۳]

---

۱ **کشف المحجوب**، طبع تہران، ص: ۳۱۴،۳۱۳

۲ ایضاً ص: ۳۳۷   ۳ ایضاً ص: ۳۹۹

"باب سماع الاصوات والالحان" میں رقم طراز ہیں:

"مشہور ہے کہ ہندوستان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو جنگل میں جا کر گاتے اور سریلی آواز نکالتے ہیں۔ ہرن جب ان کے غنا اور لحن کو سنتے ہیں تو وہ ان کی طرف آ جاتے ہیں اور شکاری ان کے گرد گھوم کر گاتے رہتے ہیں۔ حتی کہ ہرن گانے کی لذت سے مست ہو کر آنکھیں بند کر کے سو جاتے ہیں اور وہ انہیں پکڑ لیتے ہیں"۔[1]

ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:

"مَیں نے ہندوستان میں دیکھا کہ زہر قاتل میں ایک کیڑا پیدا ہو گیا تھا اور اس کی زندگی اسی زہر پر موقوف تھی۔"[2]

غرض کہ انہوں نے بے سروسامانی میں پا پیادہ اس قدر سفر کیے کہ آج کے ذرائع میں ایک بے سروسامان فقیر کے لیے ان کا تصور بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ لعل بیگ لعلی لکھتے ہیں:

"مسافرت بسیار نموده وریاضت و مجاهدات شاقه که از طاقت بشری بیرون بود ، کشیده"[3]

لاہور میں ورودِ مسعود:

خاکِ پنجاب از دم او زنده گشت
صبح ما از مهرِ او تابنده گشت

---

[1] کشف المحجوب، طبع طہران، ص: ۵۲۲   [2] ایضاً، ص: ۵۳۱

[3] ثمرات القدس خطی (مملوکہ صاحبزادہ نصرت نوشاہی، شرقپور شریف)

داراشکوہ نے لکھا ہے کہ حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ نے تجرید وتوکل کی بنیاد پر بارہا طویل سفر کیے اور بہت زیادہ سیاحت کے بعد دارالسلطنت لاہور میں اقامت گزین ہوئے اور اس شہر کے تمام باشندے ان کے مرید ومعتقد ہو گئے:

"بارھا برقدم تجرید و توکل سفر بسیار کردہ اند و بعد از سیاحی بسیار در دارالسلطنت لاہور رسیدہ اقامت ورزیدند اھل آن دیا رھمہ مرید و معتقد او گشتند"[1]

لاہور تشریف لا کر اسی مقام پر قیام پذیر ہوئے جہاں ان کا مزار پُر انوار ہے۔ لعل بیگ لعلی لکھتا ہے:

"اکنوں قبرش در خطۂ لاہور در ہمان زمین است کہ روح پاکش از جسد مطہروی مفارقت کردہ"[2]

لاہور کب تشریف لائے:

اس باب میں مختلف آراء ہونے کے سبب یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے۔ لالہ سبحان رائے بٹالوی رقم طراز ہے:

"محمود غزنوی کے ہمراہ غزنی سے لاہور تشریف لائے اور یہیں فوت ہوئے، سلطان کا عقیدہ تھا کہ لاہور کی فتح ان ہی کی توجہ سے ہوئی۔"[3]

یہ روایت واضح طور پر غلط ہے۔ اس لیے کہ بقول سید محمد لطیف مصنف

---

[1] سفینۃ الاولیاء، طبع کانپور، ص:۱۶۴

[2] ثمرات القدس (قلمی)

[3] خلاصۃ التواریخ، مترجم اردو از ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ص:۱۰۶

"تاریخ لاہور" سلطان محمود غزنوی نے لاہور ۳۹۳ھ میں فتح کیا اور بقول لین پول سلطان محمود غزنوی ۳۹۲ھ میں پہلی بار پاک و ہند کی طرف متوجہ ہوا۔ گویا اس وقت تک حضرت داتا صاحب کی اس جہانِ رنگ و بو میں تشریف آوری بھی نہیں ہوئی تھی۔

"فوائد الفواد" میں ایک ایسی روایت درج ہے جو بعض غلط فہمیوں کا باعث ہوئی۔ لہٰذا وہ آج تک ہدف تنقید بنتی چلی آرہی ہے۔ وَھُوَ ھٰذَا

"شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہما دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے اور وہ پیر اپنے عہد کے قطب وقت تھے۔ شیخ زنجانی (شیخ علی ہجویری سے) پہلے ہی لاہور میں مقیم تھے۔ کچھ مدت کے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی سے فرمایا کہ لاہور جاؤ اور وہیں مقیم ہو جاؤ...... شیخ علی ہجویری نے عرض کی کہ وہاں حسین زنجانی مقیم ہیں۔ پیر نے فرمایا: تم جاؤ، اور جب علی ہجویری ان کے حکم کے مطابق لاہور پہنچے تو رات کا وقت تھا، صبح ہوئی تو دیکھا کہ لوگ حسین زنجانی کا جنازہ باہر لا رہے ہیں۔"[1]

اس روایت کی تکذیب و تردید میں راقم احقر اس قسم کی گرما گرم بحث نہیں کر سکتا، جس طرح کہ ڈاکٹر پیر محمد حسن اور پروفیسر محمد اسلم نے کی ہے، اس لیے کہ یہ ان ہی فضلاء کا حق ہے۔[2] مختصر یہ کہ حضرت شیخ حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ جن کا مزارِ مبارک چاہ میراں لاہور میں مرجع خلائق ہے، ان کا سال وفات "خزینۃ الاصفیاء" میں ۶۰۰ھ[3] اور "تحقیقاتِ چشتی" میں ۶۰۶ھ درج ہے اور ان کی لاہور میں آمد کے

---

[1] فوائد الفواد: فارسی طبع لاہور، ص: ۵۷

[2] ماہ نامہ فکر و نظر: اسلام آباد، ستمبر ۱۹۷۱ء مقالہ سید علی ہجویری اور حسین زنجانی از مخدومی ڈاکٹر پیر محمد حسن اور تاریخی مقالات طبع لاہور از پروفیسر محمد اسلم ملاحظہ ہوں۔

[3] خزینۃ الاصفیا: جلد دوم: ص: ۲۵۱

کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سید یعقوب زنجانی کے ہمراہ آئے اور سید یعقوب زنجانی کے حالات میں بیان کیا ہے کہ وہ ۵۳۵ھ میں وارد لاہور ہوئے۔[1]...... حضرت سید محمد معصوم شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ ساکن چک سادہ شریف (م ۱۳۸۸ھ) نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ: ''میں نے شیخ زنجانی کے مزار پر وہ پتھر نصب دیکھا ہے جس پر ان کا سن وصال ۶۰۰ھ تھا جو مزار کی مرمت کے وقت اُتار دیا گیا''...... عجیب بات یہ ہے کہ مفتی غلام سرور اور مولوی نور احمد چشتی نے ان کا سن وصال ۶۰۰ھ اور ۶۰۶ھ اپنی اپنی کتابوں میں لکھنے کے باوجود ''فوائد الفواد'' کی اس روایت کو حضرت داتا صاحب کی لاہور میں آمد کے سلسلے میں درج کر کے اسے حضرت حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ مدفون چاہ میراں پر منطبق کر دیا ہے۔ بہر حال! یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ سے قریباً ایک سو تیس سال بعد واصل بحق ہوئے اور ان سے حضرت خواجۂ خواجگان معین الدین حسن سجزی (س، ج، ز، ی) چشتی اجمیری قدس سرہ (۶۳۳ھ) نے لاہور میں ملاقات کی تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی ملاقات کا ذکر معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ مشہور تذکرہ نویس اور صوفی بزرگ حضرت شیخ جمالی (۹۴۲ھ) نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

''حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شیخ سعد الدین حمویہ قدس روحہ کے پیر ہیں۔[2] ان دنوں بقید حیات تھے، حضرت زبدۃ المشائخ

---

[1] خزینۃ الاصفیاء: جلد دوم: ص: ۲۵۲

[2] مآثر الکرام میں بھی لکھا ہے کہ سعد الدین حمویہ ''شیخ زنجانی'' کے مرید تھے، شیخ فخر الدین زنجانی پیر ارشاد شیخ سعد الدین حموی (ص: ۷) شیخ حمویہ ۶۵۰ھ میں فوت ہوئے، جملہ تذکروں میں ان کے پیر کا نام حضرت نجم الدین کبریٰ تحریر ہے۔ حضرت زنجانی سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

والاولیاء معین الحق والدین قدس سرہٗ اور حضرت شیخ المشائخ والاولیاء شیخ حسین زنجانی قدس سرہٗ کے درمیان حد سے زیادہ ربط ومحبت کا اظہار ہوا۔''[1]

ابوالفضل ''آئین اکبری'' میں ان دونوں بزرگوں کی ملاقات ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''شیخ حسن (حسین) زنجانی فراوان آگهی داشت، خواجه معین الدین در لاهور به صحبت او رسید و خواب گاه او در انجاست''[2]

مولانا محمد غوثی شطاری رقم طراز ہیں:

''جب خواجہ معین الاولیاء چشتی اجمیری ہند کو تشریف لائے تو اس وقت چند روز لاہور میں پیر زنجانی کی مصاحبت میں بھی قیام فرمایا تھا، باہم راز داری اور خدا شناسی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔''[3]

ملا محمد صالح کمبوہ بھی ان بیانات کی تائید کرتا ہے:

''بالجمله در لاهور به صحبت شیخ حسین زنجانی رسیده وز انجاتوجه جانب دهلی اختیار فرمود''[4]

داراشکوہ کی تائید مزید ملاحظہ ہو:

---

[1] سر العارفین قلمی از شیخ جمالی: مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، بحوالہ تاریخی مقامات از پروفیسر محمد اسلم، ص:۲۸۲

[2] آئین اکبری: جلد سوم از ابوالفضل، سرسید ایڈیشن، ۱۲۷۲ھ، ص:۲۰۷

[3] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار از محمد غوثی، بسال ۱۰۲۲ھ طبع آگرہ، ص:۶، ۲۵

[4] عمل صالح (شاہ جہاں نامہ) طبع لاہور، جلد اوّل، ص:۵۰

"......شیخ حسین زنجانی را در لاہور دیدہ اند"[1]

اس مقام پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہٗ لاہور کب تشریف لائے؟

مولانا سید عبدالباری اجمیری اپنی تنقیدی تالیف "تاریخ السلف" میں لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ بزرگ ۵۸۸ھ میں وارِدِ ہند ہوئے اور لاہور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ۵۸۹ھ میں اجمیر شریف پہنچ گئے۔[2]

اندریں صورت "فوائد الفواد" کی اس روایت کو الحاقی سمجھ لینا کوئی گناہ نہیں۔ مگر جب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کی تاریخ نے سب بزرگوں کے حالات کو محفوظ کر لیا ہے تو عنانِ فکر کو اس طرف بھی موڑا جا سکتا ہے کہ حضرت داتا صاحب سے پہلے تشریف لانے والے حسین زنجانی ان سے مختلف ہوں گے اور ان کا مزار اور حالات محفوظ نہیں رہ سکے، مگر ہم نامی کی وجہ سے پہلے حسین زنجانی سے متعلق روایت کو بعد والے حسین زنجانی کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ ہم نام بزرگوں کے حالات کے سلسلے میں اکثر ایسا ہوا ہے اور اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت خواجہ پارسا قدس سرہ کے تسامح کا واقعہ مذکور ہو چکا ہے کہ انہوں نے حضرت داتا صاحب اور ابو سعید (رحمہا اللہ) دونوں کو ایک ہی پیر کا مرید قرار دے دیا، یا جس طرح کہ جامی لاہوری کے قطعہ تاریخ وفات، حضرت داتا صاحب کو حضرت عبدالرحمٰن جامی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، لہٰذا اس معاملہ میں بھی التباس داشتباہ کا قوی امکان ہے۔

---

[1] سفینۃ الاولیاء، طبع کانپور، ص: ۹۳

[2] تاریخ السلف، طبع آگرہ، ۱۳۴۴ھ، ص: ۹۷۸

اندریں حال حضرت حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق روایت مندرجہ "فوائد الفواد" اس مسئلے کو سلجھانے کی بجائے مزید اُلجھا دیتی ہے۔

بہر حال! جس طرح حضرت داتا گنج بخش کی تاریخ ولادت اور دیگر حالات زندگی کے باب میں قدیم تاریخیں کوئی راہنمائی نہیں کرتیں، اسی طرح ان کے لاہور میں ورودِ مسعود کے سلسلے میں کوئی نشاندہی نہیں کرتیں۔ لہٰذا اس کے متعلق بھی صرف قیاس ہی سے کام لیا گیا ہے۔

رائے بہادر کنہیالال نے بسال ۱۸۸۴ھ کسی مآخذ کا حوالہ دیئے بغیر لکھا ہے:

"یہ بزرگ سلطان مسعود، سلطان محمود کے بیٹے کے ہمراہ لاہور میں آیا۔"[۱]

سیّد محمد لطیف نے بسال ۱۸۹۲ء سن ورود کا تعین بھی کر دیا:

"آپ سلطان مسعود، پسر سلطان محمود کی فوج کے پیچھے ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے"۔[۲]

سیّد محمد لطیف نے سن کا تعین کر کے اس قیاسی سن کو مزید مشکوک بنا دیا ہے، اس لیے کہ ۴۳۱ھ میں سلطان مسعود دورِ ابتلاء میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس سال ترکمانوں نے اس کے ملک پر حملہ کر کے اسے شکست دے دی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے خزائن کو لے کر لاہور آ رہا تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے اپنے ہی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اپنے بھائی محمد کا قیدی بن گیا۔ (ملخصاً)[۳]

۱۔ تاریخ لاہور از کنہیالال، طبع لاہور ۱۸۸۴ء، ص: ۹۱

۲۔ تاریخ لاہور انگریزی بحوالہ سوانح داتا گنج بخش از محمد الدین فوق، ص: ۲۷

۳۔ تاریخ بیہقی: مجلد اوّل، طبع تہران، ص: ۴، ۲۸۳

اس کے باوجود ۴۳۱ھ پر اکثر مؤرخین مطمئن نظر آتے ہیں۔ مگر رائے بہادر کنہیالال کی ''تاریخ لاہور'' سے ۳۲ سال قبل لکھی جانے والی کتاب ''چار باغ پنجاب'' مؤلفہ گنیش داس میں ان کی تشریف آوری کا سال ۴۵۱ھ تحریر ہے:

''در ۴۵ھ چھار صدو پنجاہ ویک ھجری درلاھور تشریف آوردند...... بعد چھاردہ سال درسلطنت سلطان ابراھیم غزنوی بتاریخ ۴۶۵ ھ چھار صد و شصت و پنجم ھجری درلاھور ودیعت حیات سپردند''[1]

جب یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت داتا صاحب نے اپنی عمر کے آخری سال لاہور میں گزارے[2] تو پھر گنیش داس وڈیرہ نے جو سن (۴۵۱ھ) دیا ہے، اُسے ترجیح دینا چاہیے۔ ۴۵۱ھ کو قرین قیاس لے لیا جائے تو حضرت داتا صاحب، سلطان ابراہیم ظہیر الدولہ بن مسعود بن محمود غزنوی کی تخت نشینی کے ساتھ ہی لاہور تشریف لائے۔ لین پول نے ابراہیم کے سریر آرائے سلطنت ہونے کا سال ۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء لکھا ہے۔ مگر یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ کے مرشد حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی قدس سرہٗ کی تاریخ وصال ''خزینۃ الاصفیاء'' میں ۴۵۳ھ درج ہے اور بقول ذھبی وہ ۴۶۰ھ میں واصل الی اللہ ہوئے اور ان کے وصال کے وقت حضرت داتا صاحب بیت الجن (دمشق) میں مقیم تھے اور پیر نے مرید کی

---

[1] چار باغ پنجاب، فارسی از گنیش داس وڈیرہ، مرتبہ پروفیسر کرپال سنگھ، شائع کردہ سکھ ہسٹری ڈیپارٹمنٹ خالصہ کالج امرتسر، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۷۹

[2] مقالات دینی وعلمی: حصہ اوّل از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع ص: ۲۲۸

گود میں جان جانِ آفریں کی سپرد کی تھی...... ڈاکٹر محمد شفیع نے اس کا حل یہ پیش کیا ہے:

''وہ یا تو لاہور ۴۶۰ھ کے بعد آئے یا ایک سے زیادہ دفعہ یہاں آئے''۔

حق زحرفِ اُو بلند آوازہ شد:

اس نائبِ رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے قیام لاہور کے دوران ہزار ہا بت پرست کفار کو کلمۂ توحید پڑھا کر ان کے سینوں کو نورِ اسلام سے منور کیا اور سینکڑوں خداؤں کو پوجنے والوں کو صرف ایک خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے پر مائل کیا اور لاتعداد گم کشتگانِ بادیہ ضلالت کو صراط مستقیم پر گامزن کیا اور کتنے ہی خوش نصیبوں کو اپنی نظر کیمیا اثر کی بدولت ولایت کے بلند مراتب پر فائز کیا۔

یہ درست ہے کہ محمود کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی یہاں مسلمان ایک حاکم قوم کی حیثیت سے رہنے لگے تھے اور یہاں کے کفار مسلم فاتحین سے بظاہر مرعوب تھے مگر ان کے قلوب مسلمان فاتحین کے ساتھ نہیں تھے اور وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ مگر یہاں تشریف لانے والے صوفیاء کرام بالخصوص حضرت داتا صاحب کے ورودِ مسعود کے بعد یہاں کی مقامی آبادی میں سے لاتعداد لوگ اس کی تبلیغ کے سبب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ چنانچہ یہاں کے باشندوں میں سے ایک کثیر گروہ کی دلی ہمدردیاں فاتحین کے ساتھ ہو گئیں تھیں۔ ''نظریہ وطنیت'' خاک میں مل گیا اور دو قومی نظریہ کی بنیادیں رکھ دی گئیں اور بعد میں آنے والے صوفیاء کرام کی مساعیِ جمیلہ سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا جس سے مسلمانوں کی حکومت استحکام پکڑتی گئی۔ فاتحین نے کفار کو تیر وسنان سے زیر کیا، توان نائبین مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں تیر نظر سے خدائے واحد کا مطیع ومنقاد بنا دیا۔

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے حضرت داتا صاحب قدس سرہٗ کی عظیم الشان دینی خدمات اور روحانی عظمت کو چند اشعار میں جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ذیل میں ان کے وجد آفریں اشعار ملاحظہ ہوں:

سیّد ہجویر مخدوم اُمم　　مرقد او پیر سنجر[1] را حرم
بند ھای کوھسار آساں گسیخت　　در زمینِ تخم سجدہ ریخت
عھد فاروق از جمالش تازہ شد　　حق زخرفِ اُو بلند آوازہ شد
پاسبانِ عزت اُمُّ الکتاب　　از نگاھش خانۂ باطل خراب
خاکِ پنجاب از دم اُو زندہ گشت　　صبح ما از مہر اُو تابندہ گشت
عاشق و ھم قاصد طیار عشق　　از جبینش آشکار اسرار عشق

حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہٗ نے لاہور کو جو "قطب ارشاد" کا درجہ دیا ہے، اصل میں یہ اسی قطب الاقطاب (علی ہجویری) کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ حضرت شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فقیر کے نزدیک یہ شہر لاہور تمام ہندوستان کے شہروں میں "قطب ارشاد" کی طرح ہے، اس شہر کی خیر و برکت تمام بلادِ ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔"[2]

---

[1] اہل تحقیق کے نزدیک "سجز" لکھنا صحیح ہے۔ استاد سعید نفیسی صاحب نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے شعر میں "پیر سنجر" غلط چھپ گیا ہے اصل میں یہ شعر یوں ہونا چاہیئے: سید ھجویر مخدوم اُمم، مرقد او پیر سجزی داحرم (حلال فارسی، کراچی بحوالہ از کار جمیل از محمد موسیٰ، ص:۵۱)

[2] مکتوبات مجدد الف ثانی اردو ترجمہ مولانا محمد سعید احمد نقشبندی، طبع کراچی، دفتر اوّل حصہ اوّل، ص:۲۳۸

حضرت نے اپنی روحانی قوت سے کفرستانِ ہند میں جو تخم سجدہ کی کاشت کی تھی، رائے بہادر کنہیا لال نے بدیں الفاظ اس کا اعتراف کیا ہے۔

"مسلمانی دین پھیلانے میں بڑی بڑی کوشش کی۔"[۱]

اور گنیشن داس وڈیرہ رقم طراز ہے:

"دراں عہد اکثر قوم گوجران ہندو مشرب در لاہور وطن گاہ راشتند معتقد او شدہ اسلام قبول کر دند."[۲]

مولوی نور احمد چشتی نقل کرتے ہیں:

"جب حضرت یہاں تشریف لائے تو اس وقت یہاں ایک شخص رائے راجو، نائب حاکم پنجاب حضرت کا مرید ہو کر مسلمان ہوا اور اس کا نام "شیخ ہندی" رکھا گیا۔ اس کی اولاد تا حال خادم و مجاور ہے"۔[۳]

تعمیر مسجد اور ایک کرامت:

حضرت داتا صاحب قدس سرہ نے لاہور تشریف لاتے ہی اپنی فرودگاہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی۔ اس ضمن میں داراشکوہ لکھتا ہے:

"انہوں نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس کی محراب دیگر مساجد کی بہ نسبت جنوب کی طرف مائل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت کے علماء جو لاہور میں موجود تھے، اس محراب کی سمت کے سلسلے میں حضرت شیخ پر معترض ہوئے۔ چنانچہ ایک روز

---

۱. تاریخ لاہور از کنہیا لال، ص:۹۱

۲. چار باغ پنجاب، طبع امرتسر، ص:۲۷۹

۳. تحقیقات چشتی، طبع لاہور ۱۳۲۴ھ ص:۱۴۷

حضرت نے سب علماء کو جمع کیا اور خود امامت کے فرائض سرانجام دیئے اور بعد ادائے نماز حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: دیکھو کعبہ شریف کس سمت میں ہے؟ دیکھا تو حجابات اٹھ گئے اور کعبہ شریف محراب کی سیدھ میں نمودار ہو گیا۔۔۔۔ان کا مزار بھی ان کی مسجد کی سمت کے مطابق ہے"۔[1]

سال وصال:

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کے سال وصال میں بھی خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ لعل بیگ لعلی نے "ثمرات القدس" اور شہزادہ دارا شکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں ان کے سن وفات ۴۵۶ھ اور ۴۶۴ھ رقم کیے ہیں۔ عہد جہانگیر کے عالم وعارف مولانا جامی لاہوری (مدفون بجوار حضرت شیخ طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے قطعہ تاریخ میں ۴۶۵ھ نظم کیا ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام" میں، گنیش داس وڈیرہ نے "چار باغ پنجاب" میں، سامی بیگ نے "قاموس الأعلام" میں ۴۶۵ھ ہی لکھا ہے اور دیگر متعدد مؤلفین نے بھی یہی سن نقل کیا ہے۔ نکلسن نے ۴۶۵ھ تا ۴۶۹ھ کا کوئی سا سال کہا ہے۔ ڈاکٹر قاسم غنی نے "تاریخ تصوف در اسلام" جلد دوم میں درحدود ۴۷۰ھ تجویز کیا ہے۔

مگر ڈاکٹر مولوی محمد شیخ اور عبدالحی حبیبی قندھاری (کابل) ان سب سے آگے نکل گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے ۴۷۹ھ[2] اور حبیبی صاحب نے ۵۰۰ھ تک کا تعین کیا ہے۔ ان فاضلوں نے کشف المحجوب کے چند ایک مختلف ایڈیشن سامنے رکھ

---

[1] سفینۃ الاولیاء، فارسی، طبع کانپور، ص: ۱۶۴

[2] مقالات دینی وعلمی از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، حصہ اول، ص: ۲۳۱

کر اس قسم کی داخلی شہادتیں فراہم کی ہیں کہ داتا صاحب نے فلاں فلاں بزرگ کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ یا رضی اللہ عنہ لکھا ہے اور فلاں کا ذکر بہ صیغہ ماضی کیا ہے۔لہٰذا یہ کتاب بقول مولوی محمد شفیع ۴۷۹ھ اور بقول حبیبی ۴۸۱ھ کے بعد تک لکھی جا رہی تھی۔حبیبی صاحب نے اپنی طویل بحث کا لب لباب ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''لازمی طور پر ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے درمیان وفات پائی ہوگی''۔ [۱]

مفصل بحث کا یہ مقام نہیں۔ مختصر یہ کہ بیشتر مقامات پر ''رحمہ اللہ'' اور ''رضی اللہ عنہ'' کاتبوں کے خود ساختہ اضافے ہیں اور اس طرح ''ہست'' کو ''بود'' بھی بنایا ہوا ہے۔ایسی تحقیق کی بنیاد پر مصنف کا اپنا مکتوبہ نسخہ ہونا چاہئے۔اگر یہ ممکن نہ ہو تو قدیم ترین متعدد خطی نسخے پیش نظر ہونے چاہئیں۔کاتبوں کی کمی بیشی کا مدار نہیں بن سکتی۔اس جدید تحقیق کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔فاضل حبیبی نے کشف المحجوب نسخہ سمرقند سے ذیل کا اقتباس پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کتاب زیر تسوید تھی کہ حضرت امام قشیری قدس سرہ ۴۶۵ھ میں وفات پا گئے تھے:

''استاد امام زین الاسلام ابو القاسم عبد الکریم بن هوازن القبشیری رضی الله عنه اندر زمانه خود بدیع بود قدرس رفیع و منزلت بزرگ''۔ [۲]

مگر یہی عبارت ژوکوفسکی ایڈیشن میں اس طرح ہے:

---

[۱] مقالات منتخبہ مجلہ دانشکدہ خاور شناسی، دانش گاہ پنجاب، مقالہ: تاریخ وفات داتا گنج بخش علی ہجویری غزنوی از عبدالحی حبیبی۔ فاضل موصوف کا یہ مقالہ پہلی بار اورینٹل کالج میگزین شمارہ فروری ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا تھا۔

[۲] مقالات منتخبہ، ص: ۲۶۴

"استاد و امام زین اسلام عبد الکریم ابو القاسم بن
هوازن القشیری اندر زمانہ خود بدیع ست و
قدرش رفیع ست و منزلت بزرگ"[1]

پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں کشف المحجوب کا ایک خطی نسخہ مکتوبہ ۱۰۸۰ھ موجود ہے۔ اس میں بھی:

"اندر زمانہ خود بدیع ست..."[2]

تحریر ہے ۔۔۔ گویا اس بحث برائے بحث یا تحقیق کی بنیاد محض اختلاف نسخ اور کاتبوں کے اضافات پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ ان بزرگوں کے اسماء کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ حضرت نے خود ہی لکھا ہے، تو پھر ان کے اپنے اسم گرامی کے ساتھ شروع کتاب ہی میں رضی اللہ عنہ بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق کیا کہا جائے گا اور اگر انہوں نے اپنے لیے یہ دعائیہ کلمہ خود تحریر کیا ہے، تو وہ دوسرے زندہ بزرگوں کے لیے بھی کر سکتے تھے...... بہر حال! حضرت کا صحیح سن وصال کسی معاصر نے نہیں لکھا لہٰذا ۴۵۶ھ قطعاً غلط ہے۔ ۴۶۵ھ تا ۴۶۹ھ ہی قرین صحت سمجھا جا سکتا ہے۔[3]

---

[1] کشف المحجوب طبع تہران، ص: ۲۰۹

[2] تفصیلی فہرست مخطوطات فارسیہ، پنجاب پبلک لائبریری، مرتبہ منظور احسن عباسی، ۱۹۶۳ء نمبر ۶، ۲۹۷ ص: ۱۵۷

[3] عبد الحی حبیبی نے اس بحث کا اعادہ مقدمہ طبقات الصوفیہ میں بھی کیا ہے۔ اول اول میں نے ان کی یہ تحقیق اسی میں دیکھی تھی اور میں ان کی ثقاہت کے پیش نظر اس کا قائل ہو گیا تھا اور مقدمہ مکتوبات امام ربانی لکھتے وقت ان کا اتباع کیا تھا، مگر اب کشف المحجوب کے متعدد نسخے دیکھنے سے اس جدید تحقیق سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔

مزار پرانوار:

یوں تو جملہ ارباب یقین کے قلوب حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کے مزار میں ہیں مگر جہاں وہ محو استراحت ہیں، وہ مقام بوسہ گاہ عالم، قبلۂ اہل صفا اور کعبہ عشاق ہے۔ یہاں عوام کے علاوہ ہر وقت اولیائے ظاہرین و مستورین کا ہجوم رہتا ہے۔ پاکستان بھر میں یہ وہ متبرک و مقدس مقام ہے جہاں جملہ مقامات مقدسہ سے زیادہ قرآن خوانی ہوتی ہے۔ جہاں سب سے زیادہ ذکر خدا اور ذکر محبوب خدا (ﷺ) ہوتا ہے اور یہ تبلیغ اسلام اور روحانیت کا سب سے بڑا مرکز ہے، جہاں ہر وقت حاجت مند زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے اور داتا (سخی) کے دریائے فیض کو دیکھ کر بے اختیار ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا　　ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

حضرت کا مزار فائض الانوار زمانہ قدیم سے مرجع خواص و عوام چلا آ رہا ہے۔ بڑے بڑے عارفین اور سرخیل اولیاء یہاں سے فیض یاب ہوئے اور اس خانقاہ کی دھول کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا عین سعادت سمجھتے رہے۔ مولانا جامی لاہوری لکھتے ہیں:[1]

خانقاه علی هجویری است　　خاک جاروب از درش بردار

طوطیان کن بدیدهٔ حق بیں　　تا شوی واقف در اسرار

چوں که سردار مکمل معنی بود　　سال وصلش بر آید از "سردار"

۴۶۵

---

[1] مقدمہ کشف المحجوب از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ص: ۸

میر عبدالعزیز زنجانی جو غالباً شاہ جہاں کے زمانہ کا شاعر ہے، نے عرفی کے مشہور قصیدے کے جواب میں لاہور پر ایک قصیدہ لکھا، اس میں حضرت داتا صاحب کے روضۂ انور واطہر پر جو زائرین کا ہجوم رہتا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

مزار در نثار شاہ ہجویری ندید ستی
کہ محل آسابہ پیرا مونش جوش انس وجان بینی
گدای در گہش از منزلت شاہ جہان یابی
غلام خادمش از رتبہ مخدوم جہان بینی[1]

داراشکوہ لکھتا ہے:

"ہر جمعرات کو خلقت انبوہ در انبوہ روضۂ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہے اور مشہور ہے کہ جو کوئی چالیس جمعراتیں یا چالیس دن متواتر ان کے روضۂ شریفہ کا طواف کرے، اس کی ہر حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ فقیر (داراشکوہ) نے بھی ان کے روضۂ منورہ کی زیارت کی ہے"[2]

مفتی علم الدین رقمطراز ہیں:

"ہر شب جمعہ وروز جمعہ ہزار ہا مردم برائے زیارت ایشاں مع نذورات می روند، مرادات دلی رامستدعی می شوند"[3]

داراشکوہ مزار شریف کے محل وقوع کے بارے میں لکھتا ہے:

---

[1] مقدمہ کشف المحجوب از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ص ۸

[2] سفینۃ الاولیاء: طبع کانپور، ص: ۱۶۵

[3] عبرت نامہ: طبع لاہور، مجلد دوم، ص: ۶۴

"قبر درمیان شہر لاہور مغربی قلعہ واقع شدہ"۔

"یعنی ان کی قبر لاہور شہر میں قلعہ سے مغرب کی جانب واقع ہے"۔[1]

اس جملے کا محمد وارث کامل نے یوں ترجمہ کیا ہے:

"مزار مبارک لاہور کے مغربی قلعہ میں واقع ہے"۔[2]

لاہور کا نقشہ تبدیل ہو جانے کے سبب داراشکوہ کی یہ تحریر مبہم ہوگئی ہے۔ پھر ترجمہ کرنے والے نے غلطی کھائی تو آج سے قریباً پندرہ سال قبل لاہور کے ایک ایسے مولوی صاحب نے جو صوفیاء کے مزارات پر حاضری بدعت و شرک سمجھتے تھے، یہ اعلان داغ دیا کہ یہ مزار داتا صاحب کا نہیں، ان کا مزار قلعہ لاہور میں ہے۔ اس وقت مولوی موصوف کے اس بیان کے خلاف متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔۔۔ داراشکوہ کی اس تحریر کے ابہام کو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے اس طرح حل کیا ہے:

"داراشکوہ نے یہ کہا ہے کہ قبر شہر لاہور کے درمیان، قلعہ کے مغرب میں واقع ہے"۔

یہ کچھ عجیب سا بیان ہے۔ اس لیے کہ قبر شہر کی فصیل کے باہر ہے۔ البتہ شہر کی بیرونی آبادی کے درمیان ہے اور قلعہ کے مغرب کی بجائے جنوب مغرب کہنا زیادہ صحیح تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داراشکوہ کے زمانہ میں قلعہ سے مغرب کو آتے تھے تو بادشاہی مسجد جو کہ اس وقت تھی ہی نہیں، پہلا قابل ذکر مقام راوی کا گھاٹ تھا۔ دریا اس وقت قلعہ کے نیچے سے بہتا تھا۔ اس گھاٹ کو کابل جانے والی سڑک عبور

---

1. سفینۃ الاولیاء: طبع کانپور، ص: ۱۶۵

2. ایضاً، اردو ترجمہ از وارث کامل، طبع لاہور، ص: ۱۹۸

کرتی تھی اور گھاٹ کے بعد داتا صاحب کے مزار والا علاقہ ہی قابل ذکر تھا۔ چنانچہ ایک انگریز سیاح فنچ نامی نے جو ۱۶۱۱ء یعنی جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ساڑھے چھ ماہ کے قریب لاہور میں ٹھہرا رہا، اسی ترتیب سے اس مواضع کا ذکر کیا ہے۔ گو وہ مسجد شکر گنج کہتا ہے، بجائے مسجد گنج بخش کے" ۱

حضرت داتا صاحب ظہیر الدولہ سلطان ابراہیم بن مسعود بن محمود کے عہد حکومت میں واصل الی اللہ ہوئے تھے اور اسی سلطان نے حضرت کا مزار تعمیر کرایا تھا اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت کے ساتھ جو دو قبریں ہیں وہ شیخ احمد حمادی سرخسی اور شیخ ابو سعید ہجویری کی ہیں۔ ۲ واللہ اعلم بالصواب۔

---

۱ مقدمہ کشف المحجوب از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ص: ۷۔۶

۲ تحقیقات چشتی: ص: ۱۴۵،۶

حضرتِ مجدد اور اُن کے مکتوبات

امام ربانی مجددِ الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی، نقشبندی، سرہندی قدس سرہٗ السامی۔ (متوفی ۱۰۳۴ھ) کے مکتوبات شریفہ، کتب تصوّف میں نہایت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ نے ان کو مجدّ دانہ شان اور مجتہدانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔اور ان میں بیان فرمودہ اسرار و معارف کو ملاحظہ کر کے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ حضرت شیخ اس فن میں درجۂ امامت و مقام اجتہاد[ا] پر فائز ہیں۔

مکتوبات قدسیہ میں زیادہ تعداد ایسے مکاتیب کی ہے، جو مسائل شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت پر مشتمل ہیں۔اور بعض میں مصلحانہ اور مجدّ دانہ انداز میں جادۂ شریعت سے ہٹے ہوئے صوفیۂ خام کی غلط روش اور ان کے ناپسندیدہ افعال پر تنقید کی گئی ہے۔علماءِ سوء کی جاہ پسندی سے اسلام کو جو نقصان عظیم پہنچ رہا تھا، اس پر اظہار تاسف کیا گیا ہے۔اکبر بادشاہ اور اس کے ملحد امراء کے کفریہ عقائد کی وجہ سے دین مبین پر جو مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں، ان کے دفعیہ کے لیے امراء علماء اور صوفیہ کو متوجہ کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے میل جول سے مسلمانوں میں جو قبیح رسوم رائج ہو گئی تھیں، ان سے اجتناب اور بدعت کو محو کر کے سنت کو زندہ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔غیر مقلد شیخ مبارک کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کے ملحدانہ خیالات اور ناپاک

[ا] مسائل تصوّف میں

عزائم کے اثرات بد، روافض، خوارج، نواصب و دیگر فرق باطلہ کے بُرے عقائد کے مفاسد و مضار کے استیصال کی کوشش کی گئی ہے۔ تفضیلیہ کو اہل سنت و جماعت سے خارج بتایا گیا ہے۔ عقائد اہل سنت پر پختگی سے کاربند رہتے ہوئے حضرات اہل بیت، شیخین، ختنین اور جملہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی محبت و احترام کا سبق دیا گیا ہے۔ غرض کہ سیکڑوں مسائل شریعت و طریقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ہر مکتوب کا لب لباب یہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے ہر شعبہ پر مکمل طور پر نافذ کیا جائے۔ شریعت کو طریقت پر مقدم رکھا جائے، جو طریقت مخالفِ شریعت ہے، وہ الحاد و زندقہ ہے۔ [1]

حضرت شیخ مجدد علیہ الرحمۃ والغفر ان کی تصانیف اور علوم و معارف کے مختلف مدارج ہیں۔ اور مکتوبات شریف میں بھی یہ مدارج موجود ہیں، جو مکاتیب تبلیغی اور دعوتی ہیں، وہ عام فہم ہیں اور جو مسائل تصوّف پر لکھے گئے ہیں، ان میں سے بعض بہت زیادہ دقیق ہیں...... اس سلسلے میں شیخ بدر الدین سرہندی [2] رحمہ اللہ کا تبصرہ نہایت

---

[1] حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تجدیدی کارناموں کی اہمیت و عظمت، تب ہی پورے طور پر واضح ہو سکتی ہے، جبکہ اکبری دور کے ملحدانہ عقائد اور ماحول سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کر لی جائے، اس موضوع پر محب محترم پروفیسر محمد اسلم صاحب استاذ شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقی کتاب ''دین الٰہی اور اس کا پس منظر'' جو حال ہی میں دہلی اور لاہور سے شائع ہوئی ہے کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ فاضل مؤلف نے اس دَور کے متجددین بالخصوص شیخ محمد اکرام کے مجدّد صاحب پر اعتراضات کے شافی جوابات دے دیے ہیں۔ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ اور دین اسلام کی بڑی خدمت کی ہے جزاہ اللہ۔ ۱۲

[2] شیخ بدر الدین سرہندی خلیفہ حضرت شیخ مجدد کے حالات کے لیے (۱) حضرات القدس دفتر دوم اور روضۃ القیوم ملاحظہ ہو۔

بصیرت افروز ہے وھو ھذا:

"واضح ہو کر مبداء فیاض سے باطن شریف آنجناب پر جو کچھ معارف واسرارِ مخصوصہ وارد ہوتے تھے، ان کی چند قسمیں ہیں:

ایک قسم ایسی ہے کہ آنجناب قدس سرہ' کبھی ان کو زبان فیض ترجمان پر نہ لائے، اور رمز واشارہ سے بھی کبھی ظاہر نہ کیا۔ مثلاً تاویل مقطعات و متشابہات قرآنی کہ آنجناب پر منکشف ہوئے تھے۔

دوسری قسم وہ ہے کہ ان کا اظہار صرف اپنے صاحبزادوں سے خاص طور پر فرمایا، دوسرے اشخاص کو اس میں شریک نہیں فرمایا، اور نہ ہی وہ معرض تحریر میں لائے گئے۔

تیسری قسم کے وہ معارف ہیں، جن کو آپ نے اپنے ان مریدوں سے جو محرمانِ راز و کاملین اصحاب تھے، بیان کیا۔ اور ان کے اظہار کے وقت خلوتِ خاص ہوتی تھی اور دروازے بند کر لیے جاتے تھے، اور اگر اتفاقاً کوئی اور شخص آجاتا تو سکوت اختیار فرماتے اور روئے سخن بدل دیتے اور بقیہ اسرار کو اور کسی وقت بیان فرماتے تھے۔ یہ معارف حتی الامکان تحریر نہیں کیے جاتے تھے۔ مگر جب کوئی محرم راز التماس کرتا تو یہ لحاظ اجابت سوال ایسے طریقے سے تحریر فرماتے کہ ہر کوئی شخص اس کا ادراک نہ کر سکے۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ بہ التماسِ سائل یا بہ نیتِ افادۂ طالبان عموماً و
شمولاً تحریر کیے گئے۔ رسائل و مکاتیب دفاتر ثلثہ وافر البرکات
ان ہی اسرار قسم چہارم پر مشتمل ہیں اور ہر معرفت دل کے
بیماروں کے لیے شفا اور مہجوروں کے لیے وصال ہے۔"[1]

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

نیز آپ کے رسائل مثل "مبداء و معاد" اور "معارف لدنیہ" کہ
آپ کے احوال و مقامات خاصہ کو متضمن ہیں...... اور رسالہ
"مکاشفات غیبیہ"۔ رسالہ "اثبات النبوت" رسالہ "آداب
المریدین" "شرح رباعیات حضرت خواجہ"۔ "تعلیقات اور
"رسالہ درردِ شیعہ" وغیرہ بھی اسرارِ قسم چہارم میں سے ہیں۔"

اس کے بعد قسم چہارم کی پُر معارف تصانیف، جن میں مکاتیب قدسیہ بھی
شامل ہیں، کے علو شان اور ان کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

"بہ لحاظ مطالب کی باریکیوں اور عبارتوں کے دقائق اور اسرار کی
تحقیق اور حالات و اشارات کی تدقیق کے، آں جناب قدس
سرہٗ کے علو شان اور رفعت مکان و بلندی مراتب پر کرامت
ساطعہ اور آیۂ قاطعہ ہیں۔ کشف حقائق الٰہی میں جو کچھ
باریکیاں اور نازک بیانیاں آں جناب قدس سرہٗ نے کی ہیں۔
اکابر علماء و مشائخ اس کے شیفتہ ہیں۔ اور جو کچھ دقائق متعلق بہ

---

[1] حضرات القدس مترجم اردو دفتر دوم ص ۱۰۸

حضرات خمس اور توحید وجودی و شہودی اور مشاہدہ و مکاشفہ اور ایقان وایمان، غیب و بیان، اطوار سبعہ وظہور انوار مختلفہ وتجلیات متکیفہ وغیر متکیفہ وجمع بین التشبیہہ والتنزیہہ، وتنزیہہ صرفہ اور خفاءِ باقی، اطلاق ومحال، تعینات تجلی برقی ودوامی ومعاملہ وراء تجلی، سُکر صحو وعلوم وراثت وغیر وراثت اور ولایت کی قسموں کی تحقیق یعنی صغریٰ وکبریٰ وعلیا ومقام نبوت ورسالت وصدیقیت وقربت وتدلّی وتدنّی ومحبت وخلّت اور درجات سبعہ متابعت وحد صباحت وملاحت وجمع درمیانِ ہردو اور سیر آفاقی وانفسی اور سیر ماوراء آفاق وانفس میں آنجناب نے بیان فرمائے ہیں، وہ عقل مندوں پر ظاہر وہویدا ہیں۔ صرف یہی علوم ومعارف جو تحریر فرمائے گئے، وہ علو مقال، فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے مرتبہ اعجاز میں داخل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ابنائے روزگار اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں...... اور جب خلوت میں زبانِ الہام ترجمان سے بیان کرتے تھے، تو اور ہی حال وارد ہوتا تھا۔ گویا مرقومات "قال" ہیں۔ اور ملفوظات "حال" وبیان معرفت ہیں اور یہ انتقاءِ نسبت واعطا نعمت ہیں۔"[1]

شیخ بدرالدینؒ کے بیان بالا کے مطابق خواجہ محمد ہاشم کشمی نے بھی مکتوبات کو قسم چہارم کے اسرار ومعارف میں شمار کیا ہے[2]...... حقیقت یہ ہے ولایت کے بلند

---

[1] حضرات القدس: دفتر دوم ص ۱۰۹۔

[2] زبدۃ المقامات فارسی: مطبوعہ نولکشور۔ ص ۱۲۴

درجات ''بقاباللہ'' اور ''ظہور من اللہ'' پر فائز شخص جس کی پرواز ہمیشہ بلند رہتی ہو۔ اور ہر آن اس پر حقائق الٰہیہ منکشف رہتے ہوں، وہ اپنے مقام سے ارادۃً خواہ کتنا بھی نزول کر کے اسرار و رموز بیان کرے، وہ پھر بھی علماء ظاہر اور ابتدائی مدارج کے صوفیہ کے فہم و ادراک سے بالا ہوں گے۔ اگر چہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مکتوبات اسرار قسم چہارم میں سے ہیں۔ لیکن ان میں بیشتر وہ مکاتیب بھی شامل ہیں، جن میں تیسری قسم کے اسرار و معارف مندرج ہیں۔ جیسا کہ تیسری قسم کے معارف کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مگر جب کوئی محرم راز التماس کرتا تو بہ لحاظ اجابت سوال ایسے طریقے سے تحریر فرماتے کہ ہر کوئی شخص اس کا ادراک نہ کر سکے۔''

اس قسم کے دقیق اور عسیر الفہم مکاتیب کے بارے میں حضرت شاہ احمد سعید مجددی رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

> ''فہمیدن تدقیقاتِ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نہایت مشکل است کسیکہ در علوم ظاہریہ ید طولانی داشتہ باشد و سلوک و مقاماتِ مخصوصہ آں جناب ہم بوجہ لائق نمودہ، البتہ اُورا مناسبتے بہ فہم آں معارف پیدا خواہد شد و اِلّا فلا...... ایں فقیر مکتوبات قدسی آیاتِ ایشاں را از جناب شاہ صاحب قبلہ (شاہ غلام علی دہلوی متوفی ۱۲۴۰ھ) خواندہ و سال ہا در خدمت ایشاں حل مواضع مغلقہ آں موقوف نہ داشتہ فی الجملہ قدرت در حلِ آں بدست آوردہ است از دیگراں چہ گویند''[1]

---

[1] مناقب احمدیہ و مقامات سعیدیہ مولفہ شاہ محمد مظہر مجددی مطبوعہ ۱۲۸۲ھ در اکمل المطابع دہلی۔ ص ۱۳۶

مکتوبات کی تعداد اور ترتیب وتدوین کی کیفیت

پہلا دفتر ''درالمعرفت ۱۰۲۵'' کے تاریخی نام سے موسوم ہے، اس میں ۳۱۳ مکتوبات ہیں۔اس دفتر کو خواجہ یار محمد جدید[1] بدخشی طالقانی رحمہ اللہ مرید حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے ۱۰۲۵ھ میں جمع کیا۔مکتوب ۳۱۳ میں حضرت شیخ مجدد کا ارشاد نقل ہے کہ اس دفتر کو اسی مکتوب پر ختم کریں اور ۳۱۳ کے عدد کی رعایت کریں، کیونکہ پیغمبران مرسل، صحابۂ اہل بدر کی تعداد کے مطابق ہے۔ اور دفتر دوم کے دیباچے میں تحریر ہے:

''چوں جلد اوّل مکتوبات بہ عددِ سہ صد و سیزدہ ۳۱۳ مکتوب رسید حضرت ایشاں سلمہ اللہ تعالیٰ فرمودند کہ برہمیں عدد ختم کنند کہ موافق عدد پیغمبران مرسل است صلوت اللہ تعالیٰ علی نبینا وعلیہم ونیز موافق عدد اہل بدر است رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تبرکاً وتیمنا برآں عدد ختم نمودہ آمد''

مکتوب ۳۱۳ میں جو خواجہ محمد ہاشم کشمی رحمہ اللہ کے نام ہے۔اس میں لکھا ہے کہ اس کے بعد صاحبزادہ محمد صادق علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۰۲۵ھ فرزند اکبر حضرت مجدد قدس سرہٗ کے وہ تین عریضے، جوانہوں نے حضرت مجدد کی خدمت عالیہ میں لکھے

---

[1] ان کے نام کے ساتھ ''جدید'' اس لیے لکھتے ہیں کہ ان کے ہم نام ایک اور بزرگ ان سے قبل حضرت شیخ کے مُرید ہو چکے تھے۔فرق و امتیاز کی خاطر مرید سابق کو ''قدیم'' اور ان کو ''جدید'' لکھتے ہیں، طالقان ایران کے ایک شہر کا نام ہے۔

تھے، وہ بھی شامل کر دیے جائیں، تا کہ ان عرائض کے پڑھنے والے صاحب زادہ محمد صادق کے حق میں دعائے خیر کریں۔ حضرت کے ارشاد گرامی کے مطابق دفتر اوّل کے آخر میں یہ تین عریضے بھی شامل کر دیے گئے۔

دوسرا دفتر جس کا تاریخی نام ''نور الخلاق'' ہے۔ اس میں اسماء حسنیٰ کے مطابق کل ۹۹ مکتوبات ہیں۔ اس دفتر کے جامع خواجہ عبدالحی ابن خواجہ چاکر حصاری (رحمہما اللہ) ہیں۔ جناب مرتب دیباچہ دفتر دوم میں لکھتے ہیں کہ اس دفتر کی تدوین و ترتیب کا کام میں نے حضرت خواجہ محمد معصوم (متوفی ۱۰۷۹ھ) کے حکم سے کیا ہے......

دفتر سوم کے دیباچے میں لکھا ہے:

''چوں آں جلد بہ نود ونہ مکتوب رسید کہ مطابق اسماءِ حسنیٰ است
برہماں ختم شد ورسالے (سال) کہ تاریخ آں از ''نور الخلائق''
ہویدا است''

تیسرا دفتر ''معرفت الحقائق'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے جامع خواجہ محمد ہاشم کشمی برہان پوری رحمہ اللہ مُرید حضرت امام ربانی قدس سرہٗ ہیں۔ انہوں نے اس دفتر کو حضرت امام ربانی کی خدمت میں رہ کر مدوّن کیا۔ اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مطابق عددِ سورِ قرآنی ۱۱۴ مکتوبات ہیں، سال اتمام جلد ثالث لفظ ''ثالث'' سے برآمد کیا ہے۔ مگر واقعۃً اس دفتر میں ۱۲۴ مکاتیب ہیں۔ اور بعض نسخوں میں کم ہیں مطبع نولکشور کے چھٹے ایڈیشن میں صرف ۱۲۲ ہیں۔ اور ایک میں ۱۲۳۔

اس دفتر کے مکتوب ۱۱۵ کے حاشیہ میں حضرت مولانا نور احمد مرحوم محشی مکتوبات لکھتے ہیں:

''بداں کہ در خطبۂ ایں جلد مصرح ست کہ جملہ مکاتیب ایں جلد یک صد و چہاردہ اند مطابق عدد سور قرآنی، پس این نہ مکاتیب اخیرۂ ایں جلد شاید بعد ازاں بمعرض تسوید آمدہ باشد و ملحق شدہ فافہم واللہ اعلم''۔ [1]

پھر مکتوب ۱۲۴ کے حاشیہ میں یہ لکھا ہے:

''بداں کہ ایں مکتوب در بعضے نسخ خطیہ یافتہ شد فالحقناہ وجعلناہ خاتمۃ المکاتیب و حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ نسبت بایں مکتوب فرمودہ اند کہ آں مکتوب داخل جلد ہائے مکتوبات قدسی آیات نہ شدہ''۔ [2]

حضرت شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مکتوب ۱۲۴ حقیقت کعبہ کے اسرار کے بیان میں ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی مضمون کا ایک خط مرزا امان اللہ برہان پوری کے نام لکھا ہے۔ اس میں اپنے والد گرامی کے مذکورہ بالا مکتوب کا حوالہ دیتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے:

حضرت ایشان ما...... قَدَّسَنَا اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ بِسِرِّہِ الْاَقْدَسِ.

در مکتوبیکہ داخل سہ جلد مکتوبات نیست، نوشتہ اند......'' [3]

حضرت مولانا نور احمد نے حضرت خواجہ کے اس ارشاد سے یہ اخذ کیا ہے کہ

---

[1] دفتر سوم (معرفۃ الحقائق) حصہ نہم: مکتوب ۱۱۵۔ ص ۱۰۴، طبع امرت سر

[2] دفتر سوم (معرفۃ الحقائق) حصہ نہم، مکتوب ۱۲۴۔ ص ۱۴۶ طبع امرت سر۔

[3] مکتوبات خواجہ محمد معصوم: مطبوعہ ۱۸۸۷ء در مطبع نظامی کانپور مکتوب ۲۴۔ ص ۴۱

یہی مکتوب خاتمۃ المکاتیب ہے جو شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ لیکن سمجھنا یہ چاہیے کہ دفتر سوم کے جو ۱۲۴ مکتوبات ہیں، ان میں یہ شامل نہیں۔

دفتر سوم کے ساتھ ملحق ہونے والے مکاتیب کے بارے میں دفتر سوم کے جامع خواجہ محمد ہاشم کشمی رحمہ اللہ کا بیان بہت واضح ہے۔ وھوھذا

"بعد از اتمامے جلد ثالث ومہجوریٔ اینده از آستان بعضے مکاتیب دیگر کہ شروع دفتر چہارم بود بہ ظہور آمدہ بودو ہنوز بہ چہاردہ مکتوب نہ رسیدہ کہ آں ماہ چہاردہ آسمان قطبیت رو درنقاب مغرب تراب کشیدہ قَدَّسَ اللّٰہُ تَعَالٰی سِرَّہُ الْاَنْوَر وَنَوَّرَ مَضْجَعَہُ المعطر بحرمۃ سید البشر والصلوۃ والسلام علیہ وعلی الہٖ واصحابہٖ واَحِبَّائِہٖ الی یوم المحشر ناچار آں مکتوب راداخل جلد ثالث نمودہ شد[۲]۔"

خواجہ محمد ہاشم کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں یہ سمجھنا چاہیے کہ تین مکتوب اور بھی ہیں، جو مکتوبات کے اکثر خطی نسخوں میں شامل نہیں ہو سکے، واللہ اعلم بالصواب ......اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جس اہتمام کے ساتھ حضرت شیخ کی زندگی میں مکتوبات کے تین دفتروں کو محفوظ کیا گیا۔ بعد میں معرض تسوید میں آنے والے مکاتیب کو اس اہتمام کے ساتھ جملہ خطی نسخوں کے آخر میں شامل نہیں کرایا جا سکا، وگرنہ کسی نسخہ میں کم اور کسی ء میں زیادہ کا معاملہ نظر نہ آتا۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ اور صاحب

---

[۱] دفتر سوم کی تکمیل کے بعد یہ سرہند شریف سے چلے گئے تھے۔

[۲] زبدۃ المقامات مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔ ص ۲۴۱

"روضۂ القیومیہ" خواجہ کمال الدین محمد احسان اللہ کے بیانات جو آیندہ اوراق پر نقل ہوں گے۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خاتمۃ المکاتیب وہ مکتوب ہے جو امرت سر والے ایڈیشن اور پیش نظر ترجمہ میں نمبر ۱۲۳ بنام نور محمد تہاری ہے۔ مگر مولانا نور احمد نے مکتوب ۱۲۴ کو جو انہیں بعد میں ملا، خاتمۃ المکاتیب قرار دیا ہے۔ یہ تقدم و تاخر بے اہتمامی کی دلیل ہے۔

ہر سہ دفتر مکتوبات شریف کی کل تعداد ۵۳۶ ہے۔ پہلے دفتر کے بیس مکتوبات وہ ہیں جو حضرت شیخ مجدد نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۰۱۲ھ) کی خدمت میں ارسال کیے، دو مکتوب حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے نام ہیں۔ اور ان کے بیٹے مولانا نور الحق کے نام ایک طویل مکتوب ہے۔ ایک جہانگیر بادشاہ کے نام لکھا ہوا ہے۔ دو مکتوب کسی معتقد خاتون اور ایک ہردے رام ہندو کے نام ہے، جہانگیر کے دربار کے ممتاز اُمراء اراکین کے نام بہت زیادہ خطوط ہیں، جن میں سے خان خاناں، خانِ اعظم، خانِ جہاں، مرزا داراب خاں، قلیج خاں، خواجۂ جہان، لالہ بیگ اور سید فرید بخاری گورنر لاہور کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امراء میں سے سب سے زیادہ خطوط نواب سیّد فرید بخاری کے نام میں۔ بقیہ اپنے فرزندان گرامی قدر، مریدین، معتقدین، معاصر علماء اور مشائخ کو لکھے ہوئے ہیں۔

مکتوبات مختصر مضامین پر مشتمل بھی ہیں اور اکثر بے حد طویل مباحث کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ طویل مکتوبات رسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حضرت مجدد کے انداز تحریر اور زور بیان کا یہ عالم ہے کہ فیضان نسبتِ فاروقی کے دھارے بہ رہے ہیں۔ ہر ایک سطر سے عیاں ہوتا ہے کہ رگ فاروقی جنبش میں اور غیرت ایمانی جوش میں ہے۔

استدراک

جناب ملک حسن علی صاحب، بی۔اے جامعی نے لکھا ہے:

''آخری مکتوب ۱۲۳ جو نور محمد تہاری کے نام ہے، بعض مبصرین [1] اسے جعلی اور مصنوعی قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس مضمون اور مکتوب کی بعض باتیں خلاف شرع اور خلاف مشرب حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔[2]''

ملک صاحب جو علامہ ابن تیمیہ کی تعلیمات کے عاشق صادق ہیں، نے محض اپنے ذاتی خیالات و معتقدات کی بنا پر اس پُر حقائق و معارف مکتوب کو جعلی اور خلاف شریعت لکھ دیا ہے۔ ملک صاحب کو یہ مکتوب اس لیے خلاف شریعت نظر آیا کہ اس میں مدارج ولایت بیان کرتے ہوئے حضرات ائمہ اثنا عشر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو قطبیت کے درجۂ خاص پر فائز تسلیم کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان حضرات کے بعد حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ مقام و منصب عطا ہوا۔ اور تا ایں دم تمام واصلین و کاملین کو ان ہی کے ذریعے فیض پہنچتا ہے۔ اور شیخ مجدد رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت شاہ جیلان قدس سرہٗ کے نائب مناب ہیں۔ یہ حقائق حضرت غوثِ اعظم رحمہ اللہ علیہ کی بیت۔

---

1. راقم نے ملک صاحب کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ اُن ''مبصرین'' کے نام بتائیے، جنہوں نے اس مکتوب کو جعلی اور خلاف شریعت قرار دیا ہے؟ ملک صاحب نے جواب میں لکھا کہ ''مولانا کریم بخش صاحب پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اپنی کتاب تعلیمات امام سنت میں یہ تحقیق پیش کی ہے''...... ایک مولوی کریم بخش ''مبصرین'' ہو گئے یا للعجب!

2. تعلیمات مجددیہ: ص ۴۸

اَفَلَتْ شُمُوسُ الْاَوَّلِیْنَ وَشَمْسُنَا

اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرُبُ

(ترجمہ: پہلوں کے آفتاب غروب ہو گئے اور ہمارا آفتاب

انتہائی بلندیوں پر ہے، اور کبھی غروب نہ ہو گا۔)

کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ کے ''نظریہ مخدومیت''[1] اور ''توحید خالص'' کے قائل شخص کو ایسی باتیں ضرور خلاف شرع نظر آئیں گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے کو جملہ سلاسل کے اولیاء اللہ اور علماء اہل سنت نے تسلیم کیا ہے۔ اور تمام مشائخ سلسلۂ مجددیہ نے شیخ مجدد قدس سرہٗ کے اس کلام کو دل و جان سے مانا ہے۔ اور کسی نے بھی حضرت کے اس خط کو جعلی اور خلاف شریعت قرار نہیں دیا صاحب ''روضۃ القیومیہ'' اور حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ نے اس مکتوب کے ظہور میں آنے کا سبب بتایا ہے۔ پہلے ''روضۃ القیومیہ'' کی تصریح ملاحظہ ہو۔

---

[1] شیخ ابن تیمیہ حرانی کے ''نظریہ مخدومیت'' پر علامہ مناظر احسن گیلانی نے خوب تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ''مقالات احسانی'' مطبوعہ کراچی۔ اس نظریہ کے تحت حضرت شیخ مجدد کے اکثر وہ نظریات جن کی بنیاد کشف و مشاہدے پر ہے، غلط ٹھہرتے ہیں۔ اور ان کی کرامات و خوارق عادات جو ان کے خلفاء نے بیان کی ہیں، وہ بے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور دیگر تحقیقات بھی علامہ کی ''نکھری ہوئی توحید'' کے معیار پر ہرگز پوری نہیں اُترتیں۔ چنانچہ علامہ مسعود عالم ندوی نے جرأت زندانہ سے کام لیتے ہوئے صاف لکھا ہے:

''تصوّف و سلوک و تزکیہ کے بارے میں عاجز نے مطالعہ کے بعد اور

انشراح صدر کے ساتھ ایک مسلک اختیار کیا ہے۔ اپنی طبیعت و مزاج کے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

''ایام مرض (وفات) میں ایک روز آں حضرت نے فرمایا کہ آج حضرت غوث الاعظم تشریف فرما ہو کر فرماتے ہیں کہ لوگ میرے اس شعر

اَفَلَتْ شُمُوْسُ الْاَوَّلِیْنَ وَشَمْسُنَا
اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرُبُ

کے معنوں کی بابت حیران ہیں...... اگر آپ اس کا حال لکھیں تو آپ کو اس مرض سے صحت ہو جائے گی۔ چونکہ حضرت قیوم اول رضی اللہ عنہ کو لقائے پروردگار کا شوق بہت تھا۔ اس لیے بہ کثرتِ شوق آپ آب دیدہ ہوئے۔ اور یہ دعا اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الاَعْلٰی بار بار پڑھتے اور فرماتے کہ طبیب کہہ دے کہ تم لاعلاج ہو تو میں بہت سا روپیہ راہ خدا میں صرف کروں۔ مرضِ موت میں آں حضرت نے قیوم ثانی معصوم زمانی کو وصیت فرمائی کہ مذکورہ بالا شعر کا حل ضرور لکھنا اور خود زبان مبارک سے اس کی

(حاشیہ گزشتہ صفحہ)

لحاظ سے صرف امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کی نکھری ہوئی توحید دل کو لگتی ہے اور تو اور ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کے ہاں بھی کمزوری محسوس ہوتی ہے''۔

(دیباچہ مکاتیب سید سلیمان ندوی بنام مسعود عالم ندوی مطبوعہ لاہور ص ۱۴) حق یہ ہے کہ مسعود عالم ندوی صاحب نے جملہ مقلدان ابن تیمیہ کے ضمیر کی ترجمانی کر دی ہے۔ اور جب معیار قائم کر لیا گیا ہے تو حضرت مجدد کا نام کیوں لیا جاتا ہے؟

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من اندازِ قدت را می شناسم

تشریح کردی۔ حضرت قیوم ثانی رضی اللہ عنہ نے آنجناب کی اس وصیت کو آپ کی عزاداری کے دنوں میں پورا کیا اور مکتوبات کی تیسری جلد میں داخل کر دیا۔ چنانچہ اس جلد کے اخیر میں درج ہے۔ جو مکتوب شیخ نور محمد تہاری کے نام ہے...... اس کے بعد آں حضرت کو چند روز کے لیے صحت ظاہری نصیب ہوئی جو صحت میں بھی حاصل نہ تھی۔"[1]

اب حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ کے اپنے بیان پر غور کیا جائے۔ وھوھذا:

درایام نقاہت مرض پیشین می فرمودند کہ من مستغرق کمالات اہل بیت رسول علیہ وسلم ودراں ضعفہا با کمال استبشار بیان می فرمودند کہ مرا در باغ اہل بیت سر دادہ اند و بہ عجائب و غرائب آں موطن مشرف می سازند و شطری ازاں در معرض اظہار، نیز آوردند و بعضے خصائص و کمالاتِ حضرت امیر را کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کہ دیدۂ فکر و وہم اندیشہ ازاں خیرہ در راہ است، مشروح ساختند وہم چنیں کمالاتِ حضرتِ فاطمہ زہرا و حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم بیان نمودند، علیٰ ہذ القیاس کمالات سائر دوازدہ ائمہ را فرمودند، بدیں تقریب کمالات و خصائص حضرات شیخین و حضرت ذی النورین را بیان نمودند ونسبت و منزلت ہر کدام ازیں خلفائے اربعہ واہل بیت

---

[1] روضۃ القیومیہ

را بآں سرور علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ الصلوٰۃ والسلام مشروح ساختند وبعضے از خدمات شائستۂ خود را کہ بوقوع آمدہ نیز درمیان آوردند وقدرے از کمالات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی راہم بیان کردند، چنانچہ درمرض اخیر ایں ذرّہ حقیر را وصیت بہ نوشتن بعضے ازیں اسرار کہ قابل اظہار بود، نمودند۔ چنانچہ ایں فقیر بہ مقتضائے وصیت درایام عزای آں حضرت بحسب فہم قاصر خویش باچشم گریاں ودل ریش مُوجہہ روضۂ منورہ نشستہ آں دُرہائے ناسفتہ رادر سِلک نظم (یعنی ترتیب دادہ) کشید وداخل مکتوبات قدسی آیاتِ آں حضرت گردانید۔ چنانچہ ختم مکتوبات بہ ہماں مرقومات مقرر گشت[1]"

مؤلف روضۃ القیوم کی صراحت اور خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ کی شہادت سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا ہے کہ اس مکتوب شریف کے معارف حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے بیان فرمودہ ہیں اور خواجہ محمد معصوم نے حسب وصیت ان کو مرتب کر کے مکتوبات کے آخر میں شامل کردیا تھا۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت کا یہ مکتوب بالکل آخری ہے۔ لہٰذا اسے سب سے آخر میں درج ہونا چاہیے اور حضرت شیخ قدس سرہٗ کا یہ کلام اس وقت کا ہے جبکہ آپ کے مدارج علیا عین نقطۂ عروج پر تھے...... اس خط کو جو

---

[1] مکتوبات خواجہ محمد معصوم مکتوب ۱۹۳۔ ص ۳۷۷ (مطبوعہ مطبع نظامی کانپور)

نور محمد تہاری[1] کے نام لکھا گیا ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے کبھی حضرت غوث اعظم کی مذکورہ صدر بیت کے معنی دریافت کیے ہوں گے۔ لہٰذا ان ہی کو مکتوب الیہ قرار دے دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت نے کسی اور جگہ ان معارف کو بیان کیا ہے یا نہیں؟

''مکاشفات غیبیہ''[2] مجدد الف ثانی رحمہ اللہ مرتبہ خواجہ محمد ہاشم کشمی، جس کے شروع میں جامع نے لکھا ہے کہ ''معارف آں اوراق از علوم سابقہ اند''......اس کے مکاشفہ ۱۶ کے اندر مشروح ہے:

> ''باید دانست کہ واصلانِ ذات ازیں بزرگواران کہ بہ ''افراد'' مقلب اند نیز اقل قلیل اندو اکابر صحابہ وائمہ اثنا عشر از اہل بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بایں دولت فائض اندو از اکابر اولیاء اللہ قطب غوث الثقلین قطب ربانی محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی است قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس بایں دولت

---

[1] شیخ نور محمد کے حالات روضۃ القیومیہ میں بایں الفاظ مرقوم ہیں! ''آپ آنحضرت رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہیں، سلوک باطنی حاصل کر کے خلافت پائی۔ تیسری جلد کا آخری مکتوب آپ کے نام لکھا گیا ہے، جس میں مرض موت کے وقت حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شعر کی جو شرح بیان فرمائی، مندرجہ ہے۔ (ص ۳۳۹) بعض مکتوبات میں آپ کے نام کے ساتھ ''تہاری'' لکھا ہے۔ مگر روضۃ القیومیہ مترجم اور بعض دوسری کتابوں میں ''بہاری'' تحریر ہے۔ بہاری صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] سب کتابوں میں ''مکاشفات غیبیہ'' نام لکھا ہے۔ مگر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب کا خیال ہے ''عینیہ'' صحیح ہے۔

ممتاز اند و دریں مقامِ شانِ خاص دارند کہ اولیاء دیگر ازاں خصوصیت قلیل النصیب اند ہمیں امتیاز فصلے باعث علوشان ایشاں شدہ است۔ فرمودہ اند قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ......
اگرچہ دیگراں راہم فضائل و کرامات بسیار است اما قرب ایشاں باآں خصوصیت از ہمہ زیادہ تر است، در عروج آں کیفیت کسے بہ ایشاں نمی رسد، باصحاب وائمہ اثنا عشر دریں باب مشارک اند۔ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ، وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ [1]"

حضرت شیخ مجدد رضی اللہ عنہ کے اس مکاشفہ کے نقل کیے جانے کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم اس مسئلے میں چند اور بزرگوں کے حوالے اور آراء نقل کی جاتی ہیں۔ تاکہ ثابت ہو جائے کہ یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے نامور خلیفہ اور بانی سلسلہ آدمیہ حضرت سیّد آدم بنوری رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۵۳ھ) نے اپنی تصنیف "خلاصۃ المعارف" میں وہی کچھ لکھا ہے، جو اُن کے مرشد نے ارشاد فرمایا ہے۔ [2]

---

[1] مکاشفات عیبیہ (عینیہ) شائع کردہ ادراہ مجددیہ کراچی۔ ص ۴۰۔

[2] خلاصۃ المعارف بحوالہ مکتوبات شاہ فقیر اللہ نقشبندی شکار پوری۔ ص ۲۰۵...... خلاصۃ المعارف ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کے مخطوطات بھی کم یاب ہیں۔ اس کی پہلی قسم (جلد) میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے، جس کے ۱۶۴ اوراق ہیں۔ محولہ بالا مضمون دوسری قسم (جلد) میں مسطور ہے۔ جیسا کہ پہلی قسم کے ورق ۱۳۲ پر لکھا ہے:

"بیان ایں چہار ولایت در باب دوم در فصل دوم در قول ثانی از قسم ثانی ایں کتاب واضح و مفصل شدہ است"

خلاصۃ المعارف کا ایک قلمی نسخہ ذخیرہ شیرانی دانش گاہ پنجاب نمبر ۳۴۱۲ ف ۴۰۷ میں بھی موجود ہے۔ مگر میں یہ نسخہ اس وقت دیکھ نہیں سکا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے ''المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیہ'' میں اپنے مشاہدے کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۲۲۵ھ) نے حضرت شاہ صاحب کے کلام کی تائید و تشریح اس طرح کی ہے:

''آں چہ حضرت شیخ در قطبیت ائمہ اثنا عشر نوشتہ ایں مضمون را حضرت امام ربانی قطب صمدانی حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ در شرح بیت حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ نوشتہ این ست۔ بیت:

اَفَلَتْ شُمُوْسُ الْاَوَّلِیْنَ وَشَمْسُنَا

اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرُبُ

وفقیر آں را در ''شمشیر برہنہ'' (تصنیف قاضی صاحب) نوشتہ''[1]

سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے عظیم پیشوا شاہ غلام علی دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفیٰ ۱۲۴۰ھ) نے حضرت شیخ مجدد کے اس مکتوب کا خلاصہ شیخ مجدد کے حوالے سے بیان کیا ہے۔[2]

عارف باللہ شاہ فقیر اللہ علوی نقشبندی شکار پوری رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۹۵ھ

---

۱ مجموعہ وصایا اربعہ مرتبہ محترم پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔اے، شائع کردہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد ص ۶۵۔۴۹

۲ درالمعارف فارسی (ملفوظات شاہ غلام علی) مرتبہ شاہ رؤف احمد شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ گجرات ضلع مظفر گڑھ۔ صفحہ ۲۳۱۔ اور شاہ صاحب نے اسی مکتوب کا خلاصہ رسائل سبع سیارہ میں اپنے قلم سے نقل کیا ہے۔

کے مکاتیب میں مکتوب ہفتم، ہشتم وچہل ونہم اسی مسئلے پر ہیں اور ہر مکتوب ایک رسالے کی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

حاجی فضل اللہ نقشبندی قندھاری قدس سرہ الباری (متوفی ۱۲۳۸ھ) نے اپنی تالیف ''عمدۃ المقامات'' (فارسی) میں حضرت شیخ مجدد کے زیر بحث مکتوب کی عبارت نقل کر کے اس مسئلے کو موکد کیا ہے۔[2]

اس مسئلے پر نقشبندی صوفیہ کی متعدد تحریریں اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ جن کے حوالے طوالت کا باعث ہوں گے۔ لہٰذا ذیل میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے ارشادات نقل کر دینے کافی سمجھتا ہوں۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۹۵ھ) فرماتے ہیں:

''صوفیۂ اہل سنت بر قطبیت دوازدہ امام صلوٰۃ اللہ علیہم متفق اند۔''[3]

یہ ملحوظ رہے کہ جس طرح اہل رفض نے حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات اور تعلیمات کو اپنی کتابوں میں بالکل غلط انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ائمہ اثنا عشر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعلیمات کو تبدیل کر دیا ہوا ہے۔ اور لاتعداد من گھڑت روایتیں ان کی طرف منسوب کر دی ہوئی ہیں۔ مگر اہل سنت و جماعت ان کے دعویٰ حب اہل بیت اور ان کی وضعی روایات کے پس منظر سے پورے طور پر واقف ہونے کی بنا پر، ان پر کان نہیں دھرتے اور اہل بیت

---

[1] مکتوبات شاہ فقیر اللہ مطبوعہ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور

[2] عمدۃ المقامات شائع کردہ خانقاہ مجددیہ ٹنڈو سائیں داد (حیدرآباد) مطبوعہ ۱۳۵۵ھ ص ۱۴۰

[3] مقامات مظہری مؤلفہ شاہ غلام علی دہلوی، مطبوعہ مطبع احمدی دہلی ۱۲۶۹ھ۔ ص ۱۲۸

رسول (ﷺ) اور اولاد علی رضی اللہ عنہم کی محبت کا دم بھرتے ہیں...... یہ بھی واضح رہے کہ صوفیہ کے عقائد پر تاریخ اثر انداز نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے مشاہدات و مکاشفات کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور حصول فیوض اور وصول مقام قرب ان کے مد نظر رہتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۲۳۹ھ) کا محدثانہ وصوفیانہ ارشاد ملاحظہ ہو۔

"نیز ائمہ پسیں مثل حضرت سجاد و باقر و صادق و کاظم و رضا ہمہ مقتدایان و پیشوایان اہل سنت بودہ اند کہ علماء ایشاں مثل زہری وامام ابوحنیفہ و امام مالک تلمذ از آنجناب کردہ اند وصوفیۂ آں وقت مثل معروف کرخی وغیرہ از آنجناب فیض اندوختہ و مشائخ طریقت سلسلہ آنحضرات راسلسلۃ الذہب نامیدہ و محدثین اہل سنت زاں بزرگواراں در ہر فن خصوصاً در تفسیر وسلوک دفتر، دفتر احادیث کردہ......"[1]

مندرجہ بالا ارشاداتِ اولیاء و علماء جملہ اہل سنت کا عقیدہ ہیں۔ البتہ! نواصب کے لیے ضرور خلاف شریعت ہیں۔

مکتوبات کی مقبولیت

فارسی زبان میں تصوف کی سب سے پہلی مستند کتاب حضرت شیخ علی ہجویری

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ مطبوعہ مطبع حسنی دہلی ۱۲۷۱ھ۔ ص ۴۸۱

معروف بہ داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی قریب ۴۹۰ھ[1]) کی ''کشف المحجوب'' ہے اور اس کو جو مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی، وہ اظہر من الشّمس ہے۔ اس کے ۵۳۵ سال بعد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے والی کتاب مجموعہ مکاتیب حضرت مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہ کو وہی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ اوّل الذکر تصنیف منیف پاک و ہند کے اولین مبلغ و داعی اسلام پر وارد شدہ رموز و اسرار طریقت و حقیقت و معرفت کا بیش بہا گنجینہ ہے، تو ثانی الذکر یہاں کے مجدد اسلام کے بیان فرمودہ حقائق شریعت و طریقت کا بہترین مجموعہ اور دقائق و غوامضِ حقیقت و معرفت کا نہایت اعلیٰ خزینہ ہے...... پاک و ہند، ماوراء النہر، اور دیار عرب کے علماء و فضلاء اور اصفیاء و عرفاء نے اسے مرشد طریق قرار دیا۔ قریباً پونے تین سو سال تک طالبان حق اس کے خطی نسخوں سے مستفید و مستفیض ہوتے رہے اور دل دادگان تصوف و معرفت اور سالکانِ ہویّت بجہ اپنی عمر عزیز کے قیمتی اوقات اس کی نقول لینے میں صرف کرتے رہے، چنانچہ اس کے خطی نسخے بہت جلد عالم اسلام میں پھیل گئے تھے۔

مطابع وجود میں آ گئے تو مکتوبات قدسیہ کو متعدد مطابع نے طبع کر کے شائع کیا۔ اور سب سے بہتر طریق پر حضرت مولانا الحاج نور احمد نقشبندی مجددی امرتسری علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۳۴۸ھ) مرید و مجاز شیخ العرفا حضرت شاہ ابوالخیر مجددی دہلوی قدس سرہٗ (متوفی ۱۳۴۱ھ) نے نہایت تصحیح اور بلیغ تحشیہ کے ساتھ نو حصوں میں منقسم کر

---

[1] حضرت داتا گنج بخشؒ کا سال وصال عام طور پر ۴۶۵ھ مشہور ہے، لیکن کشف المحجوب کی عبارتیں اس کے خلاف شہادتیں پیش کرتی ہیں۔ اس مسئلے میں عبدالحی حبیبی نے بڑی عمدہ تحقیق کی ہے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ طبقات صوفیہ امالی خواجہ عبداللہ انصاری مطبوعہ افغانستان۔

کے ۱۳۲۷ھ تا ۱۳۳۴ھ میں امرت سر سے طبع و شائع کیا۔ حق یہ ہے کہ مولانا مرحوم نے یہ عظیم کارنامہ سرانجام دے کر حضرت امام ربانی سے اپنی سچی عقیدت اور روحانی تعلق کا حق ادا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ احسن الجزا۔[1]

مکاتیب کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر عربی میں اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ کتب خانہ اوقاف بغداد شریف میں دو عربی ترجموں کے خطی نسخے موجود ہیں:

۱۔ تعریب المکتوبات الصوفیہ۔ لاحمد النقشبندی الفاروقی ۶۷۷۲ = ۲۱×۱۴ اس مؤلفہ الشیخ یونس النقشبندی۔

مجلد...... ابتداء:......

الحمدللہ ربّ العٰلمین...... وبعد فیقول اسیر الذنوب سمی صاحب الحوت...... طالما کنت اطلب مجلدات رسائل غوث المحققین...... احمد النقشبندی...... ولما ظفرت وبعد مدۃ......[2]

۲۔ مکاتیب الشیخ احمد النقشبندی ۴۷۵۲-۲۸×۱۸ س۔

---

[1] مولانا نور احمد کے مصححہ و محشی یہ مکتوبات ۱۹۶۴ء میں دوبارہ نور کمپنی انار کلی لاہور نے چھاپ دیئے ہیں، ان کے شروع میں مولانا کے حالات زندگی و خدمات علمی کا اجمالی تعارف۔ میرا لکھا ہوا موجود ہے، میں نے مولانا کے حالات پر ایک کتاب بھی لکھی ہے، جو آں مرحوم کے فرزند مخدومی مولانا محمد سلیمان کی عدم توجہ کی بنا پر حلیہ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی۔

[2] الکشاف عن مخطوطات خزائن الاوقاف صفحہ ۱۳۶ تالیف محمد اسعد طلس مطبوعہ مطبعہ العالی بغداد ۱۳۷۲/1953 منشور مدیریہ الاوقاف العامۃ ببغداد

انشأها الشيخ احمدالنقشبندی الاحراری.

رسائل بعث بها الٰی بعض الصوفیه. اولها مکتوب فی بیان احوال تناسب اسم الظاهر و الظهور قسم خاص من التوحید و بیان عروجات وقعت...... کتبه الی مرشد الکبیر...... الشیخ محمد بن الباقی النقشبندی الاحراری۔[1]

(۳) تیسرا ترجمہ علامہ محمد مراد مکی کا ہے۔ اس ترجمے کی مقبولیت اور اس کے اثرات پر علامہ مناظر احسن گیلانی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

"سلسلہ مجددیہ کی ایک بڑی شاخ خالدیہ سلسلہ کے نام سے عراق و شام عرب خصوصاً ترکی مما لک میں بہت زیادہ مقبول ہوئی اور ہے۔ نیز آپ کے "مکاتیب طیبہ" خود براہ راست اُن مما لک میں بکثرت پڑھے گئے اور پڑھے جاتے ہیں، جہاں کے باشندے فارسی زبان سمجھتے ہیں اور جو اس زبان سے ناواقف ہیں۔ ان تک آپ کے مکتوبات عربی اور اُردو زبانوں میں پہنچائے گئے۔ غالباً روس کے رہنے والے ملا مراد جو مہاجر ہو کر بالآخر مکہ معظمہ میں رہ پڑے تھے، انہوں نے مکاتیب کا ترجمہ عربی میں کیا۔ اور مصری ٹائپ میں چھپ کر سارے عربی مما لک میں پھیل گیا۔ یہ خداداد بات تھی کہ اس کے بعد حدیث و

---

[1] ایضاً۔ ص ۱۴۸، ۱۴۹

تفسیر میں جتنی اچھی کتابیں لکھی گئیں، ان میں ایسی معتد بہ کتابیں مل سکتی ہیں، جن میں ''مکتوبات'' کے مضامین نقل کیے گئے ہیں خصوصاً عصر جدید کی مشہور تفسیر ''روح المعانی'' جو سلطان عبدالحمید خاں مرحوم خلیفہ ترکی کے عہد میں لکھی گئی، اس میں علامہ شہاب محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے گویا اس کا التزام کر رکھا ہے۔ کہ جہاں بھی ذکر کا موقع میسر آئے، وہاں 'قال المجدد الفاروقی رحمۃ اللہ علیہ'' کے نام سے وہ آپ کے خاص خاص نظریات اور جدید تعبیرات کو پیش کرتے ہیں اور بڑے افتخار و ناز سے پیش کرتے ہیں، اہم مسائل کے تصفیہ میں سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔''[1]

پھر اردو تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اردو ترجمہ پیش کرنے کی ایک کوشش مولوی محمد حسین ابن مولوی قادر بخش ساکن احمد آباد ضلع جہلم نے کی، اس ترجمے کا پہلا حصہ ''الطاف رحمانی ترجمہ اردو مکتوبات امام ربانی'' کے نام سے مولوی امام الدین تاجر کتب راولپنڈی نے ۱۳۱۴ھ میں طبع کیا، جو صرف پہلے بیس مکتوبات کا ترجمہ ہے۔ اس کے اگلے حصے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔

مولوی عبدالرحیم نائب مدیر اخبار وکیل امرت سر نے مکتوبات کے ترجمے کا کام شروع کیا تھا، پہلا حصہ خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام لکھے گئے مکتوبات کو

---

[1] مضمون ''ہزارہ دوم یا الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' مشمولہ تذکرہ مجدد الف ثانی، مرتبہ محمد منظور نعمانی، مطبوعہ کتب خانہ الفرقان، لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ص ۲۸

چھوڑ کر آگے کے ۷ امکتوبات کے ترجمہ اور تشریحی حواشی پر مشتمل تھا، جو روز بازار اسٹیم پریس امرت سر میں ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوا مگر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا...... "گنجینۂ انوار رحمانی اردو ترجمہ مکتوبات امام ربانی" کے نام سے ابتدائی چالیس مکتوبات کا ترجمہ اسلامی دکان کشمیری بازار لاہور نے ۱۳۳۰ھ میں چھاپا تھا۔ مگر یہ کام بھی یہیں رُک گیا...... مکمل مکتوبات شریف کا اُردو ترجمہ پیش کرنے کی سعادت مولانا عالم دین نقشبندی مجددی کے حصے میں آئی۔ ان کے مترجمہ مکتوبات اللہ والے کی قومی دکان، لاہور سے دوبار شائع ہو کر نایاب ہو چکے ہیں۔

کئی حضرات نے مکتوبات قدسیہ کے فارسی اردو انتخاب اور خلاصے شائع کیے۔ اس انداز کا سب سے اچھا کام شاہ ہدایت علی نقشبندی مجددی مرحوم (متوفی ۱۳۷۰ھ) کا ہے۔ انہوں نے دُرلا ثانی، کے نام سے مکمل مکتوبات کی اُردو تلخیص کی جسے "اعلیٰ کتاب خانہ" کراچی نے "انتخاب مکتوبات" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں دوبارہ شائع کیا۔ غرض کہ علماء اور صوفیہ نے مکتوبات پر بہت زیادہ کام کیا ہے۔

مکتوبات کی ایک غیر مطبوعہ فارسی شرح "ضیاء المقدمات فی توضیح المکتوبات" در دو جلد از مولوی ضیاء الدین اچکزئی (متوفی شصت سال قبل) شارح کے فرزند مولوی محمد ساکن قصبہ نوزاد ضلع قندھار کے پاس محفوظ ہے۔[۱] مولانا شمس الدین[۲]

---

۱ مکتوب حاجی عبد الغنی قندھاری بنام راقم الحروف۔

۲ مولانا شمس الدین نوراللہ مرقدہ کو حضرت شیخ مجدد قدس سرہٗ کی تعلیمات سے عشق تھا۔ انہوں نے تصوف اور بالخصوص سلسلہ مجددیہ کی نادر و نایاب کتابوں کو بڑے شوق سے جمع کیا تھا۔ اگر مولانا اس وقت زندہ ہوتے تو میں ان کے کتب خانے سے کما حقہ فائدہ اُٹھاتا۔ وَکَمْ حَسَرَاتٍ فِی بُطُوْنِ الْمَقَابِرِ۔

رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۷ھ) تاجر کتب نادرہ لاہور کے ذاتی کتب خانے میں دو ایسی کتابیں میں نے دیکھی تھیں، جن میں مکتوبات قدسی آیات کی روایات کی تخریج کی گئی ہے۔ان دو میں سے ایک کا نام ''تشئیذ المبانی فی تخریج احادیث مکتوبات امام ربانی'' حافظے میں محفوظ رہ گیا ہے۔

بایں ہمہ ابھی مزید کام کی ضرورت ہے۔ حضرت شیخ مجدد کے کشوف اور متشابہہ کلام پر اعتراضات کے سلسلے میں خاص طور پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر نقشبندی بزرگوں نے اگرچہ بہت کچھ لکھا ہے، مگر تحقیق سے زیادہ عقیدت سے کام لیا گیا ہے۔[1] اعزیزی محمد اقبال مجددی سلمہ اللہ مکتوب الیہم حضرات کے

---

[1] چند مکتوبات کی بعض عبارتوں پر اعتراضات کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو ناکافی سمجھ کر براہ راست معترضین کی کتب کو دیکھنے کی کوشش کی۔ معارج الولایت (قلمی) مخزونہ دانش گاہ پنجاب نسخہ ذخیرہ آذر ورق ۵۸۶ ب، بیعد میں معاندانہ اور گستاخانہ انداز میں جو کچھ جمع کیا گیا ہے، وہ دیکھا۔ اور فہرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ کے ذریعے سید محمد برزنجی اور ابو علی حسن بن علی عجمی مکی کے رسائل کے بے ہودہ مضامین سے آگاہی حاصل کی تو اندازہ ہوا کہ اس موضوع پر سیکڑوں صفحات لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ مقدمہ ان مباحث کی طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ توفیق ایزدی شامل حال رہی تو اس موضوع پر پھر کبھی لکھا جائے گا۔ اس موقع پر برزنجی کی تحریرات کی حقیقت واضح کرنے کے لیے فہرست مذکور میں درج، ملخص رسالہ کی ایک عبارت نقل کی جاتی ہے:

''درسال یک ہزار و نود وسہ ہجری در شہر جمادی الآخرہ از ہندوستان......
خیالات شیخ احمد سرہندی بطور استفتاء در دیار عرب رسید کہ اُدو دعویٰ
رسالت کردہ است'' (فہرست مشروح بعض کتب نفیسہ قلمیہ حصہ دوم

(بقیہ اگلے صفحہ پر

حالات زندگی جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ خدا کرے کہ وہ جلد از جلد اپنی اس تحقیقی کتاب کو منظر عام پر لاسکیں، ان کی یہ پیشکش خاصے کی چیز ہوگی۔ انشاء اللہ...... حضرت مجدد الف ثانی نے بڑی فراخ دلی سے اپنی بعض ابتدائی تحقیقات سے رجوع فرمایا ہے۔ مثلاً دفتر اوّل حصہ سوم کے مکتوب ۲۰۹ میں مبداء و معاد کی ایک عبارت سے

(حاشیہ گزشتہ صفحہ)

مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی۔ مطبوعہ دار المطابع سرکار عالی حیدر آباد ۱۳۷۵ھ۔ ص ۳۶۳، ۳۶۴

نوٹ: یہ فہرست فارسی میں لکھی گئی ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ برزنجی کے رسالے کا رڈ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے ''الکلام المنجی فی ایراد البرزنجی'' کے نام سے لکھا تھا۔ برزنجی نے ایک نہیں، دس رسالے لکھے تھے۔ اور یہ علامہ کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ برزنجی کے آخری دو رسائل ۱۰۹۳ء میں معرض تسوید میں آئے اور علامہ ۱۰۶۷ میں وفات پا چکے تھے۔

حضرت شیخ محقق علامہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ مجدد سے عارضی طور پر کچھ اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ جو جلد ہی رفع ہو گئے۔ اس پر بھی مفصل گفتگو کی ضرور ہے اس لیے کہ بعض متجددین شیخ عبدالحقؒ کے عقیدت مند نہ ہونے کے باوجود اس مخلصانہ اور برادرانہ ''اختلاف'' کو ''خلاف'' بنا کر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ شیخ اور مجدد صاحب ہم عقیدہ اور پیر بھائی تھے۔ اس مقام پر یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے ''حیات شیخ عبدالحق'' میں شیخ کا وہ رسالہ جس میں مجدد صاحب پر تنقید کی گئی ہے۔ معارج الولایت سے لے کر شامل کیا ہے۔ اس کا متن مخدوش ہے۔ محققین کو شیخ عبدالحق کا وہ رسالہ تلاش کرنا چاہئے جو اغلاط سے پاک ہو۔

رجوع کا اعلان کیا ہے۔[1] اسی طرح اور مکاتیب میں بھی بعض کشفی تحقیقات سے رجوع فرمایا ہے۔ ان رجوع نمودہ عبارات کی نشان دہی کی ضرورت ہے۔ اور بعض کشفی مشاہدات آخر عمر میں ابتدائی مشاہدات سے قدرے مختلف یا واضح ہو گئے ہیں، اس پر بھی کام ہونا ضروری ہے اور یہ تبدیلی خیالات اُن کے مدارج عالیہ میں ہر دم عروج و ترقی کی بنا پر ہے۔

اُردو ترجمے کی ضرورت

حضرت مولانا نور احمد مرحوم کے محشی مکتوبات کی اشاعت ثانی سے عربی اور فارسی کے ماہرین کے ذوق کی تسکین کا سامان تو ہو گیا ہے۔ مگر اُردو ترجمے کی نایابی کی بنا پر فارسی سے ناواقف لوگ حضرت امام ربانی کے فیوض و برکات علمیہ اور معارفِ لدنیہ سے بہرہ یاب ہونے سے محروم ہیں۔

اکبری دور کی پیدا کردہ بداعتقادیوں اور بداعمالیوں اور ہمارے زمانے کے دینی اور اعتقادی فتنوں میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس زمانے کے ''لُصوصِ دین''[2] اکبر دور کے ''لُصوصِ دین'' کے زلہ ربا اور خوشہ چین ہیں۔ اُس وقت

---

[1] رجوع کی قوت صرف عظیم انسانوں میں ہوتی ہے، چھوٹے آدمی رجوع کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ حضرت شیخ مجدد کا رجوع کرنا جہانگیر سے ٹکر لینے سے زیادہ ہمت کا کام ہے۔

[2] لُصوص ''لص'' کی جمع ہے۔ جس کے معنی ڈاکو اور چور کے ہیں۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں...... طالب علمانِ بے باک (آزاد خیال علماء) از ہر فرقہ باشند لصوصِ دین اند، اجتناب از صحبت ایں ہا نیز از ضروریات دین است'' (دفتر اوّل مکتوب ۲۱۲) بددینوں سے اجتناب کرنے والوں کو تنگ نظر کہنے والے حضرت شیخ مجدد کے اس ارشاد پر غور کریں۔

اگر تارکِ تقلید ملا مبارک اور اس کے ملحد و زندیق بیٹے ابوالفضل اور فیضی دین اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف تھے تو آج ان کے شاگردان رشید دین کے نام پر دین میں تحریفات کرنے میں کوشاں ہیں۔ مسٹر غلام احمد پرویز، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور کانگرسی ملاؤں کے ممدوح و مربی مسٹر مسعود سابق ناظم محکمہ اوقاف کی مکروہ تحریروں اور کارروایوں سے اہل حق کے دل مجروح ہیں اور اسی قبیل کے لُصوصِ دین کا ایک بہت بڑا گروہ پیدا ہو چکا ہے۔ شیخ محمد اکرام جو سرسید کے مکتبہ فکر سے متعلق ہیں، نے بھی اپنی کتابوں کے ذریعے اہل حق کو بدنام کرنے کی پوری پوری سعی کی ہے۔

گر بگویم شرح ایں بیحد شود [1]

مکتوبات قدسی آیات ہیں ہر دور اور ہر ملک کے مسلمانوں کے ہر طبقے کے لیے تعلیمات و ہدایات موجود ہیں۔ جس دور میں یہ لکھے گئے تھے وہ چونکہ ہمارے دور سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، اس لیے ان میں خاص طور پر ہمارے لیے فوز و فلاح کی تعلیم موجود ہے۔ اس بے دینی والحاد کے دور میں جب کہ بد اعتقاد لوگ گمراہ کن لٹریچر بہ کثرت پھیلا چکے اور پھیلا رہے ہیں...... مجدد اعظم کی تحریر بلاشبہ تریاق کا حکم رکھتی ہیں۔

مقام صد شکر ہے کہ ہمارے فاضل دوست حضرت مولانا محمد سعید احمد نقشبندی مجددی زید علمہ و مجدہ نے فارسی سے ناواقف لوگوں کو حضرت شیخ مجدد کی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لیے مکمل مکتوبات شریف کا ترجمہ کرنے کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

---

[1] ان ہی لوگوں میں سے ایک پروفیسر محمد حبیب ہیں۔ جو ہندوستان میں ان کی نیابت کا حق ادا کر رہے ہیں۔

فاضل مترجم نے حضرت سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۲ھ) ساکن حضرت کیلیانوالہ خلیفہ ارشد شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شرق پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۳۴۸ھ) سے روحانی فیض پایا ہے۔ ظاہری علوم کے بھی ماہر ہیں۔ دار العلوم نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہ چکے ہیں۔ چھ سات سال سے دار العلوم حزب الاحناف لاہور میں صدر مدرس کے منصب پر فائز ہیں۔ اولیاء کرام کی ان پر خصوصی توجہ ہے۔ کئی برس تک مسجد شاہ محمد غوث قادری لاہوری قدس سرہٗ میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اب حضرت داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ کی مسجد مبارک میں امامت وخطابت کے فرائض باحسن وجوہ انجام دے رہے ہیں۔

سلسلہ نقشبندیہ سے نہیں والہانہ عقیدت ہے۔ تعلیمات صوفیہ علیہ بالخصوص افادات مجددیہ کی اشاعت میں کوشاں رہتے ہیں۔ مولانا نور احمد کے محشی مکتوبات دوبارہ ان ہی کی تحریک ومساعی سے زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہیں۔ انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی سے ان کی کاپیاں اور پروف پڑھے اور پلیٹیں بھی دیکھیں......

حضرت امام غزالی قدس سرہٗ کی تصانیف بدایۃ الہدایہ اور منہاج العابدین کے انہوں نے ترجمے کیے ہیں، جو طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا قابل ذکر ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ جناب ملک حسن علی صاحب جامعی کی کتاب ''تعلیمات مجددیہ'' کے جواب میں ''مسلک امام ربانی'' لکھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ دو ہزار کا ایڈیشن چند مہینوں میں ختم ہو گیا۔ اب یہ کتاب دوبارہ مع اضافات کے آرہی ہے۔[1]

---

[1] ملک صاحب مسلکاً غیر مقلد ہیں۔ انہوں نے مجدد صاحب کے نام پر علامہ ابن تیمیہ کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے ''تعلیمات مجددیہ'' لکھی ہے۔

جناب فاضل مترجم کی علمی کاوشوں اور روحانی نسبتوں کے ذکر کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ قارئین کرام کو اطمینان ہو جائے کہ مترجم حضرت امام ربانی اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے قوی نسبت رکھنے کی وجہ سے کلام مجدد کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے علم اور نسبت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ جناب مترجم ان دونوں نعمتوں سے سرفراز ہیں۔

اس عظیم وقیم کتاب کی طباعت کے لیے بھی کسی بہت اچھے ادارے کی ضرورت تھی۔ بہ فضل ایزدی یہ مسئلہ بھی از خود حل ہو گیا۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی جو بہترین کتابوں کو خوبصورتی اور نفاست سے چھاپنے میں گوئے سبقت لے گئے ہے۔ کے مالک محترم حکیم محمد تقی صاحب اشرفی اس کو بہ صد ذوق وشوق چھاپ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جناب مترجم کی یہ کوشش مقبولیت دوام کا درجہ حاصل کرے اور قارئین کو عمل کی توفیق ملے۔ جناب ناشر بھی جزائے خیر سے نوازے جائیں۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم۔

یہاں عزیزی محمد اقبال مجددی سلمہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ آں عزیز نے کئی نایاب کتابیں اپنے کتب خانے سے لا کر مجھے دیں اور بعض حوالے تلاش کرنے میں میری مدد کی۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

محمد موسیٰ عفی عنہ

لاہور

یکم محرم الحرام ۱۳۹۰ھ

حضرت سید برکت علی امرتسری

حضرت سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ جس مرتبے اور مقام کے عارف، جس درجے کے بااخلاق بزرگ، جس شان کے مخلص اور اہل درد انسان تھے، اس کی نسبت سے ان کے فضائل وکمالات اور ان کی اعلیٰ وارفع زندگی اور بہترین وبے نظیر مثالی کارناموں کو بیان کرنے کے لیے ایک مبسوط ومفصل کتاب کی ضرورت ہے۔

ع سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

تعارفِ خاندان:

حضرت شیخ سید محمد[۱] غوث حلبی جیلانی قدس سرہ العزیز کو پاک وہند میں سلسلہ عالیہ قادریہ کا مبلغ اول تسلیم کیا جاتا ہے، آپ رمضان المبارک ۸۷۷ھ میں حلب سے اوچ پہنچے۔ آپ اپنے وقت کے بڑے عالم دین اور ولی کامل تھے، بے شمار لوگ آپ کی تبلیغ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ۹۲۳ھ میں ہوا مزار مقدس ''اوچ گیلانیاں''[۲] میں مرجع عوام وخواص ہے۔

۱۔ آپ کا اسم گرامی ''محمد'' تھا۔ غوث وقت ہونے کے باعث آپ کے نام کے ساتھ غوث لکھا جاتا تھا۔

۲۔ اوچ کے جس حصے میں ''بخاری'' بزرگوں کے مزارات ہیں، اسے اوچ بخاریاں کہتے ہیں۔ اور جس جانب گیلانی حضرات محو خواب ابدی ہیں، اسے ''اوچ گیلانیاں'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ سید محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ اوچی دسویں پشت میں حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں، ان کے چار صاحب زادے تھے:

(۱) سید عبدالقادر ثانی (۲) سید عبداللہ ربانی

(۳) سید مبارک حقانی (۴) سید محمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ سید محمد کے فرزند ثالث حضرت سید مبارک حقانی[۱] رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے سید میراں شمس الدین اوچ سے نقل مکانی کر کے لاہور پہنچے اور یہاں سے خلچیاں (ضلع امرت سر مشرقی پنجاب) میں جا کر مقیم ہو گئے، آپ کی اولاد کے پاس جو قلمی یادداشتیں محفوظ ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ حضرت میراں سید شمس الدین قدس سرہ جہانگیر بادشاہ کے ابتدائی دور حکومت میں خلچیاں آئے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶۰۵ء میں خلچیاں پہنچے ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میراں سید شمس الدین[۲] کے چھوٹے صاحب زادے کا اسم گرامی میراں علی محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ سید شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ چند سال بعد موضع تلواڑہ[۳] میں

۱۔ حضرت سید مبارک حقانی رحمۃ اللہ علیہ لاہور آئے ہوئے تھے کہ آخری وقت آ پہنچا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی نعش مبارک کو لاہور سے ''اوچ'' لے جا کر دفن کیا گیا۔ آپ کا سال وصال ۹۵۶ھ ہے۔ (حدیقۃ الاولیاء: مفتی غلام سرور، مطبوعہ نولکشور، صفحہ ۸)

۲۔ حضرت میراں شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ کے دو فرزند تھے، بڑے بیٹے کا نام ولی محمد شاہ تھا جو لاولد فوت ہو گئے، دوسرے فرزند حضرت میراں علی محمد شاہ تھے جن کے چار فرزند تھے۔ سید سیف الدین عرف میراں شاہ جی، سید عالم شاہ، سید محمد شاہ، سید شاہ مقیم (رحمہم اللہ) حضرت سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت میراں سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔

۳۔ یہ گاؤں خلچیاں سے چند میل کے فاصلے پر برلب دریائے بیاس واقع ہے۔

جا کر گوشہ نشین ہو گئے اور میراں سید علی محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے خلچیان ہی میں سکونت رکھی، آپ کا مزار پرانوار بھی یہیں ہے جو ۱۹۴۷ء تک زیارت گاہ عوام وخواص رہا، آپ کی کرامات کا دور دور تک شہرہ تھا۔ آپ کا سالانہ عرس ہمیشہ ساون کی پہلی جمعرات کو بڑی شان وشوکت سے شروع ہوتا اور آٹھویں دن یعنی دوسری جمعرات کو اختتام پاتا اس عرس میں شرکت کے لیے قرب وجوار کے لوگوں کے علاوہ دور دراز کے علاقوں سے بھی عقیدت مند آتے تھے، ملک تقسیم ہو جانے کے ساتھ ہی یہ تمام باتیں کلیتہً ختم ہو گئیں، مگر مزار مبارک اور اس کا احاطہ ابھی تک محفوظ ہے اور اب اس علاقہ کے غیر مسلم، خدا کے اس ولی کے مرقد کا احترام بھی کرنے لگے ہیں۔

حضرت میراں سید علی محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد واحفاد ''خلچیاں'' میں تقسیم پاک وہند تک آباد تھی۔ تقسیم کے بعد یہ لوگ پاکستان چلے آئے اور مختلف مقامات میں آباد ہو کر یکجہتی اور مجتمع قبیلے میں جو برکت وعظمت ہوتی ہے اس سے محروم ہو گئے، یہ سب لوگ اگرچہ اپنے آپ کو ''پیر'' ''سید'' یا ''شاہ'' کہلواتے تھے مگر ان میں سے اکثر کا ذریعہ معاش زمیندارہ ہی تھا اور اس خاندان کے بیشتر افراد بڑی خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن افسوس کہ ان میں بہت کم لوگ تعلیم سے آراستہ تھے۔

ابتدائی حالات:

زمانہ دراز گزرنے کے بعد اس خاندان میں ایک ایسی باعظمت ہستی پیدا ہوئی جس کی نظیر آج اقران واماثل میں نہیں، اس بزرگ انسان کا نام نامی واسم گرامی سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ ہے آپ بماہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ بروز دوشنبہ پیر سید مزمل شاہ کے گھر پیدا ہوئے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ والد ماجد کے سایہ عاطفت سے محروم

ہو گئے۔ آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی۔ والد مرحوم و مغفور بہت تھوڑی زرعی زمین کے مالک تھے، جس کی قلیل آمدنی سے بمشکل تمام گھر کا خرچ چلتا تھا، اس لیے بڑی بڑی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کر کے آپ نے علم حاصل کیا اور حصول تعلیم کے فوراً بعد حصول معاش کے لیے آپ نے مدرّسی کا پیشہ اختیار کیا۔

شجرہ نسب:

حضرت پیر سید برکت علی شاہ قادری چشتی نظامی فخری نور اللہ مرقدہ کا شجرہ نسب بغرض اندراج رسالہ ہذا جناب سید سردار علی شاہ صاحب نے ارسال فرمایا ہے جس کو من و عن نقل کرنا موجب طوالت ہوگا، اس شجرے کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ بیس واسطوں سے حضرت پیران پیر غوث الاعظم شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام میں بغیر عمل اور تقویٰ کے محض نسب کی کوئی حیثیت نہیں حضرت سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اجدادِ کرام میں سے جو لوگ بہت زیادہ معزز و محترم بزرگ سمجھتے جاتے ہیں، وہ صرف اس لیے لائق عزت و احترام ہیں کہ انہیں حسنی الحسینی ہونے کا شرف حاصل ہے، بلکہ اس لیے لائق صد تعظیم اور مستحق صد احترام نہیں کہ وہ متقی و پرہیز گار تھے، ان کی زندگیاں اتباع سنن نبوی ﷺ میں گزری تھیں، تبلیغ اسلام کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا غرضے کہ "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" کے معیار پر پورے اترتے تھے۔

حضرت مولانا محمد رمضان شہید رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

جس گھر تقویٰ وہ ہے اولا　　　یا ہو سید یا ہو گولا (غلام)

اور حضرت عارف جامی قدس سرہ العزیز نے تو فیصلہ ہی فرما دیا ہے:

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

بیعت:

آپ ابتدا ہی سے بہت زیادہ متقی، عابد، زاہد اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ غوث الثقلین حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو غایت درجہ عشق تھا، قادری خاندان کے اوراد و وظائف جو "ابا عن جد" آپ کے ہاں رائج تھے وہ آپ کا معمول تھے، پھر آپ کو بیعت کا خیال پیدا ہوا تو حضرت شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر انوار پر حاضر ہو کر یہاں آنے والے مشائخ کرام کو ملتے رہے اور اکثر مراقبہ کیا کرتے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کس شیخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کی جائے، اس غرض کے لیے آپ کئی دفعہ لاہور آئے چنانچہ یہاں سے حضرت میاں محمد شاہ چشتی نظامی فخری ہوشیار پوری رحمۃ اللہ علیہ[1] کا دامن پکڑنے کا اشارہ ہوا۔

---

[1] حضرت میاں محمد شاہ چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۳۲ھ میں واصل بحق ہوئے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک "بسی تو" (متصل ہوشیار پور مشرقی پنجاب) میں ہے "یار حق خواجہ محمد شاہ" ۱۳۳۲ھ مصرع سال وصال ہے۔ قبلہ میاں صاحب کی سوانح حیات بنام "یاد پیر" از حضرت عمر خان صاحب مرحوم ۱۹۳۰ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی اور مولانا احتشام الدین شوکت عثمانی مرحوم نے آپ کے سلسلہ عالیہ کے بزرگوں اور آپ کے حالات پر مشتمل ایک رسالہ تصنیف فرمایا

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

بالآخر آپ نے حضرت میاں صاحب قدس سرہ سے بیعت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اتفاق سے ان دنوں حضرت موصوف موضع سدھار میں (جو خلجیاں سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے) نزیل تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوکر بیعت کرلی۔

(حاشیہ گزشتہ صفحہ) تھا جس کا نام "سلسلۃ الذہب" ہے، یہ نادرو متبرک رسالہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔ حضرت موصوف بڑے متبع قرآن وسنت بزرک تھے آپ کی پابندی شریعت اور احترام اسلام کا اندازہ ذیل کے واقع سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

بزرگ محترم حکیم حاجی چراغ دین صاحب نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ "میں حضرت میاں صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہوا تو انہوں نے حسب قاعدہ مجھے ضروری نصیحتیں فرمائیں نماز پڑھنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کی، مگر کچھ عرصہ کے بعد باوجود پابندی نماز واوراد کے تھیٹر کی قسم کی محفلوں میں دو چار مرتبہ چلا گیا۔ تو میرے استاد محترم حکیم مولوی فتح الدین رعیوی مرحوم مرید خاص حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چل گیا وہ بہت خفا ہوئے کہ ایسی محافل ومجالس میں ہرگز نہ جانا چاہیے، اسی پر اکتفا نہیں کہ بلکہ جب حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو شکایتاً ان کی خدمت میں بھی عرض کر دیا، اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا" بھلے مانس! تو نے میرے ہاتھ پر شریعت کی پابندی کی بیعت کی تھی مگر اسے تو نے خود ہی توڑ دیا اب اگر تو مجھ سے تعلق رکھنا چاہتا ہے تو پھر از سر نو بیعت کر۔" چنانچہ میں توبہ کرنے کے بعد دوبارہ بیعت ہوا۔"

یہ حکیم صاحب ابھی زندہ موجود ہیں، دو سال ہوئے جب انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا۔

راقم الحروف نے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے کہن سال مریدوں کو دیکھا ہے اور اکثر سے طویل صحبتیں رہی ہیں، سب کو نماز پنج گانہ کا پابند اور دیگر اور ادوظائف کا عامل ہونے کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بہت زیادہ خیال رکھنے والے پایا، حضرت قبلہ کے سجادہ نشین اور خلیفہ اعظم حضرت مولانا الحاج میاں علی خان صاحب مدظلہ العالی ودامت برکاتہم تقسیم ہند کے بعد پاکپتن شریف جا کر مقیم ہوگئے، آپ شیخ طریقت ہونے کے علاوہ عالم دین بھی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دراصل بیعت ہونے سے پہلے ہی ولی اللہ تھے، شیخ کی نظر کیمیا اثر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور بہت تھوڑے وقت میں منازل سلوک طے ہوگئیں، چنانچہ کچھ مدت کے بعد حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کو اپنے ہمراہ دہلی لے گئے، یہاں کے بزرگان عظام رحمھم اللہ کے مزارات مقدسہ کی زیارتیں کرنے کے بعد اجمیر شریف لے گئے، اجمیر میں حضرت خواجہ بزرگ کی درگاہ معلیٰ میں قیام کیا، چند روز قیام کے بعد حضرت میاں صاحب بعد نماز تہجد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ساتھ لے کر حضرت خواجہ غریب نواز کے روضہ اقدس پر حاضر ہوئے اور آپ کو خلافت عطا فرما کر بیعت لینے کی اجازت بخشی۔

حلیہ ولباس:

آپ کا قد درمیانہ، سر بڑا، پیشانی کشادہ، اور رنگ گندمی تھا، رعب وجلال بے حد تھا، آپ کی اہلیہ محترمہ مرحومہ اپنے ہاتھ سے سوت کات کر کپڑا تیار کرواتی تھیں اور آپ اسی نفیس باریک کھدر کے کپڑے سلوا کر زیب تن فرماتے تھے جو آپ کے پیکر نورانی پر بیش قیمت پوشاک سے زیادہ اچھا لگتے تھے۔

خوراک:

خوراک آپ کی نہایت سادہ تھی، گندم یا چنے کی روٹی، نمکین لسی سے کھا کر خوش رہتے۔ مرغن ومچرب اغذیہ سے نفرت تھی، مگر مہمانوں اور مسافروں کے لیے ان کے مذاق کے مطابق کھانا پکواتے لیکن سادگی یہاں بھی مدنظر رہتی۔ صوفی معراج الدین صاحب مقیم حال لائل پور آپ کے مخلص خادموں اور ارادت مندوں میں سے ہیں ان کا بیان ہے کہ:

''میں رمضان شریف میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رات وہیں بسر کی، سحری کے وقت مہمانوں کے لیے گھر سے پراٹھے اور گوشت پکا ہوا آیا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے الگ کھانا آیا اور وہ خود بھی یہیں بیٹھ کر اس طرح کھانے لگے کہ ان کے سامنے جو کھانا رکھا گیا، وہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور آپ کپڑے کے نیچے ہی سے لقمہ لے کر کھاتے جاتے، میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شاہ صاحب کچھ خاص قسم کا کھانا کھا رہے ہوں گے، ادھر میرے دل میں یہ بات آئی اور ادھر شاہ صاحب کسی کام کے لیے کھانا درمیان میں چھوڑ کر باہر گئے، اتنے میں میں نے کپڑا ہٹا کر دیکھ لیا، چنے کی روٹی اور پسا ہوا نمک مٹی کی رکابی میں رکھا تھا، یہ دیکھ کر میں بہت نادم اور شرمندہ ہوا۔''

کسی عارف نے خوب کہا ہے:

محبت حق مجوز کسے کہ طالب نفس خویشتن است
اول شرط عشق خدا، ز حرص و ہوا گریختن است

ذریعۂ معاش:

حضرت پیر سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے حالات اس دور کے عام پیروں اور سجادہ نشینوں سے بالکل مختلف ہیں، آپ نے اپنی اخیر زندگی تک اپنی مشیخت کو کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا، اول تا آخر سکول میں پڑھاتے رہے۔ منڈی رعیہ[1] کے مڈل سکول میں پندرہ سال تک فارسی اور دینیات کے مدرس رہے، اس کے

---

[1] رعیہ منڈی خلچیاں سے قریباً چار میل جانب جالندھر بر لب شاہراہ سوری (گرانڈ ٹرنک روڈ) واقع ہے۔

بعد خلچیاں کے قرب وجوار کے مختلف مواضع میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے سکول کی ملازمت سے جو تنخواہ ملتی تھی یا جدی زمین سے جو معمولی آمدنی ہوتی تھی، اس سے ضروریات زندگی کو پورا فرماتے تھے۔

امرت سر اور جالندھر کے مواضع میں آپ کے ہزاروں مرید تھے اور ان میں سے اکثر صاحب ثروت بھی تھے، ان مریدین معتقدین میں سے بعض نے کئی دفعہ عرض کیا کہ آپ عمر رسیدہ ہیں، اب پڑھانا چھوڑ دیجئے، آپ کی تمام ضرورتوں کا اللہ تعالیٰ کفیل ہے۔ مگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی بھی کسی ایسی پیش کش کو قبول نہ کیا اور مستقل مزاجی سے اپنی روش پر قائم رہے۔

اخلاص وعادات:

آپ بڑے رحیم وکریم اور شفیق تھے، غرباء ومساکین میں رہ کر اور ان سے میل جول رکھ کر بہت خوش رہتے، مرید کے لیے اپنے گھر سے خود کھانا اٹھا لاتے اور اگر اس کا اور بھی کوئی کام کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہ سمجھتے، آپ دور سے آئے ہوئے مرید کو اپنا معزز مہمان جانتے، امراء ورؤسا سے زیادہ تعلقات نہ رکھتے تھے۔

غرباء کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آنا اور امراء وسلاطین کی صحبت سے اجتناب کرنا، ابتدا سے جملہ اولیاء کا شیوہ چلا آیا ہے۔ حضور سرور کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ

بئس الفقیر علیٰ باب الامیر ونعم الامیر علیٰ باب الفقیر۔

یعنی بدترین فقیر وہ ہے جو امیر کے در پر جائے اور بہترین امیر وہ ہے جو فقیر کے آستانے پر حاضر ہو۔

شیخ الاسلام حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سلسلہ کے لوگوں کو ہدایت فرمائی تھی کہ

لو اردتم بلوغ درجة الكبار فعليكم بعدم الالتفات الیٰ ابناء الملوک[1]

یعنی اگر تم اولیائے کبار کے درجے تک پہنچنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ بادشاہوں کی اولاد کی طرف توجہ نہ کرنا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے "انفاس العارفین" میں اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر غازی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو آپ کے ایک مخلص کے ذریعے ملاقات کا پیغام بھیجا، مگر انہوں نے عالمگیر کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا۔ اور پیغام لانے والے کو ایک معمولی کاغذ پر جس میں ان کو جوتا لپٹا ہوا رکھا تھا، حسب ذیل عبارت لکھ کر دے دی:

"اجماع اہل اللہ است برآنکہ بئس الفقیر علیٰ باب الامیر و حق سبحانہ وتعالیٰ فرماید و مامتاع الحیوٰۃ الدنیا الا قلیل جزء اقل بہ شمار سید اگر بالفرض بمن خواہید و جزء لایتجزی خواہد بود برائے ایں جزء لایتجزی نام خود راز دیوان خدائے تعالیٰ چرا بر آرم زیرا کہ در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور ست کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد نام او از دیوان حق سبحانہ بر می آرند"[2]

---

[1] سیر الاولیاء میر خورد: صفحہ ۶۸ بحوالہ برہان، فروری ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۰۳ مضمون مولانا خلیق احمد نظامی

[2] انفاس العارفین: مطبوعہ اسلامی کتب خانہ، ملتان ص ۶۸

یعنی اہل اللہ کا اس پر جماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو امیر کے دروازے پر جائے۔حق سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ ”دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے“ تم کو(اس کا بھی) قلیل ترین جز ملا ہے۔اگر بالفرض تم کچھ مجھے دو گے تو وہ جز ولا یتجزی ہوگا۔اس ٹکڑے کے لیے جو پھر نہ ہو سکے گا، میں اپنے نام کو خدا کے دفتر سے کیوں خارج کراؤں؟ بزرگان چشت کے بعض ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے، حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے۔

حضرت مولانا فخر الدین دہلوی قدس سرہ العزیز متوفی ۱۱۹۹ھ سلسلہ چشتیہ کے بہت بزرگ ہوئے ہیں، ان کے متعلق لکھا ہے کہ بادشاہ وقت اور دوسرے دولت مندوں نے زمینیں اور جاگیریں دینی چاہیں۔تو انہوں نے قبول نہ فرماتے ہوئے یہ ارشاد کیا کہ

”اگر می خواہند کہ مادریں شہر باشیم بار دیگر ایں حرف تمنائے درمیاں نیاید۔“[1]

پھر لکھا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ وقت (سراج الدین ظفر) ملاقات کے لیے آئے اور قلعہ میں تشریف لانے کے لیے عرض کیا۔آپ نے اخلاق کریمانہ کی بنا پر قبول فرمالیا، جب وہاں سے واپس لوٹے تو سید حسن سے فرمایا:

”سید! آج ہم نے اپنے اوقات ایک دولت مند کی ملاقات میں صرف کردیئے اور اس کے ہاں کھانا کھایا۔اب اس کا کیا تدارک کیا جائے؟انہوں نے (سید حسن نے) عرض کیا کہ

---

[1] مناقب فخریہ ص ۱۷

''حضور مجھ سے زیادہ جانتے ہیں'' فرمایا: وہاں جانے کی سزا یہ ہے کہ اس وقت ہم شہر کے درویشوں کو دیکھنے جاتے ہیں اور آپ بہت عمدہ اور لذیذ کھانے پکوا کر فقرا میں تقسیم کر دینا۔ یہ فرما کر آپ روانہ ہو گئے۔''[1]

کتاب ''یادِ پیر'' کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ محمد شاہ چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ بھی امرا اور رؤسا کے ہاں آنا جانا پسند نہیں فرماتے تھے۔ غرضیکہ سلسلہ چشتیہ کے مشائخ عظام اس کے بہت زیادہ پابند رہے ہیں، مگر آج کل کے اکثر و بیشتر چشتیہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

شفقت علی الخلق:

حضرت سید برکت علی شاہ گیلانی قادری رحمۃ اللہ علیہ التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علیٰ خلق اللہ پر صحیح معنوں میں عمل پیرا تھے، احکام الٰہی کی بجا آوری کے ساتھ مخلوق خدا پر اس درجہ شفیق و مہربان تھے کہ شاید ہی آپ کا کوئی مثیل ملے۔ کسی کی مصیبت اور تکلیف کا بیان سننے کی تاب نہ رکھتے تھے، مصیبت زدہ کے منہ سے بات نکلتے ہی آپ مضطرب ہو جاتے اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور مشکل کے حل کرنے کی ظاہری و باطنی کوشش میں اس طرح لگ جاتے جس طرح کہ یہ مشکل و تکلیف خود ان کو یا ان کے کسی جگر گوشے کو ہے۔ راقم الحروف کے دوست صوفی حاجی محمد دین صاحب نے اپنا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ

---

1. مناقب فخریہ فارسی مطبوعہ مطبع احمدی دلی ص ۱۷

''ہمارے گھر میں ایسی نا اتفاقی پیدا ہوئی کہ کئی رشتے منقطع ہو جانے کو تیار تھے۔ اور جدال وقتال تک نوبت پہنچنے کو تھی، کسی طرح یہ معاملہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں آ گیا اور آپ نے کمال تدبر سے فریقین کو خون خرابہ کرنے سے باز رکھا۔ تنازعہ اس قدر الجھا ہوا تھا کہ صلح وصفائی میں دو دن لگ گئے اور اس عرصہ میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پانی تک نہ پیا۔''

حکیم مولوی فتح الدین صاحب رعیوی، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور پیر بھائی تھے، آپ جب فوت ہونے لگے تو یہ وصیت کی کہ

''میری گھوڑی میری طرف سے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دی جائے، تا کہ آپ اس پر سوار ہو کر سکول جایا کریں''۔

حسب وصیت، مرحوم کی گھوڑی آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ آپ نے اسے قبول تو کر لیا مگر اس پر بہت کم سوار ہوتے۔ گھوڑی کی لگام پکڑے پیدل ہی سکول پہنچ جاتے اور اسی طرح واپس آ جاتے۔ سوار اس دن ہوتے جب وقت بہت کم ہوتا۔ محترم صوفی محمد امین صاحب نے عرض کیا: ''قبلہ! آپ گھوڑی پر سوار ہوا کریں۔'' تو آپ نے فرمایا! ''مجھے بلاضرورت اس پر بوجھ ڈالتے ہوئے شرم آتی ہے''۔ دراصل یہ گھوڑی آپ نے صرف اپنے ایک مخلص کی روح کی خوشنودی کے لیے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ورنہ انہیں اس سے کسی قسم کا کچھ فائدہ نہ تھا، بل کہ ان کے لیے تو تکلیف کا باعث بنی رہی، حتیٰ کہ مر گئی۔

حاجی میراں بخش مرحوم جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بڑے سادہ لوح انسان تھے، یہ اپنی بھینس کا بچہ رات کو اندر باندھنا بھول گئے اور وہ سردی کھا کر مرگیا۔ بچے کی موت کے باعث بھینس نے دودھ دینے سے انکار کردیا۔ حاجی صاحب مرحوم نے حضرت شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ واقعہ بیان کیا۔ اور بھینس کے لیے تعویذ عنایت فرمانے کی درخواست کی۔ مگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبع نازک پر یہ واقعہ نہایت گراں گزرا۔ اور اس قدر رنج وقلق ہوا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا:

''وہ بیچارہ کس طرح ٹھٹھر ٹھٹھر کر مرا ہوگا؟''

اور بار بار کہتے رہے:

''اتنی غفلت''''اتنی غفلت!''

حاجی صاحب بیان کیا کرتے تھے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت اس قدر مکدر و پریشان دیکھ کر مجھے بھینس تو بھول گئی۔ اور اپنی فکر دامن گیر ہوگئی کہ اب خیر نہیں، چنانچہ وہی ہوا کہ چند روز بعد مجھے ایک سخت صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

انسانوں اور حیوانوں پر آپ کی ہمدردی اور شفقت کے بے شمار واقعات ہیں، اگر ان سب کو بیان کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔

کمال انسانیت:

محترم حکیم حاجی فقیر محمد صاحب رعیوی مدظلہ (میرے والد ماجد مرحوم کے ہم نام) حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور مقربین خاص میں سے ہیں۔ راقم الحروف نے انہیں لکھا کہ آپ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بابرکات لکھ کر

مرحمت فرمائیں۔تو آپ نے بحالت علالت جواب سے سرفراز فرمایا۔اس مکتوب گرامی میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ من وعن درج ذیل ہے:

''حضرت شاہ صاحب کی مہمان نوازی، رحم دلی کا یہ عالم تھا کہ روزانہ دو چار اور کبھی اس سے بھی زیادہ مسافر آپ کے مہمان ہوتے تھے۔ان میں سے بعض کچھ نہ کچھ ضرور چرا کر لے جاتے،کوئی بستر لے جاتا،کوئی کمبل ہی لے جاتا۔جب پتہ چلتا تو کہتے:''آج جو مسافر آئے گا اسے ہرگز نہیں ٹھہرنے دیں گے۔''لیکن شام کو جب مسافر آتے ،سردی اور رات کو دیکھ کر آپ کو پھر رحم آ جاتا۔اور کچھ نہ کہتے اور کھانا کھلا کر بستر وغیرہ دے دیتے۔''

''تنہائی کو بہت پسند کرتے تھے،لیکن لوگ ایسے اللہ والوں کو اپنی ضرورت کے پیش نظر جہاں کہیں بھی ہوں تلاش کر ہی لیتے ہیں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسجد کی پچھلی طرف ایک چھوٹی سی جگہ تھی، وہاں چھپ کر بیٹھے''دلائل الخیرات''پڑھ رہے تھے اور میں پاس بیٹھا تھا کہ ایک عورت موضع رتن گڑھ (جو خلجیاں سے مغرب کی جانب قریباً ایک میل ہے) سے آئی اور تلاش کرتی ہوئی مسجد کے اس گوشہ تنہائی میں پہنچی جہاں میں (احقر فقیر محمد) اور حضرت قبلہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے تھے،اس عورت نے اپنی کچھ مشکلات بیان کیں تو حضرت بہت گھبرائے اور اسے کہا کہ میں تو بہت چھپتا ہوں لیکن لوگ مجھے تلاش کر ہی لیتے ہیں۔میں کیا کروں؟ کدھر چلا جاؤں؟ایسی ویسی باتیں کر کے اس عورت کو جھڑک دیا وہ بے چاری مایوس ہو کر روتی ہوئی چلی گئی،تھوڑی دیر کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو یہ خیال آیا کہ وہ عورت ایک میل کا سفر کر کے میرے پاس آئی اور

میں نے اسے جھڑک کر واپس کر دیا ہے، تو طبیعت نہایت پریشان اور بے چین ہوئی۔ چنانچہ مجھے کہنے لگے کہ تم یہاں بیٹھو میں ذرا باہر جاتا ہوں۔ آپ اسے اس کے گاؤں کے قریب سے جا کر تلاش کر کے واپس لائے، گھر میں لا کر اس کی منت وسماجت کی اور پھر اس کی خاطر و مدارات کھانے وغیرہ سے کر کے اسے فرمایا کہ "جاؤ۔ تمہیں جو مشکل درپیش ہے اس کا میں ذمہ دار ہوں، اب یہ تکلیف تمہیں نہیں ہوگی"۔

اپنے کیے پر پچھتانا تو سب کا کام ہے اور یہ احساس اس وقت تک رہتا ہے جب تک قلب بالکل سیاہ نہیں ہو جاتا۔ نفس لوامہ برابر احساس دلاتا رہتا ہے مگر اپنی معمولی فروگزاشت کو تسلیم کر کے پھر اسی کی تلافی کرنے کی کوشش کرنا، صرف خاصان خدا ہی کا حصہ ہے صرف یہی ایک واقعہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اور بزرگی کا اعتراف کرنے کے لیے، بہت کافی ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک خاص واقعہ:

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہر گئے ہوئے تھے کہ واپسی پر رات ہوگئی۔ راستے میں ایک گاؤں آیا جہاں آپ کا ایک مرید رہتا تھا، آپ رات گزارنے کی غرض سے اس کے گھر چلے گئے، وہ مرید اتفاق سے بہت غریب تھا، اس نے اپنے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ضیافت کے لیے دو روپے میں دری رہن رکھ کر کھانا پکایا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے نور باطن سے یا کسی اور ذریعے سے حقیقت حال سے آگاہی ہوگئی، تو آپ نے اپنے پاس سے دو روپے مرید کے بچے کو دیئے اور اسی وقت وہاں سے چل کھڑے ہوئے اور "موضع دھولکا" میں مرحوم حاجی خیر الدین کے ہاں جا رہے۔ حاجی صاحب دین دار اور درویش دوست انسان تھے اور شاہ صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی بھی۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حاجی صاحب کے مکان پر پہنچ کر بہت روئے، حاجی صاحب کے استفسار پر بتایا کہ میری اس غلطی کی وجہ سے فلاں میرے ملنے والے کو یہ تکلیف پہنچی۔

اس واقعہ کے بعد آپ نے عام مریدوں کے گھر میں جانا بند کر دیا۔ جب تک کوئی خاص طور پر نہ بلاتا کبھی نہ جاتے اور بلانے والے کی مالی حالت کا جائزہ لے کر جاتے، اگر مطمئن نہ ہوتے تو بطریق احسن ٹال دیتے اور جس کے ہاں جاتے تھے اس سے کہہ دیتے تھے کہ میں یہ کھانے کا عادی ہوں، اور تمہارے ہاں بھی یہی کھاؤں گا۔ (یعنی سادہ خوراک)

آپ نذرانہ قبول کرنے میں بے حد محتاط تھے۔ غیر مرید سے بالکل قبول نہیں کرتے تھے، صاحب استطاعت جو پیش کرتے وہ مہمان خانے میں خرچ کر دیتے ان کا اپنا ذاتی خرچ اتنا کم تھا کہ سکول کی تنخواہ اور زمین کی معمولی آمدنی سے بھی بہت کچھ بچ جاتا اور مسافر نوازی اور غریب پروری میں صرف کر دیتے۔

افسوس کہ آج کل کے اکثر علماء و مشائخ میں یہ خصائص یکسر مفقود ہیں، زبان سے تو دنیا کی مذمت اور دولت سے اظہار نفرت کرتے ہیں، مگر عمل اس کے خلاف ہوتا ہے، اس زمانے کے علماء اور صوفیہ کے حسب حال کسی بزرگ نے خوب فرمایا ہے:

عجبت من شیخی ومن زھدہ

وذکرہ النار واھوا لھا

یکرہ ان یشرب فی فضۃ

ویسرق الفضۃ ان نالھا!

یعنی میں اپنے شیخ اور اس کے زہد کو دیکھتا ہوں اور جس وقت وہ دوزخ اور

اس کے عذابوں کا ذکر کرتا ہے تو میں حیران رہ جاتا ہوں۔ نقرئی برتن میں پانی پینا اس کے نزدیک مکروہ ہے، لیکن اگر وہ چاندی کو کہیں دیکھ پائے تو فوراً چرا لے۔

خاص بات:

احقر راقم السطور کے والد ماجد مرحوم و مغفور سلسلہ چشتیہ میں حضرت مولانا الحاج میاں علی محمد خان صاحب مد ظلہم سے بیعت تھے اور اوراد و وظائف سلسلہ کے سخت پابند ہونے کے ساتھ اس بات کے شدید مخالف تھے کہ عیال دار مرید اپنا کاروبار چھوڑ کر پیر کے پیچھے پیچھے پھرتا رہے۔ کیونکہ آج کل کی مصروفیات کے دور میں رزق حلال کی تلاش اور اس کا حصول سب سے بڑی شے ہے اور عبادات کی جان ہے۔ حضرت پیر سید برکت علی شاہ علیہ الرحمۃ کا بھی یہی مسلک تھا، آپ نے تمام زندگی کسی مرید کو اپنے ساتھ بطور خادم رکھ کر دنیا سے بے تعلق نہیں کیا، چنانچہ میرے ایک محترم اپنے شیخ کے ساتھ ہمہ وقت رہنے لگے تھے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان سے تعلق خاطر تھا۔ آپ نے بہت سمجھایا کہ تم یہ کام چھوڑ دو، اس سے کچھ نفع نہ ہوگا بے شک تمہارا شیخ کامل ہے مگر اس طرح کی صحبت سے کچھ نفع و اثر نہ ہوگا، وہ صاحب قریباً تیس برس اس چکر میں رہ کر اب اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد درست تھا۔

وعظ و تبلیغ:

حضرت شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم دین نہ تھے[1] مگر اسلام کے بنیادی مسائل پر آپ کی بہت گہری نظر تھی اور مطالعہ بہت وسیع تھا، چنانچہ آپ بہ وقت ضرورت وعظ بھی فرماتے تھے۔

---

[1] مگر آج کل کے اکثر مولاناؤں سے زیادہ باخبر تھے۔

خطبہ جمعہ تو خود ہی دیا کرتے تھے، دور دور کے دیہات کے لوگ آپ کے پیچھے نماز پڑھنے آتے تھے۔

شاعری:

شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے وصال کے فوراً بعد آپ کے مرید صادق صوفی معراج دین صاحب معراج حال مقیم لائل پور نے ''برکت پیر'' کے نام سے ایک منثور و منظوم رسالہ شائع کیا تھا جس میں انہوں نے اردو و پنجابی نظموں میں ''مشائخ چشت'' اور اپنے پیرومرشد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس رسالہ کے شروع میں انہوں نے حضرت سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بطور تبرک نقل کیا ہے۔ مگر یہ رسالہ کتابت و طباعت کے اغلاط سے پر ہے۔ حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کو شعر و شاعری سے ہرگز ہرگز وہ تعلق نہ تھا جو ایک شاعر کو ہوتا ہے، انہیں ایسے کام کے لیے فرصت بھی کہاں تھی؟ مگر بعض اوقات اظہار جذبات کے لیے طبیعت شعروسخن کی طرف مائل ہوتی ہے تو پھر بغیر کچھ کہے نہیں رہا جاتا۔ ذیل میں چند اشعار تبرکاً درج کیے جاتے ہیں۔

چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یا نبی! خواب میں گر شکل دکھائی ہوتی — درد فرقت کی گھٹا مجھ پہ نہ چھائی ہوتی!
میں سمجھتا کہ ہوئی مجھ کو ہے جنت حاصل — تیرے دربار میں گر میری رسائی ہوتی
بیٹھا رہتا جو دریار پہ میں بن کے فقیر — تو شہنشاہی سے بہتر یہ گدائی ہوتی!

جگر گوشہ حضرت حسین کے متعلق لکھتے ہیں:

دشت کربل میں شہادت نہ اگر پاتے حسین
حق پرستوں کی نہ پھر راہنمائی ہوتی

حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ کی حاضری پر چند مدحیہ اشعار کہے تھے، ان میں سے دو شعر یہ ہیں:

مہاراج غریب نواز دھنی خواجہ چشت نگر کے والریا
متھے تلک[1] حبیب اللہ کا سجت سر کے تاج کی شان نرالریا
جب کہ خواجہ کے چرن اجمیر بھئے تب تو ہندوستان کے بھاگ جگے
نبی پاک کے نام کے ڈنکے بجے توحید کی بج گئی بانسریا

حضرت میراں علی محمد خلجیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرماتے ہیں:

واہ آپ کی ہے کیا شاں، میراں علی محمد
ہر ایک ہے ثنا خواں، میراں علی محمد
ترے گھر کے ہم غلاماں، میراں علی محمد
ترا فیض ہے فراواں، میراں علی محمد
گل گلستان حضرت خاتون پاک جنت
حسنین کے دل وجاں میراں علی محمد

پنجابی زبان میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک طویل منقبت لکھی ہے جو آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں کو زبانی یاد ہے، اور اسی طرح دیگر کلام بھی مگر اس وقت ہمیں میسر نہیں آسکا۔

---

[1] یہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اس طرف اشارہ ہے کہ جب حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو تجہیز و تکفین کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی پیشانی مبارک پر سبز خط میں لکھا ہوا تھا: ''مات حبیب اللہ فی حب اللہ'' (اللہ کے حبیب نے اللہ کی محبت میں جان دیدی)

کرامات:

شاہ صاحب علیہ الرحمتہ کی خرق عادات اور کرامات کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عقیدت مند جناب عزیز صاحب نے ایک کتاب آپ کے حالات و کرامات کے متعلق لکھی ہے (غیر مطبوعہ ہے) اس میں سو سے زیادہ آپ کی کرامات کا تذکرہ لکھا ہے، ان کے علاوہ بہت سی راقم آثم کو معلوم ہیں، اسی لیے میں نے آپ کی تاریخ وفات ''مخزن کرامات'' (۱۳۵۹ھ) نکالی ہے مگر ان کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ جن باتوں کی پیروی کر کے ہم دنیا اور دین کو سنوار سکتے ہیں، وہ قدرے لکھ دی گئی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خرق عادات کا ظہور تو ننگے دھڑ نگے مجذوبوں سے بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن یہ مجاذیب ان عرفاء کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ مجاذیب کی زندگی حضور نبی ﷺ کی اتباع واطاعت میں نہیں گزرتی۔ اور حضور ﷺ کی پیروی سب سے اعلیٰ وارفع کرامت ہے، حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الولایة ظل النبوة والنبوة ظل الالوهیة وکرامة الولی استقامة فعله علی قانون قول النبی صلی اللہ تعالی علیه واله وسلم۔[1]

حضرت ممدوح کا ذکر جمیل جو تحریر ہوا، یہ بالکل ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے مصداق ہے۔ راقم آثم کے حافظے میں ابھی کئی اور واقعات محفوظ ہیں جو بخوف

---

[1] بہجۃ الاسرار مطبوعہ مصر ص ۳۹ بحوالہ مقال العرفاء مصنفہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۲ یعنی ولایت پرتو نبوت ہے اور نبوت پرتو الوہیت، اور ولی کی کرامت یہ ہے کہ اس کا فعل نبی ﷺ کے قول کے قانون پر ٹھیک اترے۔

طوالت حوالہ قرطاس و قلم نہیں کیے۔ موقع ملا، تو پھر کبھی تفصیل سے لکھا جائے گا، ان شاء اللہ۔ اب اس عارف حق کے سفر آخرت اور مابعد کے حالات ملاحظہ فرمائیں!

سفر آخرت:

آپ بعارضہ قولنج بیمار ہوئے۔ حاجی شیخ خیر الدین مرحوم آپ کو امرت سر کے وکٹوریہ ہسپتال لے آئے، مگر آپ داخل نہ ہوئے اور وہاں سے احقر کے والد ماجد علیہ الرحمۃ کے پاس تشریف لے آئے۔ اور دوا لے کو فوراً واپس چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے والد صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:[1]

"لو حکیم جی! یہ آپ کی اور ہماری آخری ملاقات ہے۔"

اگلے ہی دن ۳۰ رمضان المبارک ۱۳۵۹ء بروز جمعہ تین بج کر ۴۱ منٹ پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہزار ہا لوگ شریک جنازہ ہوئے، اور آپ کی بنائی ہوئی مسجد سے ملحقہ زمین میں آپ کو دفن کیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ الشریف

برادر معظم جناب حکیم شمس الدین صاحب مدظلہ حکیم حاذق مقیم حال پاک پتن شریف کی روایت ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی اطلاع پا کر شیخ المشائخ حضرت میاں علی محمد خان صاحب مدظلہ العالی نے فرمایا کہ

"سید برکت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ ماں کے پیٹ سے جس طرح معصوم پیدا ہوئے تھے، اسی طرح اس دنیا سے رخصت ہوئے۔"

---

[1] راقم آثم نے اس دن آپ کی تیسری بار زیارت کی تھی جو آخری بن گئی۔

قطعات تاریخ وفات حسرت آیات

حضرت شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر نامور شعراء نے پنجابی، اردو اور فارسی میں فراقیہ نظمیں اور تاریخی قطعات لکھے۔ ذیل میں صرف اردو اور فارسی کے چند قطعات نقل کیے جاتے ہیں:

(۱)

نتیجہ فکر: حضرت مولانا پیر غلام دستگیر نامی مرحوم ومغفور

چو برکت علی شاہ چشتی شنفت ندائے الیٰ ربک ارجعی!
براورنگ جنت بہ آرام خفت بہ خلد بریں چہرہ افروز شد
ملاقی شدہ ہم چو گل برشگفت بہ پیرش محمد شہ نام دارد
پئے سال فوتش بنامی سروش!
"علی یار برکت علی شاہ" گفت

۱۳۵۹ھ

(۲)

از حضرت مولانا سید شریف احمد شرافت صاحب قادری نوشاہی
سجادہ نشین درگاہ عالیہ حضرت نوشہ گنج بخش قادری سرہ

سید برکت علی شاہ مردحق در جہاں از عارفاں بردہ سبق
صابر وشاکر ولی باکمال سرگروہ عاشقان ذوالجلال
جامع علم وعمل سلطان دیں خادم درگاہ ختم المرسلین

مقتدائے صوفیان باصفا افتخار چشتیان ذوالہدیٰ
گشت درفردوس اعلیٰ خوش مقام رحمت حق بادبر روحش مدام
گو شرافت سال نقل آں ولی
''عاشق دیں مولوی برکت علی''

۱۳۵۹ھ

(۲)

استاذ الشعراء جناب ابوالطاہر فدا حسین فدا صاحب
مدیر اعلیٰ ''مہر وماہ'' لاہور

وصال حضرت برکت علی پر ہوئی اندوہ گیں روحانیت ہے
پئے شیدائیان شاہ والا خزاں دیدہ ریاض شش جہت ہے
دل ہر معتقد میں اللہ اللہ! فروزاں شمع نور معرفت ہے
ہوئے مدحت سرا ہیں حور وغلماں لب رضواں پہ ان کی منقبت ہے
خدائے ذوالمنن سے اہل حق کی پئے حضرت دعائے مغفرت ہے
فضائے روضہ پر نور واللہ! حقیقت میں بہار میمنت ہے
فدا از روئے الحمد تاریخ!
''بفردوس بریں قدسی صفت'' ہے

۱+ = ۱۳۵۹ھ

آپ کا خلیفہ:

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ، لاولد تھے۔ آپ نے اپنے رشتہ داروں اور

مریدوں میں سے کسی کو اپنا خلیفہ یا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔ چنانچہ حضرت الحاج الشاہ میاں علی محمد خان صاحب دام فیوضہم (جو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی اور آپ کے شیخ کے نواسے ہیں) نے باشارہ غیبی حضرت سید سردار علی شاہ صاحب کو آپ کا خلیفہ مجاز آپ کے چہلم کے موقع پر مقرر فرمایا، اور اصول مشائخ کے مطابق رسم دستار بندی ادا کی، اس وقت دیگر کئی اولیائے کبار کے سجادگان اور صوفیائے باصفا موجود تھے۔

میرے برادر مرحوم جلال الدین مدفون پاک پتن بھی اس وقت وہیں موجود تھے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز و سجادہ نشین حضرت سید سردار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بمقام خلچیاں ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی سید شاہ محمد مرحوم تھا، جو حضرت سید برکت علی شاہ علیہ الرحمۃ کے چچیرے بھائی تھے۔ سید سردار علی شاہ صاحب نے خلچیاں ہی میں تعلیم حاصل کی اور حضرت قبلہ شاہ صاحب مغفور کا دامن نوعمری ہی میں پکڑ لیا تھا۔

حصول خلافت کے بعد آپ نے حضرت میاں علی محمد صاحب مدظلہ العالی کی خدمت بابرکت میں رہ کر اکتساب فیض کیا اور تاحال حضرت موصوف دام ظلہم کے فیوض وبرکات سے متمتع ہوتے رہتے ہیں، حضرت قبلہ میاں صاحب آپ پر بڑی شفقت فرماتے ہیں۔

سید سردار علی شاہ صاحب ہجرت کے بعد چک نمبر ۱۲۰ جنوبی سکھاں والی تحصیل و ضلع سرگودھا میں سکونت پذیر ہو گئے، کیونکہ انہیں اس گاؤں میں زمین الاٹ ہو گئی تھی، آپ اپنے پیرومرشد کا عرس یہیں کرتے ہیں۔

سید سردار علی صاحب زمیندار ہیں اور پیر بھی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں وہی اوصاف حمیدہ وخصائل پسندیدہ پیدا فرمائے۔ جن کی بدولت حضرت مرحوم کی

زندگی ایک نمونہ تھی، نہ صرف عوام کے لیے، بلکہ مشائخ کرام کے لیے بھی۔

سالانہ عرس:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا عرس یوم وصال کے بجائے یوم چہلم پر ہونا قرار پایا تھا، چنانچہ یکم اور دوئم ذیقعدہ کو آپ کا عرس خلچیاں میں ہوتا رہا اور اب ان تاریخوں میں چک ۱۲۰ میں ہر سال ہوتا ہے، دور دور سے آپ کے عقیدت مند عرس میں شمولیت کے لئے آتے ہیں۔ لائل پور کے احباب خاص عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔

آپ کی قبر کھودی گئی:

موضع خلچیاں برلب شاہراہ سوری امرت سر سے جالندھر کی جانب جاتے ہوئے انیسویں میل پر واقع ہے، یہ گاؤں خالص مسلمانوں کا تھا۔ صرف چند گھر ہندوں کے تھے، تقسیم ملک کے وقت یہ گاؤں کیمپ تھا۔

جوں ہی یہ لوگ پیدل قافلے کی صورت میں پاکستان آئے ادھر سے گئے ہوئے شرنارتھی وہاں جا بسے۔ انہوں نے مسجد کو تو گوردوارہ میں تبدیل کر لیا اور حضرت شاہ صاحب کی قبر کو کھود کر تابوت باہر نکالا لاش کو دیکھا تو بالکل تروتازہ تھی۔ اتنے میں وہاں اور گردونواح کے مقامی لوگوں کو پتہ چل گیا جو آپ کی عظمت اور بزرگی کے قائل تھے، انہوں نے دوبارہ میت کو قبر میں رکھ کر بند کر دیا۔ اس حادثہ فاجعہ کا علم ہمیں اسی وقت ہو گیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۵۴ء میں راقم آثم سردار کشن سنگھ مان نمبردار ورئیس رعیہ سے ملا۔ یہ صاحب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہونے کے علاوہ بزرگان اسلام سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں، انہیں حضرت خواجہ میاں محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے حضور بارہا

حاضر ہونے کا شرف نصیب ہوا ہے، میں ان کی قلبی کیفیات سے بخوبی واقف ہوں۔ اور میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے تعلقات عرصہ ساٹھ سال سے تھے۔

میں نے سردار کشن سنگھ صاحب سے اس واقعہ کی تصدیق چاہی تو اثبات میں سر ہلا کر رونے لگے، اور دیر تک روتے رہے، ذرا سنبھلے تو میں نے پھر یہی پوچھا کہ کیا واقعی حضرت شاہ صاحب کا جسم تروتازہ تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس وقت ''رعیہ'' میں نہیں تھا، باہر گیا ہوا تھا واپسی پر مجھے اس افسوسناک حادثے کا علم ہوا اور جن لوگوں نے دوبارہ دفن کیا۔ انہوں نے یہی بتایا ہے کہ جسم اور کفن بالکل ٹھیک تھا۔

غالباً ۱۹۵۵ء میں ہندوستان جانے کا دوبارہ اتفاق ہوا۔ احقر اور محترم جناب خواجہ غلام صمد[1] مرحوم انبالوی سابق ایم ایل اے اور دیگر احباب ہوشیار پور حضرت میاں محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے عرس پر جا رہے تھے کہ خلچیاں موٹر کھڑی کر کے ہم پہلے حضرت میراں علی شاہ علیہ الرحمۃ کے مزار پر انوار پر گئے۔ یہاں فاتحہ خوانی کے بعد حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں سلام نیازمندانہ پیش کیا۔ اور مغرب کی نماز باجماعت یہیں پڑھی۔ محترم حاجی محمود خان صاحب مالک ''راجپوت ہاؤس لاہور'' نے مؤذن اور امام کے فرائض سرانجام دیئے۔

---

[1] جناب خواجہ صاحب مرحوم بڑے ہمدرد قوم وملت بزرگ تھے۔ آپ حضرت خواجہ میاں محمد شاہ ہوشیار پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص تھے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ لاہور آ کر دھوبی منڈی انارکلی میں رہتے تھے، راقم آثم کے والد ماجد سے قلبی تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ فی زمانہ ایسے نیک دل اور مومن انسان کا ملنا محال ہے، آپ ۱۹۵۹ء مطابق ۱۳۷۹ھ میں واصل بحق ہوئے میں نے ''خواجہ شدہ بجنت'' (۱۳۷۹ھ) فی البدیہہ تاریخ کہی۔

شاہ صاحب کی قبر دوبارہ پختہ بنا دی گئی ہے، اس پر گینڈے کے پھولوں کے گملے بڑے قرینے سے سجائے ہوئے تھے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے حضرت کے مزار کے بے حرمتی کی تھی وہ طرح طرح کی آفات میں مبتلا ہو کر کچھ تباہ ہو گئے، کچھ مر گئے اور باقی علاقہ چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ہی سے شرنارتھی، مزار کا احترام کرنے لگے ہیں۔ مگر انہوں نے مسجد کو گوردوارہ بنایا ہوا ہے۔

ہم جب فراغت نماز وغیرہ کے بعد واپس لوٹ رہے تھے، تو جن مزارات و مقابر پر کبھی چراغاں ہوتا تھا، ان پر بالکل اندھیرا اور ویرانی دیکھ کر یہ شعر یاد آیا:

مدتے آمد نمی گرید چراغ تربتم
گرخموشش کرد صرصر سوگواراں راچہ شد

قبریں کھودنا ہندوؤں کی پرانی رسم ہے:

ہندوؤں کو جب کبھی بھی موقع ملا، انہوں نے مقابر مسلمین کو کھود کر لاشوں اور ڈھانچوں کو باہر نکال کر اور توڑ پھوڑ کر اپنے ارمان نکالے۔

جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی ایک قافلے کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں پانی پت گئے تھے، انہوں نے وہاں دیکھا کہ مشہور مسلم بزرگان دین کی قبروں کو کھودا ہوا تھا اور ڈھانچے نکال کر باہر پھینکے ہوئے تھے۔ یہ تمام حالات موصوف نے لکھے جو تین قسطوں میں ۲۹ و ۳۱ و یکم اگست ۱۹۴۹ء کو روزنامہ نوائے وقت لاہور میں شائع ہوئے۔

''عماد السعادت'' مؤلفہ سید غلام علی جو مسٹر جان بیلی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، اس کا وہ حصہ جس میں پانی پت کی لڑائی کا ذکر ہے، خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم نے ''ہندو مسلمانوں کی آخری لڑائی'' کے نام سے شائع کیا تھا، اس وقت کے ہندو سورماؤں کے جذبات کیسے تھے؟ تاریخ دانوں پر واضح ہیں۔ پونا کے ایک جنگی جلسے میں ''سداشیو پنڈت بھاؤ'' نے جو تقریر کی، اس کے چند فقرے ملاحظہ ہوں:

> ''ہم سومنات کی مورتی شاہ جہاں کی بنائی ہوئی مسجد دہلی کے منبر پر نصب کریں اور پھر پنجاب پر قبضہ کر کے افغانستان میں گھس جائیں اور غزنی میں محمود غزنوی کا مقبرہ ڈھا دیں۔ اور اس کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کے دانت توڑ دیں اور پھر اس کو آگ میں جلا دیں۔'' (ہندو مسلمانوں کی آخری لڑائی: ص ۱۴)

جب یہ لشکر پونا سے چل کر راستے میں قتل و غارت کرتا ''بیانہ'' کے مقام پر پہنچا تو وہاں کیا گل کھلایا:

''جب یہ آندھی ''بیانہ'' کے مقام پر پہنچی جو راجہ سورج مل جاٹ کی حکومت کا ایک مشہور قلعہ تھا اور جہاں بے شمار مسجدیں اور قبریں نامور مسلمانوں کی تھیں، وہاں اس فوج نے نامور امیروں اور حکمرانوں کی قبریں کھودیں اور ان کی لاشیں نکال کر ان کے دانت توڑے''۔ (ص ۳۰)

”لاہور میں جب مسجد شہید گنج کا جھگڑا اٹھا تو سکھوں نے حضرت شاہ کاکو چشی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار جو مسجد شہید گنج سے ملحق تھا، کھود ڈالا۔“

(تاریخ جلیلہ از پیر غلام دستگیر نامی: ص ۱۵۰)

سچ کہا ہے کہنے والے بزرگ نے:

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو!　　در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

خودنوشت

- حضرت مخدوم علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ
- شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ
- شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
- مولوی فقیر محمد جہلمی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مخدوم علی ہجویری

المعروف داتا گنج بخش

علی بن عثمان بن علی جلابی غزنوی ہجویری عرض کرتا ہے کہ میں نے استخارہ کیا اور جو اغراض نفس میں پھرتی تھیں، دل سے دور کر دیں۔ تمہاری ا درخواست کے مطابق (خدا تمہیں سعادت عطا کرے) کام کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس کتاب سے تمہاری امید برلانے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اس کتاب کا نام ''کشف المحجوب'' رکھا۔ میں نے جو آغاز کتاب میں اپنا نام درج کیا ہے، اس سے مراد دو چیزیں ہیں، ایک خاص لوگوں کے متعلق ہے اور دوسری عام لوگوں کے۔ عام لوگوں کے باب میں تو یہ بات ہے کہ جب اس علم سے بے بہرہ لوگوں کو کوئی نئی کتاب نظر آتی ہے، جس پر جگہ جگہ نام درج نہ ہو تو وہ اسے اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ اس سے مصنف کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ تصنیف و تالیف سے مصنف کی مراد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ اس کتاب سے اس کا نام زندہ رہے اور پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے والے اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔ مجھے دو مرتبہ یہ حادثہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ یہ کہ کسی نے میرے شعروں کو ''دیوان'' مجھ سے مانگ کرلیا اور اصل نسخہ اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے سارا دیوان الٹ پلٹ کر دیا اور میرا نام اس پر سے اڑا کر میری ساری محنت

---

1. ابو سعید ہجویری

برباد کردی۔ خدا اس پر رحم کرے! دوسری مرتبہ یہ کہ میں نے تصوف کے موضوع پر (اللہ اسے آباد رکھے) ”منہاج الدین“ کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ ایک کمینے مدعی نے جس کا نام قابل ذکر نہیں، میرا نام اس پر سے مٹا دیا اور عوام پر یہ ظاہر کیا کہ یہ کتاب اس نے خود لکھی ہے۔ اگرچہ خاص لوگ اس بات پر ہنسا کیے، یہاں تک کہ اس کی بے برکتی سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ خدا نے اپنے طالبوں کی درگاہ کے دیوان سے اس کا نام ہی خارج کر دیا، لیکن خواص کا حصہ یہ ہے کہ جب وہ کتاب دیکھیں گے اور اسے پڑھنے اور یاد کرنے میں زیادہ جدوجہد سے کام لیں گے۔ اس طرح پڑھنے والے اور مصنف کی مراد زیادہ اچھے انداز سے بر آئے گی۔

غرض! میں نے یہ کتاب اس لیے تالیف کی ہے کہ یہ اُن دلوں کو صیقل کر کے صاف کرے جو تاریکی کے حجاب میں مبتلا ہیں، لیکن نورِ حق کا سرمایہ ان کے اندر موجود ہے۔ تاکہ اس کتاب کے مطالعے سے تاریکی کا حجاب اُٹھ جائے حقیقتِ معنی کا راستہ مل جائے۔ جن لوگوں کی فطرت اور خمیر ہی میں حق سے انکار اور باطل کا ارتکاب ہوتا ہے، انہیں دلائل و شواہد کے باوصف راہِ حق نہیں ملتی، لہٰذا ایسے لوگوں کو اس کتاب سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ عرفان کی نعمت پر خدا کا شکر ہے۔

خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا کیا، جس کے لوگوں نے ہوا و ہوس کا نام شریعت، جادۂ ریاست کی طلب اور تکبر کا نام عزت و علم رکھ دیا ہے۔ خلقت سے ریاکاری کو خوف الٰہی اور دل کے اندر کینہ پوشیدہ رکھنے کو علم سے موسوم کر دیا ہے۔ فضول جنگ و جدل کو مناظرہ، باہم لڑائی جھگڑے اور نادانی کو پاک دامانی قرار دے لیا ہے۔ منافقت کا نام پرہیزگاری، جھوٹی آرزو کا ارادت، طبع کے

ہذیان کا معرفت، دلی حرکتوں اور نفسانی وسوسے کا نام عشق الٰہی، گمراہی کا فقر، انکار حق کا برگزیدگی، لادینی کا فنا، شریعت رسول ﷺ سے برگشتہ ہو جانے کا طریقت اور اہل زمانہ کی آفت کا نام مجاہدہ رکھ دیا ہے، یہاں تک کہ معارف حق کے راز آشنا لوگ اس جہان سے یکسر الگ تھلگ ہو گئے ہیں اور دنیا داروں نے غلبہ پالیا ہے، جیسا کہ آغاز اسلام میں آل مروان نے اہل بیت رسول اللہ ﷺ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

جان لو کہ میں نے اولیاء اللہ کے حق میں اس عالم کو خدا کے بھیدوں کا مقام موجودات کو اس کی امانتوں کا محل اور مخلوقات کو اس کے لطیف اسرار کی جگہ پایا ہے۔ جواہر، اعراض، عناصر، اجرام فلکی، اجسام ارضی اور مخلوقات کی طبیعتیں، سب ان اسرار خداوندی کا پردہ ہیں، خدا کی توحید کے مقام میں ان میں سے ہر ایک کا اثبات شرک ہے۔

ایک دفعہ مجھے کسی ایسے صاحب علم سے مناظرے کا اتفاق ہوا، جس نے تکبر کی کلاہ کا نام عزت، ہوا و ہوس کی پیروی کا نام سنت رسول ﷺ اور شیطان کی تائید کا نام ائمہ دین کی سیرت قرار دے رکھا تھا۔ اس نے مناظرے کے دوران میں کہا کہ ملحدوں کے بارہ گروہ ہیں، جن میں سے ایک گروہ صوفیہ کا ہے۔ میں نے کہا، اگر ایک گروہ صوفیہ میں سے تو گیارہ گروہ تم لوگوں میں سے ہیں۔ صوفیہ ایک گروہ ہونے پر بھی جس عمدگی سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں، تم گیارہ گروہوں میں ہونے پر بھی ویسی حفاظت نہیں کر سکتے، لیکن یہ سب کچھ اہل زمانہ کی بے دینی و گمراہی اور ان آفتوں کا نتیجہ ہے، جو آج کل نازل ہو رہی ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے اولیاء کو ان لوگوں کے درمیان چھپائے رکھا ہے اور ان لوگوں کو مخلوق میں ان اولیاء سے دور کر رکھا ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) نے ''طوس'' میں شیخ المشائخ ابوالقاسم گورگانی سے پوچھا کہ درویش کے لیے کم از کم کیا چیز ہونی چاہیے؟ جس کی بنا پر وہ اسم فقر کا حق دار ہو سکے، انہوں نے فرمایا: کہ کم از کم تین چیزیں۔

(اول) یہ کہ چیتھڑا سیدھا سینا جانتا ہو۔

(دوم) یہ کہ اسے سچی بات سننے کا علم ہو۔

(سوم) یہ کہ وہ صحیح طریق سے زمین پر پاؤں رکھ سکے۔

اُس وقت درویشوں کا ایک گروہ میرے پاس حاضر تھا۔ جب ہم لوگ دروازے پر واپس آئے تو ہم میں سے ہر شخص اس قول میں کچھ تصرف کر رہا تھا۔ جاہلوں کے ایک گروہ کو اس میں طبع پیدا ہوئی، وہ کہنے لگے کہ بس فقر اسی کا نام ہے، ان میں سے بیشتر لوگ چیتھڑا سیدھا سینا اور پاؤں زمین پر مارنا (ناچنا) مراد لینے لگے۔ ہر شخص کو یہی خیال ہوا کہ ہم طریقت کی باتیں سننا جانتے ہیں۔ چوں کہ میرا دلی خیال شیخ کی جانب تھا۔ لہٰذا میں نے ان کے قول کو زمین پر پھینکنا نہ چاہا اور ان لوگوں سے کہا۔ آیئے ہم میں سے ہر ایک اس قول کے معنی سے متعلق کچھ اظہار خیال کر لے۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنا اپنا مفہوم بیان کیا جب میری باری آئی تو میں نے کہا:۔ چیتھڑا صحیح طور پر سینا یہ ہے کہ وہ اصلی فقر سے سیا جائے، نہ کہ ظاہری آرائش سے، جب تو چیتھڑا فقر سے سیئے گا تو گو کج سے سئے گا، پھر بھی راست ہوگا۔ سچی بات سننا یہ ہے کہ وہ حال سے سنی نہ کہ قال سے۔ اس کی تاویل حق و معقول بات سے کی جائے، نہ کہ لغویات سے وہ دل سے سمجھی جائے نہ کہ عقل سے۔ صحیح طریق سے زمین پر پاؤں رکھنا یہ ہے کہ جذبۂ عشق خدا سے زمین پر پاؤں رکھا جائے نہ کہ لہو و لعب اور رسم ظاہر سے۔ جب کسی

شخص نے یہ بات شیخ المشائخ کو بتائی تو انہوں نے فرمایا: ''اصاب علی خیر اللہ'' (علی نے درست کہا، خدا اُسے جزا دے)

مجھے (علی بن عثمان جلابی کو) ایک بار ایک واقعہ پیش آیا۔ میں نے اس امید پر کہ وہ حل ہو جائے، بہت جدوجہد کی لیکن حل نہ ہوا۔ اس سے قبل اسی قسم کا ایک پیچیدہ عقدہ سامنے آیا تھا۔ میں نے شیخ بایزید کے مزار پر جا کر مجاوری کی کہ وہ حل ہو جائے، مگر نہ ہوا، میں روزانہ تین مرتبہ غسل اور تین مرتبہ وضو کیا کرتا تھا، اس توقع پر کہ وہ عقدہ مجھ پر کھل جائے، لیکن وہ نہ کھلا۔ میں وہاں سے اُٹھا اور ''خراسان'' کے سفر کا ارادہ کیا۔ چلتے چلتے ایک شب میں موضوع ''کمس'' میں پہنچا۔ وہاں ایک خانقاہ کے اندر صوفیوں جیسا ایک گروہ تھا۔ میں ایک سخت اور پرانی گدڑی اوڑھے ہوئے تھا، اور رواجی صوفیوں کے ساز و سامان میں سے ''عصا'' اور ''ٹاٹ'' کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ اس گروہ کی نظروں میں میں نہایت ذلیل معلوم ہوا۔ کوئی بھی مجھے پہچانتا نہ تھا۔ وہ باہم رسماً کہتے تھے کہ یہ شخص ہم میں سے نہیں۔ درست قول وہی تھا جو وہ کہہ رہے تھے کہ میں اُن میں سے نہ تھا، لیکن اس رات میرے لیے وہاں رہنا ناگزیر تھا۔ انہوں نے مجھے ایک بالا خانے میں بٹھا دیا اور خود اس سے زیادہ اونچے بالا خانے میں چلے گئے۔ میں فرش پر تھا۔ انہوں نے خشک اور باسی روٹی جو پھپھوندی سے سبز ہو گئی تھی، میرے آگے رکھی، جو طعام وہ کھا رہے تھے، اُس کی بو مجھے آ رہی تھی۔ وہ بالا خانے سے میرے ساتھ طنزیہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ظرافت اور میری تذلیل کے لیے خربوزہ کھا کر اس کے چھلکے میرے سر پر پھینکتے جاتے تھے۔ میں دل میں کہتا تھا، بار الہا، اگر ایسا نہ ہوتا کہ وہ تیرے دوستوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں تو میں

ہر گز اُن سے ایسی تذلیل برداشت نہ کرتا۔ ان کی طرف سے مجھ پر طعن کا جتنا اضافہ ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی میرا دل حظ و سرور محسوس کرتا تھا، حتیٰ کہ یہ تذلیل سہنے کے باعث وہ پُر پیچ عقدہ حل ہو گیا۔ اُسی وقت میں سمجھ گیا کہ مشائخ طریقت نے کس وجہ سے جاہلوں کو اپنے حلقے میں داخل ہونے کی راہ دی ہے، اور ان کی تذلیل کا بار کیوں اٹھاتے ہیں۔

ایک مرتبہ غزنی میں (خدا اُسے نظر بد سے بچائے) امامت علم کے ایک مدعی نے کہا، گدڑی اوڑھنا بدعت ہے۔ میں نے کہا حشیشی و دبیقی جو یکسر ریشمی کپڑے ہیں، جن کا استعمال مردوں کے لیے قطعاً حرام ہے۔ پھر منت و سماجت کر کے ظالموں کے مال سے جو سراسر حرام ہے، حاصل کرنا اور بھی حرام ہے، تم انہیں تو لے کر خوشی سے استعمال کرتے ہو اور نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے۔ بھلا ایک حلال کپڑے کو حلال جگہ اور حلال روپے سے خریدا گیا ہوا، تم بدعت قرار دیتے ہو؟ اگر تم طبیعت کی سرکشی اور نفس کی گمراہی سے مغلوب نہ ہوتے تو اس سے زیادہ پکی بات کہتے، مگر ریشمی لباس پہننا عورتوں پر حلال ہو اور مردوں پر حرام، اگر تمہیں ان دونوں باتوں کا اعتراف ہے تو معذور ہو، ایسی بے انصافی سے تو خدا کی پناہ۔

میں علی بن عثمان جلابی ملک شام میں پیغمبر ﷺ کے مؤذن حضرت بلال کے روضہ مبارک پر سو رہا تھا۔ میں نے خواب میں اپنے آپ کو مکہ معظمہ کے اندر دیکھا۔ پیغمبر ﷺ "باب بنی شیبہ" سے اندر تشریف لائے۔ حضور نے ایک بوڑھے کو اس طرح آغوش میں لے رکھا تھا جس طرح لڑکوں کو شفقت سے آغوش میں لیتے ہیں۔ میں دوڑ کر حضور کے سامنے گیا اور آپ کے پائے مبارک پر بوسہ دیا۔ میں حیران تھا کہ وہ بوڑھا کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اعجازاً میری دلی کیفیت اور خیال

سے مطلع ہو کر فرمایا: یہ تیرا اور تیرے اہل ملک کا امام یعنی ابو حنیفہ ہے، اس خواب سے مجھے اور میرے اہل شہر کو بڑی امید بندھی۔ مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ (حضرت امام اعظم ابو حنیفہ) ان افراد میں سے ایک ہیں جو اوصاف طبع سے فانی، احکام شرع سے باقی اور ان سے قائم ہیں۔ حقیقتاً انہیں اوصاف طبع سے نکال کر لے جانے والے پیغمبر ﷺ ہی ہیں۔

حضرت ابوالفضل محمد حسن ختلی کا میں طریقت میں پیرو ہوں۔ ایک مرتبہ میں وضو کے لیے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا کہ دل میں خیال گزرا۔ جب تمام کاموں کا انحصار تقدیر اور قسمت پر ہے تو آزاد لوگ کرامت کی امید پر اپنے آپ کو پیروں کا غلام کیوں بناتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بیٹا: جو خیال تیرے دل میں گزرا ہے، وہ مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ جان لے کر ہر حکم کا ایک سبب ہے۔ جب خدائے بزرگ و برتر چاہتا ہے کہ کسی عام بچے کو تاج و سلطنت بخش[1] دے تو اسے توبہ کی توفیق عطا کر کے اپنے کسی دوست کی خدمت میں مشغول کر دیتا ہے، تا کہ یہ خدمت اس کی کرامت کا سبب بن جائے۔

ایک دن گرمی کے موسم میں میں لباس پہنے کوفت سے چور (حضرت ابواحمد المظفر الدین حمدان کی خدمت میں) حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا: اے ابوالحسن! مجھے بتاؤ، اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی۔ میں راگ سننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فوراً آدمی بھیج کر ایک قوال اور اہل ذوق وسماع کو طلب کیا۔ شروع ہی میں مجھے بچپن کے جوش، قوت ارادہ اور صحبت کے ساز نے راگ سننے سے بے تاب کر دیا۔ تھوڑی دیر

---

[1] یعنی سلطنت فقر

کے بعد جب مجھ میں اس آفت کا جوش وخروش ذرا کم ہوا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: یہ راگ تمہارے لیے کیسا رہا؟ میں نے عرض کی! اے شیخ! میں نہایت خوش ہوا۔ فرمایا: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ سماع کی یہ آواز اور کوے کی کائیں تمہارے لیے برابر ہوں گی، کیوں کہ قوت سماع اُسی وقت تک ہوتی ہے کہ مشاہدۂ حق نہ ہو۔ جب مشاہدہ میسر آجائے تو قوت سماع ہیچ ہو جاتی ہے۔ دیکھنا، کہیں اس راگ کو عادت نہ بنا لینا۔ ایسا نہ ہو کہ طبیعت ثانیہ بن جائے اور تم اس کے سبب اصل مقصد سے محروم رہ جاؤ۔

میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں، ایک مرتبہ مجھے ایک مشکل پیش آئی، جس کا حل کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ میں نے حضرت ابوالقاسم گورگانی کی زیارت کو ''طوس'' جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں ان کے مکان کے پاس مسجد کے اندر تنہا پایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہو بہو میرا واقعہ ایک ستون کو سنا رہے ہیں۔ مجھے پوچھے بغیر اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اس پر میں نے عرض کی: اے شیخ! آپ یہ واقعہ کسے سنا رہے ہیں؟ فرمایا: بیٹا! اس ستون کو اس وقت خدا تعالیٰ سے بولنے کی قوت عطا فرما دی حتیٰ کہ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

ولایت ''فرغانہ'' میں ایک گاؤں ہے، جسے ''سلاتک'' کہتے ہیں۔ وہاں اوتار میں سے ایک بزرگ رہتے تھے، جن کا نام ''باب عمر'' تھا۔ اس علاقے کے تمام درویش بڑے مشائخ کو باب ہی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں ''فاطمہ'' نامی ایک بوڑھی عورت تھی، میں نے مقام ''روزگند'' سے ان کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا: تو کس غرض سے آیا ہے؟ عرض کی: اس غرض سے کہ شیخ کا دیدار اصل صورت میں کروں اور وہ مجھ پر شفقت کی نگاہ ڈالیں۔ انہوں نے ارشاد کیا: بیٹا! میں خود فلاں دن سے تجھے دیکھ رہا تھا اور اس وقت تک دیکھتا رہوں گا، جب

تک مجھ سے تجھے غائب نہ کر دیا جائے۔ جب میں نے دن اور برس گنے تو جو دن انہوں نے بتایا تھا، وہ دن میرے آغاز توبہ کا دن نکلا۔ انہوں نے فرمایا! بیٹا: تھوڑے وقت میں لمبا سفر کرنا بچوں کا کام ہے۔ اب اس کے بعد اُس ذات کی زیارت کے لیے ہمت کر، جسے ہر شخص نہیں پا سکتا اور نہ اس کی زیارت کو شرط سفر ضروری ہے۔ پھر فرمایا: اے فاطمہ! جو کچھ تیرے پاس ہے، لے آ، تا کہ یہ درویش کھا لے۔ وہ تازہ انگوروں کا ایک تھال لے آئیں، حالاں کہ ان کا موسم نہ تھا۔ انگوروں کے اوپر چند تازہ کھجوریں تھیں، حالانکہ ''فرغانہ'' میں تازہ کھجوروں کا ملنا غیر ممکن تھا۔

ایک مرتبہ میں ایک گاؤں ''مہنہ'' میں حسب معمول تنہا شیخ ابوسعید کے مزار پر بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا، ایک سفید کبوتر آیا اور مزار پر نظر ڈالے ہوئے غلاف کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا، شاید یہ کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر آ گیا ہے۔ جب میں نے اُٹھ کر غلاف کے نیچے نظر ڈالی تو وہاں کچھ نہ تھا۔ دوسرے دن بھی یہی دیکھا اور اس سے میں حیران رہ گیا، حتیٰ کہ ایک رات میں نے انہیں خواب میں دیکھا اور ان سے اس واقعے کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: وہ کبوتر میرے معاملے کی صفائی ہے، جو ہر روز قبر میں میری مصاحبت کے لیے آتی ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) نے سرورِ دو عالم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی، یا رسول اللہ اوصنی (اے خدا کے رسول ﷺ مجھے وصیت فرمائیے) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اِحبِسْ حَوَاسَکَ'' (اپنے تمام حواس بند رکھ) کیوں کہ حواس کو بند رکھنا ہی پورا مجاہدہ ہے۔[1]

---

[1] عارف رومی کا شعر ؎ چشم بند و گوش بند و لب بہ بند۔ گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند، اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور ہمارے زمانے کے صوفی شاعر اصغر گونڈوی ؎ جان ہے محوِ تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند۔ حسن کو حسنِ بیاں حُسن نظر سمجھا تھا میں۔ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ''دمشق'' سے دو درویشوں کے ہمراہ ''ابن معلا'' کی زیارت کا ارادہ کیا وہ موضع ''رملہ'' میں مقیم تھے۔ ہم نے راستے میں ایک دوسرے سے کہا: ہم میں سے ہر ایک کو دل میں کوئی ایسی بات سوچ لینی چاہیے، جس کا اُسے علم ہوتا کہ وہ پیر ہمارے باطن سے ہمیں آگاہ کر دیں اور ہمارا واقعہ حل ہو جائے، چنانچہ میں نے دل میں کہا: مجھے ان سے حضرت حسین بن منصور کی مناجات کے اشعار کی استدعا کرنی چاہیئے۔ دوسرا بولا مجھے دعا کرانی چاہیئے تاکہ میری تلی دور ہو جائے۔ تیسرے نے کہا: مجھے صابونی حلوا درکار ہے۔ جب ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُن کے حکم سے حضرت حسین بن منصور کی مناجات کے چند شعر تحریر کیے ہوئے تھے جو میرے سامنے رکھ دیئے گئے۔ دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا۔ اس کی تلی جاتی رہی۔ تیسرے سے فرمایا: صابونی حلوا سلطانی اہل کاروں کی خوراک ہے۔ تیرا لباس اولیاء کا ہے۔ اولیاء کا لباس سرکاری اہل کاروں کے ساتھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، ان دونوں باتوں میں سے ایک کو اختیار کر لے۔

ایک مرتبہ میں ''عراق'' کے اندر دنیا کی طلب اور اس کے فنا کرنے میں بے باکی سے مصروف تھا اور قرض بڑھ گیا تھا۔ جسے ضرورت پیش آتی، وہ میری جانب رُخ کرتا۔ میں ان کی ہوائے نفس کے پورا کرنے کی مصیبت میں گرفتار تھا۔ وقت کے سرداروں[1] میں سے ایک سردار نے مجھے تحریر کیا: بیٹا! دیکھ، اپنا دل خدا سے بے تعلق کر کے اس دل کو، جو ہوائے نفس میں مصروف ہے، فراغت پہنچانے پر نہ لگا۔ پس اگر تو اپنے دل سے کوئی محبوب تر دل پائے تو جائز ہے کہ اس کو آرام پہنچانے میں اپنا

---

[1] یعنی اولیاء وقت کے سرداروں میں سے ایک نے۔

دل مشغول کرے، ورنہ اس کام سے دست بردار ہو جا، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ میں بہت جلد اس کام سے فارغ ہوگیا۔

میں (علی بن عثمان جلابی) نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب وہ فرائض ادا کر چکتے تو سو جاتے۔ میں نے شیخ احمد سمرقندی کو دیکھا، جو ''بخارا'' میں رہتے تھے۔ وہ چالیس برس تک رات کو نہیں سوئے تھے، البتہ دن کو تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے۔

ایک دن میں شیخ ابوالعباس شقانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: ضرب اللہ مثلاً عبدا مملوکا لایقدر علی شیء (خدا نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے، جو دوسرے کے قبضے میں ہے اور کوئی کام نہیں کر سکتا) اور اشک بار تھے۔ یکا یک انہوں نے نعرہ لگایا اور بے ہوش ہو گئے۔ میں سمجھا کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عرض کی: اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟ فرمایا: گیارہ سال ہو گئے، ابھی تک میرا ورد یہاں تک پہنچا ہے، اس سے آگے میں نہیں جا سکا۔

میں نے حضرت ابوالعباس عطا سے پوچھا: آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھ لیتے ہیں؟ فرمایا: اس سے قبل رات دن میں دو مرتبہ قرآن ختم کیا کرتا تھا، مگر اب چودہ سال گزر گئے، ابھی تک سورۂ انفال تک پہنچا ہوں۔

ایک مرتبہ میں ''مرو'' میں تھا۔ اہل حدیث[1] کے ایک مشہور ترین امام نے مجھ سے کہا: میں نے ''سماع'' کے مباح ہونے سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے کہا: دین میں بھاری مصیبت پیدا ہو گئی کہ خواجہ امام نے ایک لہو کو جو تمام

---

[1] یعنی محدث۔ آج کل جو اہل حدیث کی اصطلاح مشہور ہے۔ یہ بالکل نئی اور زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ متقدمین نے جہاں لفظ اہل حدیث استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد محدث سے ہوتی ہے۔

بدکاریوں کی جڑ ہے، حلال کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا اگر تو اسے حلال نہیں سمجھتا تو سنتا کیوں ہے؟ میں نے کہا: اس کا حکم متعدد اسباب پر مبنی ہے۔ ایک چیز پر قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کی تاثیر دل میں حلال ہے تو اس کا سماع بھی حلال ہے اور اگر حرام ہے تو اس کا سماع بھی حرام ہے۔ اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے: "السماع زاد المضطرین فمن وَصل اِستَغنیٰ عَنِ السِّمَاعِ" (سماع عاجز لوگوں کا زادِ راہ ہے، پس جو منزل پر پہنچ گیا، وہ سماع سے بے نیاز ہو گیا) کیوں کہ اصل کے مقام میں سننے کا حکم غائب ہو جاتا ہے، اس وجہ سے کہ سننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب کی بات ہوتی ہے۔ جب مشاہدہ ہو جاتا ہے تو سننا جاتا رہتا ہے۔

میں نے ان (منصور حلاج) کے کلام کی شرح میں ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس میں ان کے کلام کی بلندی اور حال کی صحت دلائل و براہین سے ثابت کی ہے۔ علاوہ بریں میں نے اپنی تصنیف "منہاج الدین" میں جس کا ذکر پہلے کیا ہے، ان کے حالات کے آغاز و انجام پر روشنی ڈالی ہے...... میری اکثر کتابیں "غزنی" (خدا اسے محفوظ رکھے) میں رہ گئی ہیں۔ اور میں ملک ہندوستان میں بمقام شہر "لہاور" (لاہور) جو نواح ملتان میں سے ہے، ناجنسوں کے درمیان گھر گیا ہوں۔ راحت اور تکلیف دونوں حالتوں میں خدا کا شکر ہے۔

میں نے ان[1] سب کی تردید میں ایک مختصر دلیل (کشف المحجوب میں) بیان کر دی ہے، کیوں کہ یہ کتاب ان لغو عقائد کی دھجیاں بکھیرنے کا موزوں مقام نہیں۔

---

[1] آتش پرست، فلسفی اور معتزلہ وغیرہ

اس علم کے مشتاق کو یہ مسئلہ میری دوسری کتاب میں دیکھنا چاہیے، جو میں نے اس موضوع پر لکھ کر اس کا نام ''الرعایۃ بحقوق اللہ'' رکھا ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، تاکہ وہ مجھے اس مقام میں ہر بلا سے بچائے رکھے اور نفس کی شرارت سے نجات دلائے۔ اگر وہ مجھے اپنے قہر میں رکھے تو میں لطف کی آرزو نہ کروں اور اگر لطف میں رکھے تو مجھے قہر کی خواہش نہ ہو، کیوں کہ ہمیں اس کے اختیار میں ذرا دخل نہ ہو۔

میں علی بن عثمان جلابی اس امر کو اچھا سمجھتا ہوں کہ نوآموزوں کو سماع کی اجازت نہ دی جائے، تاکہ ان کی طبیعت کو پریشانی لاحق نہ ہو۔ اس میں زبردست خطرے اور بڑی خرابیوں ہیں، کیوں کہ عورتیں چھتوں پر سے اور مکانوں سے درویشوں کو سماع کے عالم میں دیکھتی ہیں۔ اس امر سے اہل سماع پر شدید حجاب پڑ جاتے ہیں۔ لازم ہے کہ نوجوانوں کو بھی ان کے درمیان نہ بٹھایا جائے، کیوں کہ جاہل صوفیہ نے یہ تمام امور مذہب میں شامل کر لیے ہیں اور سچائی کو درمیان سے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔ میں ایسی باتوں سے، جو اس طرح کی خرابیوں کے باعث مجھ پر گزر چکی ہیں، توبہ کرتا ہوا اللہ تعالیٰ سے امداد خواہ ہوں کہ وہ میرے ظاہر و باطن کو خرابیوں سے بچائے رکھے۔ تمہیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو اس کی رعایت حقوق کے لیے وصیت کرتا ہوں، توفیق دینے والا اللہ ہی ہے۔

والحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ محمد

وّآلہ واصحابہٖ اجمعین وسلم تسلیماً کثیراً

(انتخاب از انوار القلوب ترجمہ کشف المحجوب)

امام الصوفیہ حضرت شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سال وصال ۴۶۵ھ مشہور رہے۔ بعض کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ حضرت مخدوم علی ہجویری نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مثلاً کشف المحجوب، الرعایت بحقوق اللہ، منہاج الدین، البیان الاہل العیان اور دیوان علی، علی آپ کا تخلص ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رسالہ ''کشف الاسرار'' بھی آپ کی تصنیف ہے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی نے اُن سے منسوب کر دیا ہے۔ کیوں کہ اس میں بعض باتیں بالکل سطحی سی درج ہیں جن کو حضرت موصوف کی طرف منسوب کرنا اُن پر افتراء سے کم نہیں۔ غرض کہ اس وقت دنیا میں آپ کی ایک ہی تصنیف کشف المحجوب موجود ہے، یہ کتب تصوف میں بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے، اور اس موضوع کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں، جس کو اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہو۔ مزار مقدس آپ کا لاہور کے لیے باعث برکت واعزاز ہے۔

خاک پنجاب از دم اُو زندہ گشت　　　از جبینش آشکار اسرارِ عشق

(اقبال)

شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ

وصال بمقام لاہور ۱۱۷۷ھ

میں اور مجھ عاجز کے والد سید حسن کی نسبت کئی واسطوں سے سید عبدالقادر الحسنی الحسینی الجیلانی رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ یسا کہ درج ذیل ہے۔

''حضرت سید حسن بن سید عبداللہ بن سید محمود بن سید عبدالقادر بن سید عبدالباسط بن حسین بن سید القطب العالم بن سید احمد بن سید شرف الدین قاسم بن شرف الدین یحیٰی بن سید بدر الدین حسن بن سید علاؤ الدین علی بن سید شمس الدین محمد بن سید شرف الدین یحیٰی بن سید شہاب الدین احمد بن سید قطب العالم بن سید صالح النصر بن قطب الدائرہ سید عبدالرزاق بن قطب ربانی غوث صمدانی حضرت سید القادر جیلانی الحسنی والحسینی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعنہم اجمعین۔

اس عاجز کے دادا کا نام سید محمود ہے۔ بغداد سے ملک ٹھٹھ میں تشریف لائے اور وہاں سادات کے خاندان میں سے ایک کے ہاں آپ کی شادی ہوگئی اور عاجز کے والد پیدا ہوئے چونکہ بچپن ہی سے آپ پر محبت الٰہی غالب تھی، اپنے والد ماجد اور بعض دیگر بزرگوں کی خدمت میں مشغول رہ کر ریاضتوں اور مجاہدوں اور صفائیے دل اور عزلت اور تنہائی میں بسر کرتے تھے۔ اپنے والد کے انتقال اور حصول کے بعد عزم سفر کیا۔ ہند اور عرب کی سیر کی، بزرگوں کی زیارت سے مستفید ہوئے۔

اکثر شہروں میں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خلوت میں بیٹھے۔

چلے کاٹے اور فائدے اٹھائے، اس کے بعد سیر کے طور پر ملک پشاور میں تشریف لائے، کچھ مدت بعد باطن میں حضرت غوث اعظم سے حکم ملا کہ تم اسی ملک میں قیام کرو، سیاحت چھوڑ دو اور شادی کرلو۔

اس کے بعد آپ نے غور کیا کہ اگر صحیح النسب سیّدیوں کا کوئی بڑا خاندان ہوتو وہاں شادی کی جائے، چونکہ سید عباس فقیر کے ماموں جو حضرت سیّد علی ترمذی اور سید علی ہمدانی قدس اللہ اسرارہم کی اولاد میں سے صحیح النسب تھے اور پورے متقی و پرہیز گار تھے اور کمالات ظاہری و باطنی میں کامل تھے، ان کی ہمشیرہ سے جو کہ عاجز کی والدہ ہیں۔ حضرت والد ماجد کی شادی ہوگئی اور فقیر پیدا ہوا۔

جب عاجز کی عمر سات سال ہوئی تو بہترا ہی قرآن پڑھا، ضبط نہ ہوا۔ بہت ہی کم فہم اور غبی تھا۔ عاجز کے والد نے باطن میں جناب پیر دستگیر کے حضور میں عرض کی کہ اس لڑکے پر مہربانی فرمائیں، آپ نے مہربانی کی اور علم ظاہر و باطن کا حصہ ملا، اس کے بعد تو خدا کے فضل سے علوم کے دروازے کھل گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ظاہری علوم حاصل ہو گئے۔ چنانچہ انیس سال کی عمر میں مروجہ کتب میں نے پڑھ لیں۔ مطول کو چھ ماہ میں پورا کیا اور دوسری کتابوں کا بھی بڑی سرعت سے مطالعہ کرلیا۔

اثنائے تعلیم میں بھی خاکسار کو طلب حق کا بڑا شوق تھا لیکن حضرت والد ماجد فرماتے کہ تحصیل علم سے فارغ ہو چکنے کے بعد تمہیں کچھ بتلا دیا جائے گا۔ چونکہ فقیر کو طلب بہت تھی، اس لیے فقراء اور مشائخ میں سے جس کا نام سنتا اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

حافظ عبدالغفور نقشبندی پشاور میں ایک درویش تھے۔ فقیر ان کی خدمت میں جاتا اور فیض صحبت سے مستفید ہوتا۔ شیخ یحییٰ قدس اللہ اٹک میں رہتے تھے۔ بڑے ہی

بزرگ تارک الدنیا اور خدایاد آدمی تھے، ہر وقت مراقبہ ہی میں رہتے تھے، میں ان کی صحبت میں جانے اور رہنے لگا۔ شیخ مذکور ساری رات مراقبے میں اور حبس میں گزارتے تھے، کبھی ایک نفس کبھی دو نفس اور کبھی تین یا چار نفس میں رات گزر جاتی تھی۔ دنیا اور دنیا داروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ فقیر پر مہربان رہتے اور توجہ فرماتے تھے۔ بعض باتیں ان سے حاصل ہوئیں۔

میرے والد ماجد کا طریق یہ تھا کہ فقراء اور مساکین کی بے حد خدمت کرتے اور سب کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آتے گویا کہ لوگ آپ کے عیال ہیں۔ ہر روز کئی آدمیوں کو کھانا کھلاتے، کھانا ہر وقت پکتا رہتا اور گھر کے خادم دن بھر تقسیم کرتے رہتے، یہاں تک آدھی رات کو تقسیم طعام سے فراغت ہوتی۔ کھانا کھلانے یا کسی اور چیز کے دینے میں ان کو ذرا ملال نہ ہوتا تھا۔ نقدی اور پارچات بھی دیتے تھے اور خود لوگوں سے کسی چیز کے لیے بھی التجا نہیں کرتے تھے۔ حکام اور بادشاہ وقت سے مدد معاش قبول نہیں کرتے تھے۔ غیب کے خزانوں سے انہیں مدد ملتی تھی، ورنہ ظاہر میں ان کے پاس کچھ نہ تھا، عموماً ضروریات کے وقت باوجود ناداری کے انہیں جو مطلوب ہوتا، مل جاتا تھا۔

بارہا لوگوں نے ایسا دیکھا کہ ذکر اور شغل کی عبادت میں آپ مشغول رہتے درد اور شوق کا اس قدر غلبہ ہوتا کہ اگر کوئی شخص کچھ پڑھتا یا خدا کا نام زبان پر لاتا تو آپ کے آنسو جاری ہو جاتے۔ اکثر روتے رہتے اور جس کو توجہ دیتے اس پر بھی شوق، درد اور شغل کی کیفیت طاری ہو جاتی اسمائے الٰہی کی دعوت کے علم میں بھی کامل تھے۔ اور عالم غیب اور اسمائے کے مؤکل ان کے مطیع و منقاد تھے۔ آخر عمر تک ذکر

مراقبے اور شغل لسانی وقلبی میں مشغول رہے جن عزیزوں کو عمل السماء الٰہی اور وظائف ظاہری کی طلب ہوتی، ان کو اسی قسم کی تلقین فرماتے اور اس کے آثار ظاہر ہوتے، بعضوں کو سلوک باطنی کے طور رارشاد کرتے اور بعض کو جذبہ اور توجہ سے ارشاد فرماتے۔

حضرت غوث اعظم بھی اتبدا میں لوگوں کو دعوت اسماء اللہ اور وظائف لسانی میں مشغول رکھتے تھے۔ وسط عمر میں چونکہ خود بھی سلوک اور شغل باطنی میں مصروف رہے۔ لوگوں کو بھی یہی ارشاد فرماتے۔ آخر عمر میں استغراق اور محویت میں محظوظ تھے اس وقت لوگوں کو جذبہ اور نظر توجہ سے تربیت فرماتے تھے۔ چنانچہ بعضوں کو ایک ہی نظر سے مرتبہ ابدال تک پہنچادیا۔

حضرت والد مرحوم سے بہت خوارق عادات ظاہر ہوتے تھے جو اگر لکھے جائیں، تو اس مختصر میں ان کی گنجائش نہیں۔

احقر نے تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں اس راستہ کو والد مرحوم سے طلب کیا، انہوں نے قبول کیا، اور طریقت اور طریقہ عالیہ قادریہ میں بیعت کر کے شغل اور ذکر کے لیے فرمایا اور خلوت میں بٹھایا۔ چنانچہ چار چلوں تک حضرت والد مغفور کی خدمت میں بیٹھارہا۔ بعض اعمال اور اشغال عمل میں لاکر ایک علیحدہ مکان میں چھ ہفتے تک گوشہ نشین رہا میں ذکر لسانی جہر اور خفیہ طور پر ذکر قلبی و مراقبات کرتا۔ استعداد اور قسمت کے مطابق حالات وارد ہوتے اور اپنے حال کی حقیقت ہمیشہ آپ کے حضور میں عرض کرتا رہتا۔ جو درست ہوتا اس کی تحسین فرماتے اور جس میں غلطی ہوتی اس کا تدارک کرتے۔ اس کی تفصیلات لکھنے میں نہیں آتیں، شغل اور کسب ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ چھ سال کے بعد مہربانی فرما کر اجازت نامہ لکھ کر مرحمت فرمایا۔

اگر چہ اس عاجز کو اتنے بڑے کام کی لیاقت نہ تھی۔ لیکن حضرت والد ماجد کی تعمیل ارشاد سے عذر اور انکار نہ کر سکا جو باتیں ضروری تھیں، میں اپنے آپ میں نہیں پاتا تھا اور اعلیٰ مطلوبہ درجہ پر نہیں پہنچا تھا۔ چھ سال کے بعد جناب والد ماجد کا انتقال ہوا، ۱۱۱۵ھ ماہ ذی قعدہ کی اکیسویں تاریخ کو جمعہ کے دن رحلت فرمائی اور اس عاجز کو خرقہ اور اجازت بخشی اور وصیت کی کہ محتاجوں، فقیروں اور ہر نو وارد مسافر کی خدمت کیا کرنا، لوگوں سے کسی قسم کی اُمید نہ رکھنا۔ امیروں سے کوئی التجا نہ کرنا، جو کچھ بتلایا گیا ہے اس میں لگے رہنا اور جو خدا دے اسی پر قناعت کرنا۔

حضرت والد مرحوم کے انتقال کے بعد خاکسار کو فقیروں سے ملنے، ان کی صحبت میں رہنے اور ان کے طریق کی جستجو کا کمال شوق رہا۔

اسی شہر (پشاور) میں میرے دوست حافظ عبدالغفور کشمیری طریقۂ نقشبندیہ میں بااثر بزرگ تھے، ان سے اکثر صحبت رہتی۔ اگر چہ ان کی صحبت مؤثر تھی لیکن اس سے میری طبیعت کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اٹک میں میرے دوست یحییٰ نامی ایک باکمال بزرگ ہیں۔ وہاں جاؤ، پشاور سے اٹک کو روانہ ہوا اور ان کی خدمت میں پہنچا، بڑی شفقت سے پیش آئے۔ چند روز روز تک آپ کی صحبت نصیب ہوئی، ان کی صحبت میں ذکر قلبی غالب ہوا۔ حبس نفس بہت کرتے تھے۔ رات بھر میں ایک یا دو دم لیتے تھے۔ بڑے ریاضت کش تھے، خدا کے سوا کسی طرف دھیان نہیں دیتے تھے۔ ان کی نظر میں خاک وزر اور شاہ گدا یکساں تھے۔ شغل حق کے سوا انہیں مطلق فرصت ہی نہ ہوتی تھی۔ نہ وہ کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے تھے، نہ کسی کو آپ کی مجلس میں بات کرنے کی جرأت تھی۔ جو بھی آپ کے حضور میں حاضر ہوتا، مہر بلب بیٹھا رہتا۔

صرف خدا کی طرف دھیان جماتا۔ خاکسار کو ان کی صحبت میں بہت فائدہ حاصل ہوا، راتیں بیٹھ کر کاٹتے۔ ذرا نہ سوتے، عشا کے وضو سے عموماً نماز تہجد اور نماز صبح پڑھتے ان کی صحبت بہت مؤثر تھی۔ ان سے اکثر کشف اور خوارق عادت ظہور میں آئے۔ چارپائی پر نہیں سوتے تھے، نہ تکیہ ہی سر کے نیچے رکھتے تھے۔ سفر پیدل کرتے تھے، سوار نہیں ہوتے تھے۔ اپنے مرشد کی زیارت کے لیے لاہور کا چودہ روز کا سفر تین چار روز میں پیدل طے کرتے تھے۔ خاکسار پر آپ کی باطنی توجہ مبذول تھی۔ کبھی کبھی زبان سے بھی کچھ فرماتے تھے، چنانچہ ذکر قلبی اور طریقۂ حبس کی بعض ابتدائی اور ضروری باتیں آپ کی صحبت سے حاصل ہوئیں اور آپ نے بھی طریقہ قادریہ نقشبندیہ کی اجازت خاکسار کو عطا فرمائی۔

اٹک کے گرد و نواح میں میاں نور محمد خاکسار کے ایک دوست رہتے تھے جو ظاہری منصب رکھتے تھے اور شاہ زمانہ مجذوب کی صحبت سے آپ کو کامل جذبہ عطا ہوا تھا۔ جس پر توجہ فرماتے تھے، صاحب حال ہو جاتا تھا۔ ان کی خدمت میں بھی بارہا جاتا رہا، توجہات فرمائیں اور ان کے آثار بھی نظر آئے۔

شاہ محمد فاضل درویش صاحب تاثیر بھی اٹک میں رہتے تھے، ان سے بھی کئی دفعہ صحبتیں رہیں۔

میرے ایک اور دوست شاہ زندہ فقیر تھے جو چالیس سال سے بول و براز نہیں کرتے تھے اور ایک جگہ بیٹھے رہتے تھے۔ بہت کم کھاتے تھے۔ بڑے ہی صاحب کمال تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی، مہربانی فرما کر رخصت کیا۔

کابل کے پرگنوں میں سے جلال آباد کے قریب محمود کامہ ایک جگہ ہے وہاں اخوند محمد نعیم میرے ایک دوست ہیں، ان کو ظاہری اور باطنی علم میں پوری مہارت تھی،

میں آپ سے کتاب تلویح وتوضیح پڑھتا تھا۔ وہ مجھ پر مہربان تھے۔ خاکسار دو ماہ تک تحصیل کی غرض سے ان کی خدمت میں رہا۔ آپ بھی سلسلہ نقشبندیہ کے پیر تھے اور باطن میں جذبہ بھی رکھتے تھے، لیکن نسبت بالفضل کا باطن میں کچھ اثر نظر نہیں آتا تھا۔

پشاور میں چپکل سے شاہ حسین نام شافعی المذہب میرا ایک دوست وارد ہوا بڑا ہی ریاضت کش مرد تھا۔ زبانی وردوں میں پورا شغل رکھتا تھا۔ مجھ پر بڑا ہی مہربان تھا، میں ان کی صحبت میں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کے اوراد کے سماع میں دل پر رقت طاری ہوتی تھی۔ وہ کبرویہ طریقہ رکھتے تھے۔

پوٹھوہار میں میرے ایک دوست شاہ چراغ تھے، وہ بھی پشاور میں آئے ہوئے تھے، کچھ مدت تک ان کی صحبت بھی نصیب ہوئی، وہ قادریہ طریق پر تھے اور دعوت اسما کی دعاؤں اور شغل قلب میں مشغول رہے تھے، مجھ پر بڑی مہربانی کرتے تھے اور اپنے طریق کے متعلق اکثر خاکسار کے سامنے بیان فرماتے رہا کرتے تھے۔

پرگنہ اٹک کے شہر پنڈی میں شاہ لطیف نام ایک مجذوب صاحب کمال اور صاحب کشف رہا کرتے تھے، ان سے اکثر خوارق عادت ظاہر ہوئے، ان کی خدمت میں دو دفعہ جانے کا موقعہ ملا اور ان کے خوارق عادت کو بچشم خود دیکھا، ایک دن آپ نے توجہ باطن بھی فرمائی اور مجھ میں کچھ اثر بھی نمودار ہوا، لیکن ایک دن کے بعد وہ اثر زائل ہو گیا۔

اس کے بعد فقیروں کے دیکھنے کے لیے میں نے ایک لمبا سفر اختیار کیا، گجرات پہنچا، اس کے اطراف، میں نوشہرہ ایک گاؤں ہے، وہاں حضرت شیخ پیر محمد سو سال سے زیادہ عمر کے ایک مسکن بزرگ رہتے تھے۔ اور مریدوں سے حضرت حاجی گلگو ایک بزرگ تھے۔ اس قدر جذبہ تھا کہ توجہ کی ایک ہی نظر سے حرارت۔ ذکر

قلب۔ گریہ اور حال کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ آپ ایک چھوٹے سے باغ میں پڑے تھے۔ خادم آپ کے پاؤں داب رہے تھے۔ میں نے بھی پاؤں دبانے شروع کیے۔ آپ نے فرمایا: یہ کون عزیز ہے کہ مجھ کو اس کے ہاتھ سے ذکر کی آواز آتی ہے؟ دوبارہ یہ کلمہ فرمایا اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ مجھ سے حال پوچھا اور میرے حال پر توجہ اور مہربانی فرمائی، تین دن مجھ کو اپنے پاس رکھا، ہر روز توجہ فرماتے تھے اور اپنے ہاتھ سے فقیر کے منہ میں نوالے دیتے تھے۔ ان کی توجہ سے مجھ میں اثر معلوم ہوتا تھا، لیکن زیادہ نہیں آپ نے مجھ کو اپنی ٹوپی اور چادر دی اور اجازت دے کر رخصت کر دیا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا: کہ ہمارے دوستوں کو جو گوشہ نشین ہیں دیکھتے جانا دو تین دن تک ان کے یاروں کو دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر جانا پڑا، اس کے بعد میں شہر گجرات گیا، اس جذبے سے میں نے اپنے آپ میں کوئی اثر نہ دیکھا، پھر دوسرے دن شیخ کی خدمت میں گیا۔

گجرات کے قریب کنجاہ میں میرے ایک دوست محمد جعفر ایک بزرگ رہتے تھے۔ جس دم میں بڑی مشق بہم پہنچائی تھی، ان کی ملاقات بھی حاصل ہوئی، انہوں نے بڑی سخت ریاضتیں اٹھائیں، میں نے ان ریاضتوں کی خاطر چلہ کشی کی، کچھ فائدہ تو ہوا لیکن کچھ زیادہ اثر معلوم نہ ہوا۔

اس کے بعد میں لاہور میں آیا جو ایک پرانا شہر اور بزرگوں کا مسکن ہے یہاں اولیاء کے بعض مقبروں پر راتیں کاٹیں۔ میں حضرت میاں میر لاہوری کے مقبرہ پر گیا، ان کو دیکھا انہوں نے شغل بتایا اور فرمایا کہ اس میں مشغول رہنا اور کسی دوسرے کو مت بتلانا۔ اس کے بعد میں نے ایک دوست شیخ حامد درویش کی زیارت کی جو پیر علی

ہجویری کے مزار کے پاس ہی دفن ہیں اور اس راستہ کے متعلق ان سے پوچھا۔انہوں نے فرمایا: کہ رات کو حضرت میاں میر صاحب نے جو کچھ آپ کو ارشاد فرمایا ہے، وہ کافی ہے۔

اس کے بعد میں پھر اپنے وطن کی طرف لوٹا اور حضرت میاں میر صاحب اور دیگر بزرگوں کے فرمائے ہوئے مشغلوں میں کوشش کی، لیکن سابقہ اشغال کے سوا جو حضرت ولی نعمی جی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور شیخ یحیٰؒ سے حاصل ہوئے کوئی شغل غالب نہ ہوا۔

لاہور میں خاکسار کے ہم درد دوست میاں جان محمد صاحب بھی ایک بزرگ تھے، وہ محدث تھے۔دعوت اسماء میں صاحب تاثیر تھے۔

میاں جان محمد دوم شہر لاہور کے محلّہ قصاب پورہ میں رہتے تھے، یہ بھی بڑے باکمال بزرگ تھے، ان سے بہت سے خوارق عادت اور کشف ظہور میں آئے۔آپ سہروردیہ طریق پر تھے۔دونوں بزرگوں کی زیارت نصیب ہوئی اور بعض اسماء اللہ کی اجازت حاصل ہوئی۔دعوت اسماء کے سوا کوئی اور باطنی شغل نہیں فرمایا۔

میاں نور محمد مدقق بھی لاہور میں ایک فاضل اجل بزرگ تھے۔زاہد متوکل اور مرتاض تھے، طریقہ قادریہ میں خاص دسترس حاصل تھی۔ان کی خدمت میں ایک ماہ تک صحبت نصیب ہوئی، باطنی اشغال بتلائے اور بعض دوسرے بزرگوں کو بھی وہاں دیکھا۔

میں پشاور لوٹا تو ہندوستان سے شیخ سرور نام ایک درویش پشاور میں وارد ہوئے۔ان سے بارہا ملاقات ہوئی، بعض باتیں بتلائیں جو عمل میں لائی گئیں، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

شہر پشاور کے قریب قصبہ لنڈی میں ایک مرتاض متقی بزرگ رہتے تھے اور عرصہ چالیس سال سے گوشہ نشینی اور عبادت و ریاضت میں مصروف تھے، علم ظاہر و باطن میں شغل رکھتے تھے۔ دولت مندوں کو آپ کی صحبت میں دخل نہ تھا۔ خادم ہمیشہ کلمہ طیب سے رطب اللسان رہتے تھے۔ خود بھی صوفی مشرب اور مؤحد تھے، ان کی صحبت میں بڑا اثر ہوتا تھا، خاکسار اکثر ان کی خدمت میں جاتا اور نصیحت سنتا، لیکن آپ کی خدمت سے مجھے مزید سلوک اور جذبہ حاصل نہ ہوا۔

پھر کچھ مدت بعد سنا کہ حاجی گلگو کے خاندان سے میاں عصمت اللہ ایک بااثر اور صاحب جذبہ بزرگ ہیں، میں ان کی زیارت کے لیے پشاور سے گجرات آیا۔ وہ گجرات سے بھی پندرہ کوس پرے رہتے تھے۔ وہاں پہنچا اور ان کی زیارت حاصل کی، اگرچہ وہ علم ظاہر اور طریقہ سلوک سے بے بہرہ تھے اور طریقت کے اوصاف بھی ان میں نہ تھے، لیکن جذبہ کی نسبت غالب تھی، کبھی سماع کے وقت توجہ کرتے تھے تو حاضرین پر حرکت قلب یا رقت قلب اور گریہ کا اثر ہوتا تھا، بعض عام لوگوں پر رقص اور بے خودی کی حالت طاری ہو جاتی تھی، میں بھی آپ کی صحبت سے مستفید ہوا، ان کی مجلس میں اکثر رقت قلب حاصل ہوتی تھی، اگرچہ حرکت قلب پہلے بھی بہت تھی لیکن گریہ اور درد ان کی صحبت میں زیادہ ہوا۔ چند روز میں وہاں رہ کر رخصت ہوا۔ گھر پہنچ کر بہت کم اثر باقی رہ گیا۔ ایک سال بعد میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، پھر اثر بڑھ گیا۔ جب لوٹتا تھا، پھر کم ہو جاتا تھا۔ یونہی بارہ سال تک ان کی خدمت میں بار بار آتا جاتا رہا، لیکن اثر کا وہی حال رہا۔ البتہ! سماع کے وقت بڑھ جاتا اور اس کے بعد وہی پہلی نسبت قائم رہتی۔

اس کے بعد شاہ جہاں آباد کی طرف جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بھی میاں شیخ محمد چشتی صاحب وجد وحال ایک بزرگ تھے، ان کی خدمت سے بعض مفید باتیں حاصل ہوئیں۔

شیخ کلیم اللہ نام ایک چشتی فقیر کو دیکھا۔ بڑے عالم و عارف اور زاہد تھے۔ ان سے بہت صحبت ہی۔ کتاب لقیمات جوانہوں نے سلوک میں تحریر فرمائی ہے، مجھے عنایت کی۔ اس میں اکثر اشغال واذکار درج ہیں، زبانی بھی بیان فرمائے۔ لیکن اس میں سے کچھ بھی غالب نہ ہوا۔

سید بھیک نام چشتی کئی ہزار مرید رکھتے تھے اور خادم عموماً پچھلی رات کو ذکر جہر کا بڑا شغل رکھتے تھے، حال بہت رہتا تھا۔ عمر رسیدہ اور مجرد تھے۔ ان کی خدمت میں بھی میں چند روز رہا اور طریقہ چشتیہ کے بعض طریقوں سے مستفید ہوا۔ چنانچہ ذکر سہ پایہ بہشت رکنی اور محموداً اور نصیراً کا شغل اور ان کا طریق اور فائدہ ان کی خدمت سے حاصل ہوا، بہت مہربان ہوئے اور رخصت کیا۔

اس کے بعد سرہند میں حضرت شیخ احمد سرہندی کے پوتوں میں سے صبغۃ اللہ نام کے ایک بڑے بزرگ اور باکمال رہتے تھے صاحب ارشاد متبرک اور مسن صاحب تاثیر تھے، طریقہ نقشبندیہ میں اپنی آپ نظیر تھے۔ ان کی زیارت بھی نصیب ہوئی میرے حق میں مکرر خاص توجہ فرمائی، آپ کی صحبت بڑی مؤثر تھی۔

اس کے بعد حضرت میاں عبدالاحد عرف میاں گل کی زیارت حاصل ہوئی۔ یہ بھی حضرت شیخ احمد سرہندی کی اولاد سے تھے، ان کی صحبت بھی موثر تھی۔ تھوڑے عرصہ میں سالک کو سلوک کامل کرادیتے تھے اور حال خوب ہوتا تھا، فقیر پر بڑی مہربانی

کی اپنے دادا کے مزار کے پاس لے جا کر توجہ فرماتے تھے، ان کی صحبت میں بھی اثر معلوم ہوا اور سلوک کے بعض مقامات زبانی بھی بیان فرمائے اور رخصت کے وقت ایک کتاب معجزات نبوی علیہ السلام جو ان کی اپنی تصنیف تھی، فقیر کو دی۔

نیز شاہ مرتضےٰ ساکن سکندرہ کے خادموں سے اکبر آباد میں شاہ مشتاق مجذوب رہتے تھے۔ ان سے ملا، ہر وقت اپنے حال میں غرق زمین پر لیٹے رہتے تھے۔ کبھی اٹھتے تو پانی اور روٹی کا ٹکڑا کھا لیتے تھے، وہ بھی ایک مہینے یا نصف ماہ بعد، ورنہ نہیں مانگتے تھے۔ دائم الاستغراق اور دائم السکر رہتے تھے، کبھی کبھی مجذوبانہ طریقہ پر کلام کرتے تھے۔ لیکن باطن کا اثر اور جذبہ مجھ پر ظاہر نہیں ہوا اور مجذوبوں سے فائدہ بھی کم ہی ہوتا ہے۔ دیگر سالکوں بزرگوں۔ مجذوبوں، صالحین اور مرتاض لوگوں کی کثرت سے زیارات حاصل ہوئیں۔ سب مہربانی سے پیش آئے اور جس قدر قسمت میں تھا کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا رہا۔ مگر میری دلی مراد پوری ہوئی، پر نہ ہوئی۔

ہمہ شب بزاریم شد کہ صبا ندا بوئے
نہ دمید صبح نجستم چہ گناہ نہم صبارا.

پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر اجمیر گیا، کچھ دن اجمیر میں کاٹے۔ آپ نے باطن میں مہربانی فرمائی اور بڑی توجہیں عنایت کیں۔

پھر میں جہان آباد میں لوٹا تو خواجہ قطب الدین کے مزار پر کچھ مدت گزار دی۔ انہوں نے عنائتیں اور مہربانیاں کیں۔ دوسرے بزرگوں کے مزارات پر بھی کچھ مدت رہا، پھر پشاور کو واپس ہوا۔

حضرت سید محمد گیسو دراز ساکن شاہ جہان آباد کی اولاد سے میر سید یداللہ نام

ایک بزرگ میرے دوست تھے، نوکری اور سپہ گری کرتے تھے۔ بہادر شاہ کے ساتھ پشاور میں آئے۔ علم تصوف اور حقائق و معارف کے بیان میں ماہر کامل تھے۔ چنانچہ فصوص الحکم و فتوحات مکی اور دوسری تصوف کی کتابیں انہیں از بر تھیں اور شیخ محمد اعظم درویش ساکن دکن فوجی ملازمت کے سلسلے میں تھے۔ عموماً میر سید یداللہ اور یہ دونوں مل کر فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ تصوف کی کتابوں میں پوری مشق رکھتے تھے، اس نے بھی شیخ مذکور سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مجھے ان دوستوں سے بھی ملاقات کا موقعہ ملا۔ مگر ان دوستوں میں عمل اور حال کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ممکن ہے ان میں ہو لیکن مجھے معلوم نہ ہوا ہو، ہاں حقائق و معارف کے مقدمات کے بیان اور تصوف کی کتابوں میں تو یہ بے نظیر تھے، میں بھی ان دنوں فصوص کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی، ان عزیزوں کے پاس جا کر بیان کرتا اور شافی جواب پاتا، چنانچہ دوبارہ فصوص کا مطالعہ ہوا اور خدا کے فضل سے اپنی سمجھ اور لیاقت کے مطابق سمجھا گیا۔ لیکن دو مقام میں شبہ باقی رہا۔ ایک تو وجود مطلق کی تحقیق اور اس سے کثرت کے ظاہر ہونے کی کیفیت، دوسرے خاتم الاولیاء کا مسئلہ (جیسا کہ شیخ کہتا ہے کہ خاتم الانبیاء بھی مرتبہ ولایت میں خاتم الاولیاء سے فیض حاصل کرتا ہے) میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آخر ایک رات حضرت شیخ ابن عربی اور شیخ صدر الدین قونوی کو جو شیخ اکبر کے اجل اصحاب سے تھے، مع مولوی جامی کے خواب میں دیکھا، خدا ان سب پر رحمت کرے جنہوں نے ان دونوں مسئلوں کو خاکسار کے سامنے حل کر کے بیان کر دیا اور سمجھا دیا۔ جب میں جاگا تو پوری تسلی حاصل تھی، بلکہ اس خواب کے ذریعے جو قضیہ عالم میں وارد ہوتا ہے ایسا صاف ہو جاتا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی

ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا اپنے وجدان سے حاصل ہوا ہے۔ پس بزرگوں کے باطن سے اس علم کے مسئلے ایسے واضح ہو گئے کہ اب ذرا بھی شبہ باقی نہ رہا اور جو شخص ان مسئلوں میں تصرف کرتا ہے اس کا منشائے شبہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ بے سمجھی کے باعث ہے اور فوراً اس کا جواب بھی سوجھ جاتا ہے، ذرا بھی سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گویا اس علم کے مسئلے حاضر ہیں، چنانچہ اس علم میں کئی رسالے بھی لکھے گئے، ان میں ایک اسرار التوحید نام عربی میں ایک کلاں رسالہ ہے۔ دوسرا فارسی رسالہ تصوف میں ہے اور بعض وجدانی حقائق بھی درج کیے گئے اور ایک اور رسالہ جس میں طریق تحصیلِ طریقت درج ہے، لکھا گیا۔ اور اب تو ان مسئلوں کے بیان کرنے اور لکھنے سے طبیعت سیر ہو گئی ہے۔ ہاں! کوئی قابل آدمی ملے یا کوئی طالب صادق، اس علم کے سمجھنے والا آ جائے تو اسے کچھ بتلا دیا جائے گا۔ اگرچہ علم الیقین اور عین الیقین سے تو معلوم ہو گیا لیکن ذوقی علم اور حق الیقین کے درجے ابھی بہت ہیں، آرزو ہے کہ اعلیٰ درجہ پر پہنچیں۔ واللہ الموفق

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی

سلطان محمد علاؤ الدین خلجی کے عہد عظمت نشان میں ہمارے جد امجد ''آغا محمد'' ترک بخاری اپنے وطن ''بخارا'' سے دہلی تشریف لائے۔ چوں کہ یہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے، اس لیے بہت سے ترک جو آپ کے رشتہ دار، مرید اور تابع تھے، وہ بھی آپ ہی کے ساتھ ''بخارا'' سے دہلی آ گئے۔ بادشاہ کی نظر عنایت کے باعث عزت و عظمت کے بلند ترین منصب و مرتبہ پر فائز ہوئے۔

علاؤالدین خلجی ممالک گجرات سر کرنے کے ارادہ سے نکلا اور اپنے ساتھ چند امیروں اور آپ کو بھی ہمراہ لیا۔ راستہ میں اس نے پڑاؤ ڈالا اور یہیں ایک دن اس کے مصاحبوں اور رفیقوں سے کسی معاملہ میں رنجش پیدا ہوئی، چنانچہ وہ بحکم الٰہی اپنے ان تمام اُمرا سے کٹ کر جد امجد ''آغا محمد ترک'' کی جانب مزید متوجہ ہوا اور پہلے سے زیادہ منصب وعہد پر سرفراز کیا۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت کے بعد سلطان قطب الدین اور سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں جد امجد کے تمام فرزند جو ذاتی فضیلت و برتری اور کمال میں سر آمد روزگار تھے، سب کے سب دولت و نعمت سے سرفراز ہوئے۔ اور اپنے اپنے زمانہ کے عزت دار دولتمند کہلائے اور مال و فرزند دنیاوی زندگی کی زینت ہیں'' کے اس حکم الٰہی کے پیش نظر ان سب نے داد عیش دی اور بامراد کامیاب رہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک سو ایک نرینہ اولاد دی۔ ان کے علاوہ آپ کی زندگی میں آپ کے

پوتے وغیرہ اور بھی تھے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد آپ کے تمام بیٹے بحکم الٰہی انتقال کر گئے، جن میں سے اللہ کی حکمت بالغہ نے آپ کے صرف ایک بڑے بیٹے ''ملک معز الدین'' کو زندہ رکھا تمام فرزندوں کی وفات کی وجہ سے آپ کی آسائش و فراغت سب کی سب رنج و غم سے بدل گئی، آپ نے ملک کے اعلیٰ رتبہ اور تمام لاؤ لشکر وغیرہ کو چھوڑ کر سیاہ لباس پہنا اور شیخ صلاح الدین سہروردی[1]'' کی خانقاہ میں بغرض اعتکاف بیٹھ گئے۔ ایک عرصہ بعد بشارت ہوئی کہ موجودہ فرزند ملک معز الدین'' کی بکثرت اولاد ہوگی، اور رہتی دنیا تک ان کی اولاد باقی رہے گی۔ اللہ نے ملک معز الدین'' کو ان کے سو بھائیوں کی فضیلت، استعداد اور نعمتوں سے مالا مال کیا اور بے انتہا صلاحیتوں سے نوازا، اور اپنے بیٹے ''ملک موسیٰ'' کو اپنی دولت وغیرہ حوالے کر کے ۷۳۹ھ میں وفات پائی۔ عیدگاہ شمسی [2]'' کے عقب میں آپ کا مزار ہے۔

''ملک موسیٰ'' بھی مملکت کے بڑے عہدہ دار اور رئیس وقت تھے، ''ماوراء النہر'' گئے، اور وہاں سے ''صاحب قرآں امیر تیمور گورگاں'' کے معزز عہدیدار کے طور پر ''دہلی'' تشریف لائے۔ اور اپنے آباء واجداد کا سلسلہ تازہ کیا اور ''دہلی'' ہی کو وطن بنالیا۔ ان کی اولاد میں سے پھر کوئی باہر نہیں گیا۔ ''ملک موسیٰ'' کے کئی فرزند تھے، جن میں ایک کا نام ''شیخ فیروز'' تھا جو میرے والد کے حقیقی دادا تھے۔ ''یہ شیخ فیروز'' تمام فضائل ظاہری و باطنی سے موصوف تھے اور دینی و کسبی نعمتوں سے مالا مال تھے۔ فن سپہ گری میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ جنگی ترکیبوں میں اپنی قوت طبع، جودت اور سلیقہ

---

۱ آپ کا مزار حضرت مخدوم شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مزار پُر انوار کے قریباً ہے اور ۲۲ صفر کو عرس ہوتا ہے۔

۲ واقع دہلی

کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ تعلیم، شاعری، دلیری، سخاوت، ظرافت ولطافت، عشق ومحبت اور دیگر تمام عمدہ صفات میں لاجواب تھے۔ نیز دولت وحشمت، جاہ وعزت سرفرازی و عظمت میں یکتائے روزگار تھے۔ ہمارے گھر میں شیریں کلام، ذوق شاعری اور خوش طبعی آپ ہی کی وجہ سے ہے۔ آپ اوائل عہد حکومت ''سلطان بہلول'' بقید حیات[1] تھے آپ نے ''سلطان حسین شرقی'' کی آمد اور ''سلطان بہلول'' سے جنگ کا قصہ نظم کیا ہے، جو ہمارے پاس تھا، لیکن اس وقت موجود نہیں ہے۔ البتہ! اُس کے دو شعر یاد ہیں جو منجانب ''حسین شرقی''، ''سلطان بہلول'' کو مخاطب کرتے ہوئے کہے ہیں۔

ایا قابض شہر دہلی شنو
حیاتت چوخواہی ازیں جابرو
منم قابض ملک ماراست ملک
خدا داد مارا خدا راست ملک

شیخ فیروز ۸۶۰ھ میں بھرائچ گئے تھے، جہاں جنگ میں شہادت پائی، اور وہیں دفن ہوئے، جنگ میں جاتے وقت آپ کی اہلیہ محترمہ نے کہا کہ میں امید سے ہوں، آپ نے جواب دیا انشاء اللہ بیٹا پیدا ہوگا اور اس سے بکثرت اولاد ہوگی۔ پیٹ کے فرزند اور تم دونوں کو اللہ کے سپرد کیا، جنگ میں نہ معلوم کیا ہو۔ غرضیکہ اللہ نے ان کو بیٹا دیا، جن کا نام ''شیخ سعد اللہ'' تھا وہ میرے حقیقی دادا تھے۔ یہ بھی اپنے والد بزرگوں کی طرف فضیلت لطافت وظرافت، خوش مزاجی، عشق ومحبت وغیرہ میں ہمہ صفت موصوف تھے۔ بچپن ہی میں آپ کے چہرہ بشرہ سے رُشد وہدایت اور بزرگی کے آثار

---

[1] بہلول لودھی کا دور حکومت ۸۵۵ھ ۱۴۵۱ء سے ۸۹۴ھ ۱۴۸۸ء تک ہے۔

ظاہر تھے، دولت علم سے فراغت کے باعد مصباح العاشقین شیخ محمدؒ ملکن کے مرید ہوئے، جو اپنے وقت کے کامل شیخ و بزرگ تھے......غرضیکہ ''شیخ سعد اللہ نے بروز جمعہ ۲۲۔ ربیع الاوّل کو وفات پائی، اور اس وقت میرے والد صاحب ''شیخ سیف الدین'' کی عمر آٹھ سال کی تھی۔

غرضیکہ دادا صاحب کے وصال کے بعد میرے والد بزرگوار ''شیخ سیف الدین'' میں اپنی ذاتی استعداد اور والد کی دُعا و برکت سے آثارِ ترقی و قبول جھلکنے لگے۔ آپ نے اپنے بھائیوں کی موجودگی میں اپنی والدہ کی ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ سے خوب خدمت کی، خرچ کی تنگی اور حالات کے موانع کے باوجود تعلیم حاصل کرنے لگے۔ شاعری، فضیلت، قبولیت، ذوق وشوق، محبت والفت، خوش مزاجی، بے تعلقی، وارستگی، خوش کلامی، حضور قلب، ذکر الٰہی، لطائف وظرائف، باریک بینی و دور رسی میں یکتائے زمانہ اور ملک کے لیے باعث افتخار ہوئے۔

والد بزرگوار اس چیز کی مانند تھے جس سے پانی ٹپکتا ہو، اور ذرا سا دھکا لگنے پر بہنے لگے۔ وہ بڑے ہی رقیق القلب اور سریع التاثیر تھے، جب درد و محبت کی کوئی گفتگو ان کے سامنے کی جاتی تو وہ متاثر ہو کر گریہ وزاری کرنے لگتے تھے۔ میں نے ''خیام'' کی یہ رباعی جب اُن کے سامنے پڑھی تو اُن پر گریہ کی کیفیت اور جذبہ طاری ہو گیا، حالانکہ میں اس رباعی کو روزانہ بارہ مرتبہ پڑھتا ہوں۔

ایں کوزہ چو من عاشق زادے بودہ است
دربند سر زلف نگارے بودہ است
ایں دست کہ در گردن اوی بینم
دستے است کہ در گردن یارے بودہ است

میرے والد بزرگوار (شیخ سیف الدین) اور عم کلاں (شیخ رزق اللہ[1]) کی یہ حالت تھی کہ یہ دونوں جب کسی کی جانب توجہ کرتے، یا اس کی تربیت فرماتے اور طالب میں ذرا سی بھی قابلیت ہوتی تو وہ متاثر ہو کر اثرات تربیت اور توجہ قبول کرتے ہوئے لیاقت مآب ہو جاتا۔ مجھ فقیر کو یقین ہے کہ انہوں نے اپنی محبت والفت کی خاص نظروں اور عنایت فرمائیوں سے جو انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، مجھے مخصوص فرمایا۔ مجھے یاد ہے کہ والد بزرگوار کے سامنے میں ایک دن ایک علمی مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا، وہ میری جانب متوجہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھ میرے منہ پر ملتے ہوئے مجھے دُعا دی۔ اور فرمایا "مجھے تمہارے چہرہ پر ایک تجلی اور نور جھلکتا ہوا دکھائی دیا، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔" اللہ جانتا ہے کہ وہ کیا کیفیت تھی؟...... آپ ۲۷ رشعبان ۱۹۹۰ھ کو رحمت حق سے پیوستہ ہو گئے۔ بعض لوگوں نے آپ کی تاریخ وفات "ولی تحت القباب" بھی نکالی ہے۔[2]

والد بزرگوار اپنے بڑھاپے، کمزوری اور اخیری زمانہ میں میری دل جوئی کی جانب زیادہ متوجہ تھے۔ جوانی ختم ہو جانے اور دوستوں کے مر جانے کی وجہ سے وہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے، اس زمانے میں میری عمر تقریباً چار سال کی تھی۔ میں آپ کی بیماری میں ان کے غم اور تکلیف کو دور کرنے میں مشغول رہتا، آپ رات دن شفقت وعنایت فرمایا کرتے، انہیں دنوں جبکہ میں بچہ تھا، صوفیوں کے اقوال سناتے اور میری باطنی تربیت کرتے۔ اور میں بھی فطری طور پر ان باتوں کے سننے کا متوالا تھا۔

---

[1] آپ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور بیس ربیع الاول ۹۸۹ھ میں وفات پائی۔

[2] آپ شیخ امان پانی پتی (متوفی ۹۹۷ھ، ۱۵۵۰ء) کے مرید تھے اور سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو کر بالکل ازخود رفتہ ہو جاتے۔

میرے والد شیخ سیف الدین کو فقر و فنا اور توحید و تجرید کا کافی حصہ ملا تھا۔ وہ تکلف و تصنع سے بالکل پاک تھے۔ نگاہ میں ایسا اثر تھا کہ جس پر توجہ کی، خالی نہ گئی۔ اور اس کو حسب استعداد فائدہ پہنچا۔ وہ وحدت وجود پر اعتقاد رکھنے والے صوفیہ میں سے تھے، ابن عربی قدس سرہٗ کے تابعان میں تھے، اس طبقہ کے علم میں اونچا مرتبہ اور بلند درجہ رکھتے تھے۔ مسئلہ وجود پر بڑی شافی تقریر کرتے تھے اور اسرار توحید کو کھلم کھلا بیان کرتے تھے۔

زمانہ طفلی میں انہوں نے مجھے حضرات صوفیہ کے اقوال بتائے اور شفقت ظاہری کے ساتھ باطنی تربیت کا برابر خیال رکھا۔ میں بھی بہ تقاضائے فطرت اُن کا دلدادہ تھا۔ جب وہ ذرا خاموش ہوتے میں کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بھول جاتا اور واقفان اسرار کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کی استعداد کرتا۔ ان میں سے بعض باتیں اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک حافظہ میں موجود ہیں، یہ امر بہت غیر معمولی ہے۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ فقیر کو اپنے دودھ چھٹنے کا زمانہ جبکہ عمر دو ڈھائی سال کی ہوگی ایسا یاد ہے، جیسے کہ کل کی بات۔ اسی زمانہ میں جب کہ والد کی تعریف و عنایت کا فیض جاری تھا، میں تحصیل علم کر چکا تھا اور ان کی خدمت میں علمی بحث و تکرار میں مصروف رہتا تھا۔ اسی شغل میں راتیں گزر جاتی تھیں۔ والد ماجد فقیر کو خصوصاً تلقین توحید اور تحقیق مسئلہ وحدت الوجود میں شرف مکالمت عطا کرتے اور خوش ہوتے تھے۔

میرے والد نے سب سے پہلے قرآن مجید بے سابقہ تعلیم قواعد تہجی کے (جس طرح لڑکوں کو عموماً پڑھایا جاتا ہے) دو تین جزو بلکہ اس سے کم تعلیم فرمائے

تھے۔ وہ سبق لکھتے تھے میں پڑھتا تھا۔ قرآن کی یہی مقدار میں نے اُن سے سبقاً پڑھی ہے۔ اس کے بعد ان کی تربیت وشفقت کے اثر سے ایسی قوت بہم پہنچی کہ ہر روز تھوڑا سا قرآن پڑھنے لگا۔ اور جتنا پڑھتا تھا اُن کو سُنا دیتا تھا۔ غرض دو تین مہینے میں قرآن شریف ختم کرلیا...... اور تھوڑی مدت میں اگر ایک مہینہ کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا، کتابت اور انشاء کا سلیقہ پیدا ہوگیا۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ اُن (والد ماجد) کی توجہ اور عنایت کا اثر ہے۔ اور نظم کی اُن کتابوں میں سے جو اُس ملک میں مروج ہیں، شاید گلستاں بوستاں کے چند جز واور دیوان حافظ (والد ماجد نے) پڑھایا ہو۔ اور لڑکپن ہی سے قرآن پاک ختم کرنے کے بعد میزان الصرف سے مصباح وکافیہ تک خود تعلیم دی۔ اور پڑھاتے وقت اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ انشاء اللہ تو جلد ہی عالم بن جائے گا۔ اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے، جس وقت یہ تصور کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو اس کمال تک پہنچادے کہ جو میں نے خیال کیا ہے۔"

اور یہ بھی فرماتے تھے (اپنے والد کی طرف اشارہ کرتے ہیں) کہ ہر ایک علم میں سے مختصر پڑھ لوگے تو تم کو کافی ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد برکت اور سعادت کے دراز ے تم پر کھل جائیں گے اور تمہیں سارے علوم بے تکلف حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ارشاد پاک نے یہ اثر کیا کہ تحصیل علوم میں مجھ کو ایسی سرعت حاصل ہوئی کہ جس کو طی زمان اور طی مکان کہتے ہیں، ہر علم حاصل ہوگیا۔ یعنی مختصرات نحو مثل کافیہ ولب وارشاد وغیرہ، شاید ایک ایک جزو بلکہ زیادہ یاد کرتا تھا اور اتمام تحصیل علم کے لیے اس قدر بے چینی تھی کہ اگر کوئی جزوان مختصرات کا صحیح اور محشی مل جاتا تھا تو اس کو خود مطالعہ کر لیتا۔ حاجت اُستاد سے پڑھنے یا دریافت کرنے کی نہ ہوتی۔

اگر بحث آسان ہوتی یا مضمون سے پہلے واقفیت ہوتی تو میرا فکر اس کو قبول نہ کرتا۔ خدا جانے کہ ان دنوں میں کیا سمجھتا تھا اور کیا دیکھتا تھا۔ لیکن ہر کتاب کے متن اور حاشیئے اور ان کے الفاظ سے پورا فائدہ حاصل کرتا تھا اور جو کتاب میرے ہاتھ آتی یا جزو کسی کتاب کا ملتا، خواہ میرے پڑھے ہوئے ہوتے یا نہ ہوتے، اُس کو اوّل سے آخر تک دیکھنا اپنے اوپر واجب کر لیتا تھا، اور میں اس امر کا مقید نہ تھا کہ شروع یا خاتمہ کتاب ملے تو دیکھوں۔ میری نظر تحصیل علم پر تھی، خواہ کسی طرح پر ہو۔

ایک مرتبہ جبکہ میں کافیہ وغیرہ پڑھا کرتا تھا، میرے ساتھی اس بات پر گفتگو کر رہے تھے کہ حصول علم کے بعد کیا کرو گے اور اس کی تحصیل سے ان کا مقصد کیا ہے؟ بعض نے بناوٹ کے طور پر کہا، ہمارا مطلب تو معرفت الٰہی ہے۔ بعض نے سادگی کے ساتھ صاف صاف کہا، ہمارا مطلب تو دنیا طلبی ہے، پھر مجھ سے پوچھا، بتاؤ تم کیا کرو گے؟ میں نے کہا میں بالکل نہیں جانتا کہ تحصیل علم سے معرفت الٰہی حاصل ہو یا اسباب لہو۔ بالفعل مجھے یہ ذوق ہے کہ معلوم کروں کہ اتنے عقلاء اور علماء جو گزرے ہیں کیا کہتے ہیں؟ اور کشف حقیقت معلومات میں کس قدر موتی پروئے ہیں۔ اور اس کے حاصل کرنے کے بعد کیا حالت ہو گی یعنی حظ نفس کی طرف گئے یا محبت مولیٰ یا تحصیل دنیا یا طلب عقبیٰ کی طرف۔

بچپن سے میرا یہ حال ہے کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ کھیل کود کیا ہے؟ خواب مصاحبت، آرام اور آسائش کے کیا معنی ہیں؟ نہیں جانتا کہ سیر کیسی ہوتی ہے؟۔

شب خواب چہ و سکوں کدامست
خود خواب بعاشقاں حرامت!

تحصیل علم میں مشغولیت کی بنا پر کھانا کبھی بروقت نہیں کھایا اور نید بھر کر نہیں سویا۔ میرے جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اور گرمی کے جھلسا دینے والے جھونکوں میں ہر روز دربار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا، جو ہمارے مکانوں سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ دو پہر کو تھوڑی دیر گھر ٹھہر کر چند لقمے ضرورتاً کھالیتا۔

میرے والدین ہر چند کہتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے محلّہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیل لو اور وقت پر سو جاؤ۔ میں کہتا تھا آخر کھیلنے سے مقصد دل کا خوش کرنا ہی تو ہے۔ میری طبیعت اسی سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں۔ عام طور پر ماں باپ بچوں کو پڑھنے اور مکتب جانے کی تاکید اور تنبیہ کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی ترغیب دیتے تھے کبھی، مطالعہ کے دوران میں ایسا بھی ہوا ہے کہ آدھی رات گزر گئی ہے۔ میرے والد نے مجھ سے فریاد کی ہے کہ بابا! کیا کرتے ہو۔ میں سنتے ہی فوراً لیٹ جاتا کہ جھوٹ واقع نہ ہو اور کہتا کہ میں سوتا ہوں۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ جب وہ مطمئن ہو جاتے تو پھر اُٹھ بیٹھتا اور مشغول ہو جاتا۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود مطالعہ تذکرہ اور بحث و تکرار میں بیش تر وقت منہمک رہنے کے، جو کتابیں پڑھتا تھا بلکہ ان کے علاوہ شروح و حواشی بھی جو نظر سے گزرتے تھے۔ ان کے لیے بھی لکھنے کی مشق کو ضروریات وقت سے شمار کرتا تھا۔ رات کا زیادہ حصہ اور تھوڑا حصہ دن کا مطالعہ میں گزرتا تھا۔ اور تھوڑا حصہ رات کا اور زیادہ حصہ دن کا لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے بعد قرآن مجید کے حفظ کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی اور میں نے ایک سال اور کچھ دنوں میں اس نعمت کو حاصل کرلیا۔ اگر اس قدر ذوق و شوق کا اظہار ریاضت اور طلب مولیٰ میں

ہوتا تو میں کیا کیا حاصل کر لیتا۔

پروردگار عالم نے جس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا میرے بس میں نہیں۔اس نے مجھ غریب کو اپنے ذوق وشوق کی اس حالت سے مخصوص اور مالا مال کیا ہے کہ میرا دل اور میرا تمام وقت صرف اس کے حضور میں مشغول رہتا اور لوگوں کے میل جول وغیرہ سے الگ ہوں۔ میں اپنے خیال میں مگن ہوں اگر چہ وہ رازہائے سربستہ کا سرہی ہو یا مالیخولیا، لیکن یہ مقطع میرے حالات کا آئینہ دار ہے۔

حقی کجا و صحبتِ کس کز خیال درست

دارم بخود چومردم دیوانہ عالمے

والد ماجد کی وصیت کہ ''ملائے خشک ونا ہموار نباشی'' کے مطابق میں بچپن ہی سے ہمیشہ عشق ومحبت کا دم بھرتا ہوں اور غم خواری و دردمندی کی راہ پر گامزن ہوں۔

بے درد نہ ایم ہرگز از عشق

دائم دلِ دردناک داریم

گزشتہ زمانے میں ایک عرصہ تک عقل کی مزاحمت کی وجہ سے توحید[1] کی صورت نظر نہ آئی اور نقشۂ مقصود بحالتِ درستی وصفائی حاصل نہ ہو سکا۔ حالاں کہ طلب گاران حقیقت کے لیے شرط اوّلین یہی ہے کہ توحید الٰہی ان کو حاصل ہو جائے۔ آخر کار جب مخلوق کے مشوروں سے مقصود بر آری نہ ہوئی اور عقل کی تدبیروں سے گتھی نہ سلجھی، تو اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کے اور دیوانگی اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

---

[1] توحید وجودی

زیں خرد بیگانہ می باید شدن
دست در دیوانگی باید زدن

غرض کہ راحت و آرام کے حصول اور خطرات و وساوس کے زوال کے بعد...... میں تمام کاموں سے ہاتھ دھو اور اغیار سے آنکھیں بند کر کے ''درِدل'' پر اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ اب کیا ہوتا ہے اور کون سا راستہ کھلتا ہے؟ چنانچہ بے بسوں کے چارہ گر اور پریشان لوگوں کے راہنما نے مجھے اپنی طرف بلا لیا اور اس بے خانماں کی گردن میں زنجیر شوق ڈال کر اپنے گھر کی طرف کھینچ لیا، اور مجھ نامراد کو منزل مراد پر پہنچا دیا۔ یعنی اپنے حبیب ﷺ کی بارگاہ میں مجھے جگہ دی۔ ۹۹۶ھ میں (سفر حج کا) جذبہ پیدا ہو گیا، اور دل پر وحشت طاری ہو گئی۔ دیوانگی کی حالت میں سفر کا ارادہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔

مجھ فقیر حقیر کو حضرت خبیر و بشیر و نذیر ﷺ کے انعامات و اکرامات سے جو کچھ بشارت ملی ہے، وہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ اور یقین ہے کہ یہ آثار و انوار نیک لوگوں کے لیے انشاء اللہ ضامن و کفیل ہوں گے۔

مجھے بارہا بشارت غیبی سے ارشارہ ہوا کہ ''وابتغوا الیہ الوسیلہ'' اور اس فضیلت کے حاصل کرنے کے لیے جس وسیلہ و نسبت کی ضرورت ہے، وہ سلسلہ ارادت ہے۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی سے باطنی طور پر دینی نسبت قائم کروں اور قرابت جسمانی کو رشتہ روحانی سے منسلک کروں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی پوری زندگی اُس کے قدموں پر گزار دوں۔ بالآخر میرے صدق نیت نے کام کیا اور میرا درخت مراد بارآور ہوا۔ اور ''یرزقہ من حیث لایحتسب '' کے مثال،

اللہ نے میرے لیے ایک عیسیٰ نفس کو بھیجا، جن کا ہر سانس آسمان معرفت سے نازل ہونے والا خوانِ نعمت تھا اور اگلے پچھلوں کے لیے عید و سرور۔ موسیٰ مقام جن کا جمال شجرِ وحدت کی آگ اور حقیقت کا نور ہے، زین العابدین و امام الصارفین السید النقی التقی والعلوی العلی المہدی اسمی[1] کلیم اللہ و محبوب حبیب اللہ[2]

غرض کہ جب یہ آفتابِ دین و دولت طلوع ہوا تو میں نے یقین کرلیا کہ یہ میرے ہی مقدار میں ہے۔ اور جوں ہی ان کے جمال جہاں نما سے آنکھیں روشن ہوئیں تو دل میں کچھ اور ہی نور و سرور جلوہ گر ہوا پہلی ملاقات میں دل ہاتھ سے جا تا رہا

مدتے بود کز مشتاق لقایت بودم
لاجرم رُوئے ترادیدم واز جارفتم

چنانچہ بے اختیار ہو کر بغیر کسی توقف کے میں نے اُن کی بیعت کرلی اور اُن کی خدمت کرنے لگا۔ اور یہ واقعہ ۹۸۵ھ، ۱۵۷۷ء کا ہے۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

حقا بیان شوق بپایاں نمی رسد
کوتاہ ساز قصۂ دور و دراز را

(ماخوذ از اخبار الاخبار و حیات شیخ عبدالحق از خلیق احمد نظامی)

حضرت شیخ محدث محرم ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۱ ربیع الاوّل ۱۰۵۲ھ کو ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ مزار مبارک دہلی میں ہے۔

---

1. ہم نام
2. یعنی حضرت سیّد موسیٰ پاک شہید گیلانی ملتان (متوفی ۱۰۰۱ھ) بن حضرت سیّد حامد معروف بہ حامد گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۷۸ھ، ۱۵۷۰ء)

حضرت موصوف علیہ الرحمۃ کی تصانیف ساٹھ سے زائد ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں۔ مدارج النبوۃ۔ اخبار الاخیار۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب۔ اخبار الاخیار فی احوال الابرار۔ اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ۔ شرح فتوح الغیب وغیرہ۔ آپ بہت بلند پایہ شاعر بھی تھے، حقی متخلص تھا۔

مولوی فقیر محمد جہلمی

چوں کہ نعمائے الٰہی کے تذکرہ وشکریہ میں نہ صرف فرمان واجب الاذعان ''واما بنعمة ربک فحدث'' کی ہی تعمیل ہے، بلکہ اس کے ضمن میں حسب وعدہٗ حقہ وصادقہ ''لئن شکرتم لازیدنکم'' کے افزونی وترقی انعامات کا مصداق ہونا پڑتا ہے، اس لیے اس موقع پر یہ بندہ درگاہ الٰہی بھی حسب اقتدائے بعض اہل علم، خداوند کریم کے بعض ان احسانات کا ذکر کرتا ہے جو بدو شعور سے محض اس کے تفضلات وعنایات سے اس ذرہٗ بے مقدار پر مبذول ہوئے ہیں۔

راقم یعنی فقیر محمد بن حافظ محمد سفارش بقرینۂ غالب ۱۲۶۰ھ میں موضع ''چتن'' میں جو شہر جہلم سے دو میل کے فاصلہ کا بجانب غرب واقع ہے، پنج شنبہ کے روز رات کے وقت پیدا ہوا، جب چھ سات سال کا ہوا تو پڑھنے پر بٹھایا گیا۔ اور قرآن شریف کے ختم کے بعد کتب فارسیہ میں مشغول اور موضع ''ٹالیا نوالہ'' میں جو چتن سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، میاں قطب الدین مرحوم سے پڑھنے جاتا لیکن اکثر روز راستہ میں ہی موضع ''حادہ'' میں اپنے ماموں حافظ فتح علی مرحوم کے پاس رہ جاتا اور اپنے ماموں زاد میاں غلام محمد مرحوم سے بھی جو ایک ذہین ومستعد صاحب علم تھے، استفادہ کرتا اسی اثناء میں فقیہ اجل عالم بے بدل مولوی نور احمد صاحب تلمیذ فقیہ فاضل محدث کامل مولوی رحمت اللہ صاحب کرانوی مصنف ازالہ

الاوہام و اعجاز عیسوی و اظہار الحق وغیرہ حال نزیل و مدرس مکہ معظمہ جب لاہور سے مراجعت فرما کر اپنے وطن مالوفہ موضع کھائی کوٹلی میں جو جہلم سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے، سکونت پذیر ہوئے تو یہ احقر بھی ان کے درس میں جو اس وقت علاقہ جہلم میں کیا، بلکہ کل پنجاب میں ایک بے نظیر گنا جاتا تھا، حاضر ہوا اور کئی سال ان کی خدمت میں صرف ونحو۔ فقہ و دیگر علوم کی ابتدائی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا، بعد ازاں راولپنڈی میں چلا گیا جہاں پہلے مولوی عبدالکریم صاحب حال مفتی شاہ پور سے جو کچھ دنوں کے لیے وہاں وارد تھے، منطق شروع کی اور ان کے وہاں سے چلے جانے سے مولوی محمد احسن صاحب فیروز والا سے جو وہاں بتلاش روزگار تشریف لائے ہوئے تھے، پڑھنا شروع کیا۔ انہیں دنوں ۱۲۷۶ھ میں دہلی کا ارادہ کر لیا اور ایک فوج کے ساتھ جو کانپور کو جاتی تھی دہلی پہنچا۔ پہلے پہل پنجابی کڑہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کے درس میں حاضر ہوا مگر انہوں نے یہ عذر کر کے کہ ہم معقولات نہیں پڑھا سکتے، مولوی محمد شاہ صاحب مصنف مدار الحق کے سپرد کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد بستی نظام الدین اولیاء میں جناب صدر الافاضل اعزء الممائل مولونا مفتی محمد صدرالدین خاں صاحب صدر الصدور دہلی تلمیذ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث کی خدمت میں چلا گیا جن کے درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قرائۃً وسماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا اور اواخر ۱۲۷۷ھ میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوفہ میں آیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد لاہور میں چلا گیا جہاں فاضل جلیل القدر فقیہ فرید الدہر مولوی کرم الٰہی صاحب متوفی ۱۲۸۲ھ میں بہت کچھ استفادہ کیا اور ساتھ ہی اس کے خوش خطی حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہوگئی اور ''من جد فوجد'' کا مصداق ہو کر مطبع آفتاب پنجاب لاہور میں کتابت کی خدمت پر مقرر ہو گیا۔ انہی دنوں میں ۱۲۸۴ھ میں عالم بے نظیر، مناظر

حسن التقریر مولوی حافظ ولی اللہ لاہوری کی پادری عماد الدین سے امرت سر میں تحریری بحث ہوئی جس سے مجھ کو بھی تردید عقاید نصاری کا شوق پیدا ہوا اور حافظ صاحب مرحوم سے بھی کچھ استفادہ کر کے اس فن میں وہ مہارت پیدا کی کہ ایک کتاب فارسی ''تصدیق المسیح'' نام کا اردو سلیس میں ترجمہ کیا اور اس میں جا بجا اپنی طرف سے تذئیلات و تفریعات اضافہ کر کے اس کو چھپوایا۔ پھر اس مباحثہ کا جو مابین حافظ صاحب مرحوم اور پادری عماد الدین کے ہوا تھا تکملہ لکھا جواب مباحثہ دینی مطبوعہ مطبع مصطفائی لاہور کے ساتھ چھپا ہوا موجود ہے۔ کتاب جسانتہ الانسان من دسوستہ الشیطان ابحاث ضروری جو حافظ صاحب مرحوم نے تصنیف کر کے چھپوائی تھیں۔ ان پر میں نے حواشی لکھے۔ ۱۱ رمحرم ۱۲۹۱ء سے اخبار ''آفتاب پنجاب'' کی ایڈیٹری کی خدمت اس خاکسار کے سپرد ہوئی جس کو ۱۳۰۱ھ تک جیسا ہو سکا انجام دیا، اب ۱۳ رذی الحجہ ۱۳۰۲ھ سے خاص جہلم اپنے وطن مالوفہ میں اپنے لخت جگر محمد سراج الدین اطال اللہ عمرہ واصلہ الی درجات العلیا کے نام پر مطبع سراج المطالع نام مع اخبار سراج الاخبار کے جاری کیا ہے۔ علاوہ خواشی و تعلیقات کتب مرقومہ بالا اور اس کتاب ''حدائق الحنفیہ'' کے ایک کتاب ''زبدۃ الاقادیل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل'' اور رسالہ ''آفتاب محمدی'' بھی اس خاکسار کی تصنیفات میں سے ہیں۔ اب خداوند کریم کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ اپنے رسول مقبول کے طفیل اور ان بزرگان دین اور علمائے کرام حنفیہ کی برکت سے جن کا تذکرہ اس کتاب میں درج ہوا ہے۔ میرا خاتمہ بخیر کرے۔ آمین''۔ (منقول از حدائق الحنفیہ طبع بار سوم ۱۹۱۶ء مطبوعہ نولکشور۔ لکھنؤ)

(مولوی فقیر محمد صاحب بمقام جہلم ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں فوت ہوئے۔) (حدائق الحنفیہ)

مشاہیر علماء امرتسر

- حضرت مولانا نور احمد پسروری ثم امرتسری
- مولانا ابوالبیان محمد داؤد فاروقی امرتسری
- مولانا غلام محمد ترنم امرتسری

حضرت مولانا نور احمد پسروری ثم امرت سری

ارشاد مجدد رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ فرماتے ہیں:

شریعت راسہ جزوست، علم وعمل واخلاص[1] تا ایں ہر سہ جزو متحقق نشوند شریعت متحقق نشود، وچون شریعت متحقق شد، رضائے حق سبحانہ وتعالیٰ حاصل گشت کہ فوق جمیع سعادات دنیویہ واخرویہ است، ورضوان من اللہ اکبر۔ پس شریعت متکفل جمیع سعادات دنیویہ واخرویہ آمد ومطلبے نماند کہ ورائی شریعت دراں مطلب احتیاج افتد، طریقت وحقیقت کہ صوفیاں باآں ممتاز گشتہ اند، ہر دو خادم شریعت اند در تکمیل جزء ثالث کہ اخلاص است، پس مقصود از تحصیل آں ہر دو تکمیل شریعت است نہ امر دیگر ورائی شریعت۔[2]

"شریعت کے تین جزو ہیں: (۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص۔

جب تک یہ تینوں جزو ٹھیک نہ پائے جائیں، کوئی شخص صاحب شریعت نہیں ہوسکتا اور جب شریعت کی تکمیل ہوگی تو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے گی جو تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں سے بڑھ کر ہے، کیوں کہ خدا تعالیٰ کی رضامندی سب

---

[1] رسالہ مصطلحات صوفیہ کرام میں اخلاص کی یہ تعریف لکھی ہے:
"آنکہ از غیر حق مبرا باشد ودر سخن قطع نظر از خلق کند۔"

[2] مکتوبات امام ربانی مرتبہ مولانا نور احمد مطبوعہ امرت سر، حصہ اول از دفتر اول صفحہ 98 ومطبوعہ نول کشور بار ششم، دفتر اول مکتوب 36، صفحہ 50

سے بڑی شے ہے۔ پس شریعت تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کی ضامن ہے اور امور زندگی میں سے کوئی ایسی مصلحت باقی نہیں رہی جس کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں شریعت سے باہر جانا پڑے، طریقت اور حقیقت[1] جس کے ساتھ صوفیہ ممتاز ہوئے ہیں، یہ دونوں خادم شریعت ہیں، جزو ثالث کی تکمیل کے لیے جس کا نام اخلاص ہے۔ پس ان دونوں (طریقت وحقیقت) کے حاصل کرنے کا مقصود شریعت ہی کی تکمیل ہے، نہ کہ اس کے سوا کوئی دوسری بات۔"

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے ارشادات گرامی کو بطور تمہید وتبرک اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ آج کی صحبت میں جس عالم ربانی اور عارف حقانی کے حالات پیش کیے جارہے ہیں۔ وہ ان ارشادات عالیہ کی علمی تفسیر تھے۔ یعنی علم، عمل اور اخلاص کا پیکر جامعہ تھے۔ انہوں نے طریقت وحقیقت کی منازل کو تکمیل شریعت کے لیے طے کیا اور پھر معرفت آگاہ ہوئے۔

آہ امرت سر!

سرزمین امرت سر قریباً ایک صدی تک مرکز علوم اسلامیہ بنی رہی۔ اس عرصے میں بہت سے ایسے نامور علماء وفضلاء پیدا ہوئے جنہوں نے اطراف واکناف پاک وہند کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی شہرت حاصل کی۔ جن میں سے مولانا غلام العلی قصوری، مولانا سید عبداللہ غزنوی، مولانا سید عبدالجبار غزنوی، مولانا مفتی غلام رسول قاسمی، مفتی عبدالصمد خاں، مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی، مولانا ابو الوفا ثناء اللہ،

---

[1] صوفیۂ کرام کہتے ہیں کہ (۱) طریقت کی تکمیل کے بعد اشیاء کی (۲) حقیقت معلوم ہوتی ہے، اور حقیقت معلوم ہونے کے بعد (۳) معرفت حاصل ہوتی ہے۔

مولانا محمد عالم آسی، مولانا مفتی محمد حسن اور سید عطا اللہ شاہ بخاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات دین کے مختلف علوم وفنون میں ایسے باکمال تھے کہ ان کی نظیر آج ناممکن ہے۔

مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ:

مگر حضرت مولانا مولوی مفتی الحاج نور احمد پسروری نقشبندی مجددی ابوالخیری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا نمایاں پہلو عرفان وتصوف ہے۔ آپ نے سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج واشاعت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا تھا۔ اس باب میں ان کی سرگرمیاں نادر المثال ہیں۔ تصوف کے ساتھ اس درجہ شغف رکھنے کے باوجود صرف صوفیت ومشیخت میں گم ہو کر نہ رہ گئے تھے، بل کہ مقصود حقیقی یعنی احیائے سنت واقامت دین کی خاطر علوم شرعیہ (فقہ، حدیث اور تفسیر) کے درس وتدریس میں بھی مشغول رہے۔ چناں چہ ایک عالَم ان کی علمی اور روحانی فیوض وبرکات سے بہرہ یاب ہوا۔ یہاں تک کہ ان کے زندۂ جاوید علمی کارناموں سے طالبان رشد وہدایت ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ علم
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

ابتدائی حالات:

ہزار کوشش کے باوجود آپ کے ابتدائی حالات تفصیل کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکے۔ صرف اس قدر معلوم ہوا ہے کہ آپ پسرور ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ ابتدائی تعلیم پسرور میں حاصل کی اور اس کے بعد تحصیل وتکمیل علوم کے لیے یوپی روانہ ہو گئے۔

اساتذہ:

یہ تو بالکل صحیح طور پر معلوم ہے کہ آپ نے حضرت مولانا احمد حسن کان پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، (متوفی ۱۳۱۳ھ) اور حضرت مولانا حاجی رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) سے علوم دینیہ پڑھے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کس زمانے میں آپ نے تحصیل علوم کی اور کس کس سے کون کون سی کتابیں پڑھیں؟

حضرت مولانا نور احمد نور اللہ مرقدہ کے پرانے شاگردوں میں سے مولانا ابو احمد عبداللہ صاحب لدھیانوی جو گوجرانوالہ میں مقیم ہیں انہوں نے رسالہ ''دارالعلوم'' دیوبند میں حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات لکھے تھے۔ حضرت کے اساتذہ کے سلسلے میں آپ کی معلومات بھی اتنی ہی ہیں جتنی ہم نے لکھ دی ہیں۔ مولانا ابو احمد صاحب لکھتے ہیں:

> ''آپ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی کے بلاواسطہ شاگرد تھے اور قبلہ عالم حضرت مولانا امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے روحانی فیض یافتہ[1] تھے، اور حضرت مولانا احمد حسن کان پوری کے مختص شاگردوں میں سے تھے۔''[2]

حضرت مولانا حاجی رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ہندوستان سے ہجرت فرما گئے تھے۔ اور اس وقت مولانا نور احمد کی عمر صرف چھ سات برس ہوگی۔ اس لیے یہ یقینی امر ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مکہ معظمہ پہنچ کر ہی فیض یاب ہوئے۔

---

[1] ان سے آپ نے صرف روحانی فیض ہی حاصل نہیں کیا، بل کہ کتابیں بھی پڑھیں۔

[2] ماہ نامہ ''دارالعلوم'' دیوبند اگست ۱۹۶۱ء

سفرِ حجاز:

برِصغیر کے علماء وفضلاء سے استفادہ واستفاضہ کے چند سال بعد 1299ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں عازمِ حجاز ہوئے۔ مکہ معظّمہ پہنچ کر حضرت مولانا حاجی رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ صولتیہ سے اکتساب علم کیا۔ آپ چوں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مکہ مکرمہ گئے تھے، اس لیے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ عرصہ تک پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

مدرس مدرسہ صولتیہ:

اس کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اپنے مدرسے میں مدرس مقرر فرما دیا اور آپ عرصہ چھ یا سات سال یہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران میں حجاز مقدس کے اکثر علماء وفضلاء سے آپ کے روابط قائم ہو گئے اور انہوں نے آپ کی علمی فضیلت اور فقہی بصیرت کا اعتراف کیا۔

شیخ العرب والعجم سے بیعت:

مکہ معظّمہ میں قیام کے زمانے میں آپ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا شاہ امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ[1] کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان سے بہت زیادہ روحانی استفادہ کیا۔

زمانہ قیامِ حجاز کے واقعات:

ربطِ مضمون کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمانۂ قیامِ حجاز

---

۱ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں واصل بحق ہوئے۔

کے واقعات اور معمولات یہیں لکھ دیئے جائیں، جو نہایت بصیرت افزا اور ایمان افروز ثابت ہو سکتے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ، یہ واقعات و حالات حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے بیان فرمودہ ہیں، جو راقم کو نہایت معتبر راویوں کے ذریعے معلوم ہوئے، اور کچھ ان کی اپنی تحریروں سے بھی اخذ کیے گئے ہیں۔

غرباء پر حج فرض نہ ہونے کی وجہ:

مولانا فرماتے ہیں:

"۱۲۹۹ھ میں سفر حجاز میں جہاز کے اندر میرے ہم راہ چند مساکین تھے۔ مکہ معظّمہ پہنچ کر میں تو وہیں مقیم رہا لیکن وہ لوگ مدینہ منورہ کو بغیر قافلہ کے پیدل روانہ ہوئے۔ ان مساکین کے ہم راہ جہلم کے رہنے والے بلند قامت اور گورے رنگ کے ایک سید صاحب بھی تھے۔ جب یہ لوگ واپس مکہ معظّمہ آئے تو میں نے ان سے سید صاحب کا حال دریافت کیا۔ انہوں نے بتلایا کہ وہ راستے میں ان سے جدا ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کا حال معلوم نہیں۔

حسن اتفاق سے ایک شب نماز عشاء سے فراغت پا کر اپنی جائے قیام کو جا رہا تھا کہ عین حرم شریف کے اندر ایک شخص مجھے ملا۔ اس نے السلام علیکم کہا میں نے جواب دے کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ اس پر اس نے بتلایا کہ میں وہی جہلم کا رہنے والا سید ہوں جو مساکین کے ہم راہ مدینہ شریف کو گیا تھا۔ تب ہم دونوں بیٹھ گئے، میں نے ان سے راستہ کے حالات معلوم کیے۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے بتایا کہ میں اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گیا تھا۔ میں بندرگاہ رابغ سے نکل کر مقام بدر کے راستہ پر ہو لیا۔ یہ ایک خشک ریتلا چٹیل میدان تھا نہ کچھ پینے کو ملتا اور نہ کچھ کھانے کو کئی دن تک بھوکا پیاسا رہنے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ پیاس سے تسکین حاصل کرنے کی غرض سے چاندنی رات میں اپنی زبان ٹھنڈی ریت پر رکھتا تھا۔ آخر کار درماندہ اور

زندگی سے مایوس ہوکر ایک جگہ لیٹ گیا۔ کمال ضعف تھا، چلنے کی طاقت بالکل نہ رہی تھی۔ ہر گھڑی موت کا انتظار تھا۔ اسی حالت میں میری آنکھ لگ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص مجھے یوں کہہ رہا ہے کہ اسی لیے خدا تعالیٰ نے غرباء اور مساکین پر حج فرض نہیں کیا۔ اتنے میں کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص میرے منہ میں پانی اور نرم سی غذا ڈال رہا ہے۔ جب (یہ غذا) میرے حلق سے اتری تو مجھے ہوش آ گیا۔ دیکھتا ہوں کہ چند بدوی مع اونٹوں کی ایک قطار کے میرے پاس موجود ہیں۔ آخر انہوں نے مجھے ایک اونٹ پر سوار کرلیا، اور ایک آباد منزل تک پہنچادیا، چند روز وہاں اقامت کر کے مدینہ منورہ کو روانہ ہوگیا اور آج ایک عرصہ کے بعد یہاں واپس پہنچا ہوں۔[1]

مولانا سے پیش آمدہ واقعہ:

راقم الحروف کے والد ماجد[2] مرحوم و مغفور کی روایت ہے اور مولانا کے فرزند مولانا محمد سلیمان صاحب نے بھی اسے روایت کیا ہے کہ حضرت مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کئی دفعہ یہ بیان فرمایا:

> "میں نے ایک دفعہ مکہ معظمہ سے پیدل چل کر دربار نبوی میں حاضری کا شرف حاصل کیا، اثنائے سفر ایک رات ایسی آئی کہ قیام کے لیے کوئی منزل نہ تھی، اس لیے بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ معاً مجھے یاد آیا کہ حضرت رسول خدا ﷺ کی حدیث ہے کہ اگر سفر میں راہ بھول جاؤ تو بلند آواز سے یَا عِبَادَ اللّٰہِ

۱۔ ماہنامہ "الفیض" رجب المرجب ۱۳۴۳ھ

۲۔ حکیم فقیر محمد چشتی امرت سری رحمۃ اللہ علیہ جن کے طبی تجربے اور مفردات و مرکبات کی تیاری میں امانت و دیانت شہر بھر میں مشہور و مسلم تھی، جو دوا شہر میں کسی دوافروش کے پاس نہ ملتی، ان کے ہاں ملنے کی آخری امید ہوتی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور میں مقیم ہوئے اور یہیں ۱۹۵۲ء میں رحلت فرمائی۔

اَعِینُوْنِیْ [1] پکارا کرو۔ میں نے اس پر عمل کرتے ہوئے تین بار پکارا، اور پھر ایک بار چاروں طرف نظر دوڑائی تو قریب ہی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اور میں اس طرف چلا آیا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ چند بچے جھونپڑی کے باہر کھیل رہے ہیں اور یہ بچے مجھے دیکھتے ہی پکار اٹھے: جَـاءَ ضیف اللہ (اللہ کا مہمان آیا) بچوں کی آواز سنتے ہی اندر سے ایک مرد نکلا، اور اس نے میری بڑی خاطر مدارت کی۔ کھانا کھلایا اور رات بسر کرنے کے لیے بستر وغیرہ دیا۔ اور صبح کو مجھے راستہ پر ڈال دیا۔" (مفہوماً)

مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے قبل یعنی "اَعِینُونی یاعباداللہ" پکارنے سے قبل بہ قائمی ہوش وحواس اس علاقے میں کوئی جھونپڑی نہ دیکھی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دس پاروں کی تلاوت:

حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فرزند مولانا محمد سلیمان صاحب کو ایک دفعہ بتایا:

"میں دوران قیام مکہ معظمہ حرم شریف میں بیٹھ کر روزانہ دس پارے تلاوت کیا کرتا تھا۔"

بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ سے وعدہ:

ایک دفعہ مولانا محمد سلیمان صاحب کو علیحدگی میں بتایا:

---

[1] یہ حدیث "حصن حصین" صفحہ ۲۰۲ پر مرقوم ہے۔

"میں نے بیت اللہ شریف میں اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے جو آمدنی ہوا کرے گی، اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد پھر اس میں سے بیسواں حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا کروں گا۔"

اللہ کا شکر ہے، میں نے اس سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر رہا ہوں۔

اللہ، اللہ کس درجہ کے نیک نفس اور مخیّر بزرگ تھے۔ آج پوری دنیائے مولویت و مشیخت اس کی مثال پیش کرنے سے یک سر قاصر ہے۔ (اَلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰہ "فیض الاسلام")

زمانہ قیام مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے آپ کو بعض خالص متصوفانہ حکایتیں سنائیں، جن کو مولانا نے اپنے مضامین مطبوعہ "الفیض" امرت سر میں بیان فرمایا۔ یہ بڑے مزے کی باتیں ہیں مگر ہمارے موضوع سے ان کا کوئی زیادہ تعلق نہیں۔ ان حکایات میں سے ایک ہونٹ کٹے ولی اللہ کا طویل قصہ بیان کرنے کے بعد عربی میں لکھتے ہیں:

انتھیٰ ما حکی الشیخ محمد رحمت اللہ رحمہ اللہ
یوم الفطر بعد الصلوٰۃ لما زرتہ ذاک الیوم ۱۳۰۱ھ
فی بلد اللہ الحرام والشیخ اذ ذاک کان جالسا فی
سرداب تحت باب المدرسۃ للتی انشاہ ھنالک۔[1]

ان حکایات کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم دین اور بے مثال مناظر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند مرتبہ صوفی اور متصوفہ کے حامی تھے۔

---

[1] "الفیض" امرت سر، اپریل ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۲

واپسی ہند:

سات آٹھ سال مکہ شریف میں قیام پذیر رہنے اور ساتھ حج کرنے کے علاوہ کئی دفعہ روضۂ نبوی کی حاضری کی بے پایاں سعادتیں حاصل کرنے کے بعد آپ اپنے استاذ گرامی حضرت کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حسب ارشاد "ویلور" علاقہ مدراس میں تشریف لے آئے اور یہاں تبلیغ وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

مدرسہ باقیات الصالحات:

مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۰۷ھ میں پاک وہند میں واپس لوٹے تھے اور "ویلور" پہنچتے ہی "مدرسہ باقیات الصالحات" جاری کیا، جواب تک بہ دستور دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس مدرسہ کے بانی تو کوئی اور صاحب تھے مگر اس کے سب سے پہلے مدرس اعلیٰ اور مہتمم حضرت مولانا صاحب ہی مقرر ہوئے تھے۔ ان باتوں کو تفصیلاً معلوم کرنے کے لیے تین ماہ کا عرصہ ہوا، مہتمم صاحب مدرسہ ہذا کے نام "ویلور" خط لکھا تھا مگر جواب سے جواب ہی رہا۔ مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب امرت سر تشریف لے آئے تھے تو اپنی جگہ اپنے شاگرد مولانا عبدالجبار مرحوم کو مقرر کر آئے تھے، جو عرصہ دراز تک صدر مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور نائب مدرسین بھی آپ ہی کے شاگرد تھے۔

امرت سر میں آمد:

یہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ "ویلور" میں کتنے سال رہے اور امرت سر میں کب تشریف لائے؟ پرانے زمانے کی تحریریں اور فتاوی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۸۹۸ء/۱۳۱۶ھ میں آپ کا امرت سر میں ورود مسعود ہوا۔

امرت سر میں آپ کی آمد کے دو سبب پیدا ہوئے:

ایک تو "ویلور" کے ایک ایسے رئیس سے ایک فروگذاشت ہوگئی جو مدرسہ کی بہت زیادہ مالی امداد کیا کرتا تھا۔ مگر آپ اسے برداشت نہ کرسکے اور مدرسے سے علیحدگی اختیار کرلی۔ تاکہ مدرسہ کے کام میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، اور جو پودا لگایا ہے وہ سرسبز اور پھلتا پھولتا رہے۔ ادھر حاجی شیخ بڈھا مرحوم و مغفور سوداگر چرم و رئیس اعظم امرت سر نے نئی نئی عالی شان مسجد تعمیر کرائی تھی[1] اس لیے انہیں ایک بے نظیر خطیب و امام کی تلاش تھی۔ شیخ صاحب موصوف کے کارندے ویلور آتے جاتے تھے۔ ان کے ذریعے شیخ صاحب کو مولانا صاحب کے کمالات سے آگاہی ہو چکی تھی۔ شیخ صاحب کو جوں ہی یہ معلوم ہوا کہ مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ "باقیات الصالحات" سے الگ ہوگئے ہیں، فوراً امرت سر آنے کی دعوت لکھ بھیجی جسے آپ نے منظور فرمالیا۔

جناب عبدالحمید صاحب پنشنر پوسٹ ماسٹر کا بیان ہے کہ مولانا کی آمد کے چند روز بعد ہی یہ چرچا ہونا شروع ہوگیا کہ حاجی شیخ بڈھا کی مسجد میں ایک مولوی صاحب تشریف لائے ہیں جو صبح کی نماز کے بعد درس دیتے ہیں اور ان کے درس میں

---

[1] حاجی شیخ بڈھا مرحوم و مغفور نے اس مسجد کا سنگ بنیاد ۱۳۰۶ھ میں رکھا تھا اور ۱۳۰۸ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس سستے زمانے میں ایک لاکھ روپیہ اس کی تعمیر پر خرچ آیا تھا۔ مضبوطی خوب صورتی اور نقش و نگار کے لحاظ سے سارے شہر میں یہ واحد مسجد تھی۔ افسوس، کہ تقسیم ملک کے بعد اس مسجد کو شہید کردیا گیا۔ ☆۔ اب اس مسجد کی زمین پر ہندوؤں کے سکونتی مکان تعمیر ہو چکے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ مسجد آگ سے جل نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس میں لکڑی کا کام بہت معمولی تھا۔ غالباً ۱۹۵۰ء کے بعد اس کو بھارتی حکومت نے خود مسمار کرایا۔ راقم الحروف اس وقت (ویزا پر) امرت سر میں تھا جب کہ اس کا حوض گرایا جارہا تھا۔

ایک خاص کیفیت اور اثر ہوتا ہے۔ ان کی طرف روز بروز لوگ بہت رجوع ہو رہے ہیں۔ چناں چہ ایک دن میں (عبدالحمید) اور صوفی حسین بخش مرحوم درس سننے گئے تو معلوم ہوا کہ واقعی آپ کے درس میں خاص کشش ہے اور مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو بات کہتے ہیں وہ ان کے دل سے نکلتی ہے، اس کے بعد ہم دونوں کی آمد و رفت حضرت مولانا کی خدمت میں بہت زیادہ ہوگئی، دیکھتے ہی دیکھتے صبح کے درس کے علاوہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کافی تعداد طالب علموں کی بھی ہوگئی۔ چناں چہ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نے اپنے بڑے صاحب زادے پیر محمد حسین صاحب کو بھی حصول علم کے لیے آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔ حضرت کے علوم و فیوض کے انوار سارے امرت سر میں چمکنے لگے اور شہر کے بڑے بڑے رئیس بھی آپ کی خدمت میں حاضری کو سعادت سمجھنے لگے۔[1]

مدرسہ نعمانیہ امرت سر:

آپ نے امرت سر تشریف لانے کے فوراً بعد مسجد حاجی شیخ بڈھا میں مدرسہ نعمانیہ کی بنیاد رکھ کر باقاعدگی سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور چند ہی سال میں اس مدرسہ کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل گئی اور طلباء کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ بالآخر آپ نے اس مدرسے کو وسعت دینے کے لیے دوسرے مدرسین کی خدمات حاصل کیں۔ مسجد شیخ بڈھا مزید طلباء کے قیام کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے

---

[1] جناب عبدالحمید صاحب نہایت عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ مولانا کی امرت سر میں آمد کے وقت آپ نوجوان تھے۔ انہوں نے مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ آپ اس وقت کوئٹہ میں مقیم ہیں، جہاں ان کے صاحب زادے ایکسین (XIN) لگے ہوئے ہیں۔ جزاہ اللہ تعالیٰ

آپ نے ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں جامع مسجد شیخ خیر الدین مرحوم واقع حال بازار امرت سر میں مدرسہ نعمانیہ کی ایک شاخ کھول دی۔ اس شاخ میں اول مدرس مولانا مولوی غلام محی الدین مرحوم جہلمی مقرر کیے اور نائب مدرس دو تھے۔ ایک تو لدھیانہ کے خاندان علماء سے تعلق رکھتے تھے، راقم کو ان کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ دوسرے حضرت مفتی محمد حسن صاحب تھے۔

مولوی غلام محی الدین صاحب جہلمی کے انتقال (آپ چند سال بعد فوت ہو گئے تھے) کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب اول مدرس ہوگئے اور نائب مدرس کوئی اور صاحب رہے، چند سال مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی مقیم حال لائل پورہ بھی اس مدرسہ کے نائب مدرس رہ چکے ہیں۔ آخر حضرت مولانا مولوی مفتی عبدالرحمٰن صاحب ہزاروی جو راقم الحروف کے استاد ہیں، نائب مدرس کی حیثیت سے کام کرنے کے علاوہ فتویٰ نویسی کی خدمات سرانجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ملک کی تقسیم عمل میں آ گئی۔ اس کے بعد اس دار العلوم کا انجام انا اللہ وانا الیہ راجعون میں پنہاں ہے۔

انجمن نعمانیہ:

حضرت مولانا الحاج مفتی نور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ازراہ دوراندیشی ایک انجمن قائم کردی تاکہ اس کی زیر نگرانی مدرسہ نعمانیہ ہمیشہ چلتا رہے۔ اس انجمن نعمانیہ کے اراکین نے مولانا ہی کو صدر منتخب کیا اور جناب شیخ علی بخش صاحب آنریری مجسٹریٹ ورئیس امرت سر کو سیکرٹری بنایا۔ مولانا کے وصال کے بعد آپ کے فرزند ارشد مولانا محمد سلیمان صاحب بی اے صدر اور جناب شیخ سعید اللہ صاحب آنریری مجسٹریٹ خلف الرشید شیخ علی بخش صاحب مرحوم سیکرٹری چنے گئے اور بانی مدرسہ کی جگہ مولانا محمد سلیمان صاحب

مدرسہ نعمانیہ کے مہتمم تقسیم ملک تک بہ دستور صدر انجمن اور مہتمم مدرسہ رہے[1]

تلامذہ:

مولانا مرحوم ومغفور کے شاگردوں کی تعداد کا احاطہ کرنا اس وقت ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جن چند حضرات کے متعلق راقم کو معلوم ہو سکا ہے کہ انہوں نے مولانا صاحب کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی ہے، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مرحوم مدرس مدرسہ باقیات الصالحات ویلور (مدارس)

(۲) حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب مدرس باقیات الصالحات ویلور (مدارس)

(۳) حضرت مولانا مولوی مفتی محمد حسن صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور (متوفی ۱۳۸۰ھ/۱۹۱۶ء)

(۴) حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری (متوفی ۱۳۱۸ھ/۱۹۱۶ء)

(۵) حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب ہزاروی نائب مدرس مدرسہ نعمانیہ امرت سر (متوفی ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء)

(۶) حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ جو اسی سال لاہور میں فوت ہوئے اور راقم آثم نے عندربہ مرضیا (۱۳۸۲ھ) ان کی تاریخ کہی تھی[2]

---

[1] حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں مدرسہ نعمانیہ کے طلبا کو مسجد حاجی شیخ بڈھا مرحوم کے متولی وظیفہ اور کپڑے دیا کرتے تھے۔

[2] حضرت مولانا رائے پوری نے محترم مولانا محمد داؤد غزنوی کو خود بتایا تھا کہ میں حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد شیخ بڈھا میں ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا اور اس طالب علمی کے زمانے میں حضرت مولانا سید عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کے لیے بھی جایا کرتا تھا۔

(۷) حضرت مولانا مولوی صاحب زادہ پیر محمد حسن صاحب (متوفی ۱۳۱۸ھ/۱۹۶۱ء) ابن حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری (متوفی ۱۳۷۰ھ)

(۸) حضرت مولانا غلام محمد صاحب مرحوم خطیب جامع مسجد خیر الدین حال بازار امرت سر

(۹) مولانا مولوی نور عالم صاحب مولوی فاضل سابق مدرس عربی مسلم ہائی سکول امرت سر

(۱۰) مولانا مولوی حاجی محمد حسین صاحب ہزاروی مرحوم شیخ الحدیث مدرسہ سلفیہ غزنویہ امرت سر

(۱۱) حضرت مولانا پیر عبد الخالق اٹانڈوین نقشبندی مجددی مرحوم و مغفور۔

(۱۲) قائد احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء)

(۱۳) جناب حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی امرت سری (متوفی ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء)

(۱۴) حضرت مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی مدظلہ، مقیم حال لائل پور

(۱۵) حضرت مولانا ابو احمد عبد اللہ صاحب لدھیانوی مدظلہ، مقیم حال گوجرانوالہ

(۱۶) مولانا عبد الرحیم صاحب موچھل والے حال مقیم گوجرانوالہ

(۱۷) مولوی نور احمد صاحب، بسیری والا، مظفر آباد، آزاد کشمیر

(۱۸) مولانا حاجی عبد الکریم صاحب، باجڑہ، ضلع سیال کوٹ

(۱۹) جناب حکیم مظفر علی، لائل پور

(۲۰) مولانا مفتی ضیاء الدین صاحب ضیا کاشمیری (مفتی علاقہ پونچھ) حال مقیم لاہور

۱؎ ان کا مطب امرت سر چوک فرید میں تھا، بہت بڑے عالم دین تھے۔ منہ

(۲۱) جناب حافظ محمد سعید صاحب چنیوٹی مالک بی پی فیکٹری

(۲۲) مولانا ابو البیان محمد داؤد مرحوم خطیب مسجد شیخ بڈھا و مصنف کتب کثیرہ (متوفی ۱۹۴۲ء) فرزندار جمند حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ

(۲۳) محترم و مکرم مولانا ابو الفیض محمد سلیمان صاحب بی اے، مالک نور کمپنی نئی انارکلی، لاہور۔ آپ حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ صاحب تذکرہ کے بڑے فرزند ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے۔

(۲۴) مولانا حافظ قاری خدا بخش صاحب مدظلہ، سابق نائب مدرس مدرسہ تجوید القرآن چوک فرید، امرت سر، حال مقیم قصبہ کانٹھ، ضلع مراد آباد (بھارت)

(۲۵) حضرت مولانا پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ اندرابی کاشمیری ثم امرت سری، خطیب مسجد رحمانیہ، آرام گلی نمبر ۷ لاہور

پیر صاحب موصوف کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، مادہ تاریخ وفات ''رحلت یزداں پرست'' (۱۳۸۰ھ) ہے۔

(۲۶) سید بڈھے شاہ مرحوم آنریری مجسٹریٹ اور رجسٹرار امرت سر۔ ان مرحوم نے حضرت مولانا مغفور سے مثنوی رومی سبقاً سبقاً پڑی تھی۔

مدرسہ تجوید القرآن:

اوائل ۱۹۱۴ء میں حضرت مولانا نور احمد مغفور نے مسجد شیخ بڈھا مرحوم واقع موری گنج چوک فرید، امرت سر میں مدرسہ نعمانیہ کے ساتھ ہی مدرسہ تجوید القرآن کی بنیاد ڈال دی اور استاذی حافظ خدا بخش صاحب مدظلہ کو اس مدرسے مدرس مقرر کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا مرحوم و مغفور نے حافظ خدا بخش صاحب کو وظیفہ دے کر مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ (قائم کردہ حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب متوفی ۱۳۴۳ھ/

۱۹۲۵ء) سے فن قراءت سیکھنے کے لیے بھیجا اور وہاں سے عارضی طور پر کام کرنے کے لیے ایک مدرس طلب کیا جو حافظ خدا بخش صاحب کی جگہ بچوں کو پڑھاتا رہا۔

قراءت روایت حفص[۱] کی تحصیل کے بعد حافظ صاحب موصوف امرت سر آ کر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے، مدرسہ تجوید القرآن دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا حتیٰ کہ ایک اور مدرس کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس پر حافظ خدا بخش صاحب مدظلہ نے حضرت مولانا نور احمد صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں ایک ایسے مدرس ہیں جن کو امرت سر آنے کی دعوت دی جائے تو ضرور تشریف لے آئیں گے اور ان کی آمد سے ہمارا مدرسہ اپنی نوعیت کی مثال درس گاہ بن جائے گا۔

حضرت مولانا نور احمد نے اس تجویز کو پسند فرماتے ہوئے حافظ خدا بخش صاحب کو کہا کہ خط وکتابت کرنے کی بجائے خود لکھنؤ جا کر ان کو اپنے ساتھ لے کر آؤ۔ چناں چہ حافظ صاحب گئے اور وہاں سے شیخ القراء حضرت قاری کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۱۶ء مدفون لاہور) کو امرت سر لے آئے۔

قبلہ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آمد کے بعد اس مدرسے نے بے حد ترقی کی اور بیرون جات کے طلباء جوق در جوق بہرہ مند ہونے کے لیے آنے لگے۔[۲]

۱۔ یہ قراءت سات قراءتوں میں سے سب سے پہلے سکھائی جاتی ہے۔ عام قاری صرف اس کے ماہر ہوتے ہیں، یہ اپنے موجد حفص کے نام سے موسوم ہے۔

۲۔ قاری کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۱۹ء میں امرت سر تشریف لائے۔ ان کی آمد کے بعد اس مدرسے کو مسجد شیخ بڈھا مرحوم سے مسجد کوتوال چوک فرید امرت سر میں منتقل کر دیا تھا اور تقسیم ملک تک یہ چشمہ فیض قرآنی وہیں جاری وساری رہا۔

یادرہے کہ تجوید وقراءت کی یہی ایک درس گاہ تھی جو امرت سر میں سب سے پہلے قائم ہوئی اور اس کے قیام سے قبل امرت سر میں حفاظ کا قحط تھا۔ رمضان المبارک میں نماز تراویح میں قرآن کریم سننے کے لیے حفاظ بیرون جات سے منگوائے جاتے تھے مگر اس مدرسہ تجوید القرآن کے قیام کے بعد نہ صرف امرت سر ہی سے یہ کمی رفع ہو گئی بل کہ یہاں کے پڑھے ہوئے حفاظ وقراء اطراف واکناف پاک وہند میں پھیل گئے۔ اس وقت پاکستان کے اکثر وبیشتر نام ور قراء اسی مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں۔

انجمن حفظ المسلمین:

مولانا نے امرت سر میں ایک انجمن بنام "انجمن حفظ المسلمین" قائم کی جس کا مقصد وحید مذاہب جدیدہ اور بالخصوص قادیانیت کے رد میں لٹریچر شائع کر کے مفت تقسیم کرنا تھا۔ اس انجمن نے (جس کے صدر مولانا صاحب ہی تھے) حضرت مولانا مولوی حکیم محمد عالم آسی نقشبندی مجددی ابو الخیری مصنف "الکاویہ علی الغاویہ" (متوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) کے تصنیف کردہ کئی رسائل چھاپ کر تقسیم کیے۔ مولوی غلام رسول راجیکے قادیانی مبلغ کے اعتراضات کے جواب میں حضرت آسی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت مشکل اور دقیق[1] عربی میں ایک پمفلٹ لکھا جس کا نام الجنجات تھا اس پمفلٹ کو مولانا صاحب نے اپنی جیب خاص سے رقم خرچ کر کے انجمن مذکور کی طرف سے شائع کرایا۔ جناب خواجہ احمد الدین صاحب نے محروم

---

[1] حضرت علامہ آسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ رسالہ مشکل عربی میں اس لیے تصنیف کیا تھا کہ قادیانی مبلغ صاحب نے اس سے قبل ایک عربی پوسٹر شائع کیا تھا جس میں اپنی قابلیت دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر جب مولانا کی تحریر ان کے سامنے پیش کی گئی تو وہ اسے پڑھ بھی نہ سکے۔

الارث پوتے کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا، ان کی تردید میں مولانا آسی نے رسالہ ''التنقید علی وراثت الحفید'' تحریر کیا تو یہ رسالہ بھی اسی انجمن نے زیور طبع سے آراستہ کر کے نذر شائقین کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس انجمن کا نام بدل کر انجمن تبلیغ الاسلام رکھ دیا گیا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہ دستور اس کے صدر رہے۔

مولانا کا مقامِ علم وعمل:

حضرت مولانا الحاج مفتی نور احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کے علمی اور روحانی مقام کو بیان کرنا مجھ ایسے ہیچ مداں کا کام نہیں، اس لیے ذیل میں چند فضلاء کی آرا نقل کی جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے قارئین کرام کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ صاحب تذکرہ کس پایہ کے بزرگ تھے۔

مشہور کانگریسی واحراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی لکھتے ہیں:

> ''والد صاحب نے مجھے امرت سر مولانا نور احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں پڑھنے کو بھیج دیا حضرت مولانا کا مدرسہ شیخ بڈھے کی مسجد چوک فرید میں تھا، اسی میں مولانا خود بھی رہتے تھے۔ مولانا نور احمد صاحب پسرور ضلع سیال کوٹ کے رہنے والے تھے۔ اپنے زمانے کے شیخ، محدث اور شب بیدار بزرگ تھے، حضرت مولانا نور احمد صاحب کئی سال مکہ معظمہ میں رہے تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر مکی کے شاگرد تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے مولانا نور احمد صاحب کے پڑھانے میں کچھ ایسی برکت تھی کہ سبق پڑھتے ہی پڑھتے یاد

ہو جاتا تھا۔ میرے ساتھ مفتی محمد نعیم صاحب، مولانا مفتی محمد عبداللہ جو اس وقت مدرسہ انوریہ کے مہتمم ہیں، مولانا عبداللہ میرے پھوپھی زاد بھائی، مولانا عتیق الرحمٰن جو میرے رشتہ میں بھائی ہوئے ہیں، میرے ساتھ پڑھتے تھے، مولانا نور احمد صاحب نے مجھے ایک نابینا حافظ صاحب سے علم تجوید کے مطابق قرآن مجید پڑھنے کی مشق کروائی۔ ۱۹۱۴ء تک مولانا نور احمد صاحب کے مدرسہ میں ہی تعلیم حاصل کرتا رہا۔''[1]

مولانا ابواحمد عبداللہ صاحب لدھیانوی جو ۱۹۰۸ء میں امرت سر آ کر مولانا مرحوم کے حلقہ درس میں شامل ہوئے تھے اور بعد میں دیو بند جا کر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیری سے مستفید ہوئے آپ آج کل گوجرانوالہ میں دارالعلوم نعمانیہ کے ناظم ہیں اور کئی ضخیم کتب دینیہ کے مؤلف و مصنف بھی ہیں۔ آپ نے ماہ نامہ ''دارالعلوم دیوبند'' میں لکھا تھا:

''مولانا نور احمد اسم بامسمّی نور احمد تھے۔ آپ کے گورے رنگ والے چہرے سے صاحب فراست جمال احمدی کی کرنیں محسوس کرتا۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ آپ کو عالم ربانی کہا کرتے تھے۔ مولانا نور احمد بڑے تبحر عالم تھے، علوم نقلیہ اور عقلیہ میں ماہر تھے، آپ کے علوم کی حدود اربعہ کا بیان کرنا ہمارے انداز سے باہر کی چیز ہے۔ علوم شریعت و طریقت اور حقیقت میں آپ

---

[1] ''رئیس الاحرار'' مطبوعہ دہلی صفحہ ۹۷

ایک مخصوص مقام پر تھے۔"[1]

امرت سر سے آمدہ اہل علم حضرات میں سے اس وقت حکیم مہرالدین صاحب مدظلہ (بابائے نیچر وپیتھی) قریباً سب سے معمر بزرگ ہیں، امرت سر کے پرانے بزرگوں اور علما کے متعلق ان سے بہت سی باتیں معلوم ہوتیں رہتی ہیں۔ راقم آثم حضرت مولانا نور احمد کے حالات دریافت کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اس وقت علیل تھے۔ مگر میرے استفسار پر بہت سی باتیں بتائیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

جن دنوں انجمن حفظ المسلمین نے مولانا آسی کا رسالہ الجنجات شائع کیا تو ایک دن مسجد شیخ خیرالدین مرحوم میں بیٹھے ہوئے مولانا مفتی محمد حسن سے اس موضوع پر گفتگو شروع ہوگئی، دوران گفتگو مفتی صاحب نے فرمایا:

> "میں نے تحقیق مسائل اور عربی ادب کے سلسلے میں حضرت مولانا نور احمد صاحب اور مولانا محمد عالم صاحب آسی کے علم واستعداد کو جہاں تک سمجھا تھا، اس سے بہت آگے پایا۔"

حضرت مولانا آسی جو عربی ادب کے بے بدل استاد تھے اور حضرت مولانا نور احمد کے پیر بھائی بھی تھے، انہوں نے ایک دفعہ راقم الحروف کی موجودگی میں حضرت مولانا عبداللہ صاحب کنجاہی کو (جو بغرض ملاقات آئے تھے) یہ کہا:

> "مولانا نور احمد مرحوم اپنی مثال آپ تھے، ان جیسے خصائل وخصائص کے مالک انسان روز روز نہیں پیدا ہوتے۔"

---

[1] ماہ نامہ "دارالعلوم" دیوبند، اگست ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۲

استاذی حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن مرحوم ہزاروی نائب مدرس مدرسہ نعمانیہ امرت سر سے محترم الحاج حکیم محمد علی صاحب مدظلہ نے پوچھا کہ حضرت مولانا نور احمد صاحب کا مرتبہ بہ لحاظ ولایت کیا تھا؟ مولانا مرحوم نے جواباً فرمایا:

''مولانا نور احمد صاحب اپنے زمانہ کے قطب تھے۔''[1]

شاہ ابوالخیر دہلوی کی بیعت وخلافت:

قارئین کرام کو یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا صاحب نے مکہ شریف میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی اور حضرت حاجی صاحب سلسلہ چشتیہ صابریہ کے بلند مرتبہ شیخ تھے۔ مولانا نور احمد صاحب نے پاک وہند واپس تشریف لانے اور قبلہ حاجی صاحب کے وصال کے کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا شاہ محی الدین عبداللہ ابوالخیر[2] دہلوی مجددی نقشبندی کے مرید ہو گئے

---

[1] مکتوب حکیم صاحب موصوف بنام راقم الحروف۔

[2] حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ آپ اس قدر بلند مرتبہ بزرگ تھے کہ حضرت حاجی امداد اللہ مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید دہلی سے ہو کر مکہ شریف واپس لوٹا تو حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت فرمایا کہ حضرت ابوالخیر کی بھی زیارت کی؟ مرید صاحب نے نفی میں جواب دیا تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ تمہارا سفر ہندرائیگاں گیا۔ (ملخصاً) حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی ۱۳۴۱ھ میں واصل الی اللہ ہوئے۔ مزار مبارک خانقاہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ میں حجرے کے اندر حضرت ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے دائیں پہلو میں ہے۔ نور اللہ مرقدہما!

حضرت شاہ ابوالخیر نے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی اور شرف بیعت سے سرفراز فرمایا، حضرت شاہ صاحب کے تعلق کے باعث آپ پر نقشبندیت کا ایسا رنگ غالب آیا کہ آپ نے اپنے آپ کو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور ایسی بے مثال خدمات سرانجام دیں کہ جب تک سلسلہ مجددیہ کا نام زندہ رہے گا، اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا نور احمد کا نام نامی واسم گرامی بھی باقی رہے گا۔ ان خدمات جلیلہ کی تفصیل آگے آئے گی ان شاء اللہ!

شاہ ابوالخیر کا ایک واقعہ:

حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت کے متعلق حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع مضمون ماہ نامہ ''الفیض'' امرت سر میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس میں آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ

آں حضرت ﷺ کی زیارت کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم وہ ہے جو حضرات صحابہ کرام کو حیات طیبہ میں نصیب ہوئی۔ دوسری قسم وہ ہے جو بہ حالت خواب حاصل ہو۔ تیسری قسم یہ ہے کہ آپ کے روضہ انور واطہر کی حاضری کا شرف میسر ہو۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ آپ کی وفات کے بعد حالت بیداری میں شرف زیارت سے مشرف ہو۔

زیارت کی تیسری قسم کے ذیل میں مولانا صاحب نے اپنے شیخ کا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے۔ اس ایمان افروز واقعہ کو ہم من وعن مولانا ہی کے الفاظ میں تبرکاً ذیل میں درج کرتے ہیں:

''شیخی ومولائی حقائق آگاہ عارف باللہ حضرت ابوالخیر محمد عبداللہ

شاہ صاحب دہلوی مرحوم جو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خاندان سے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب میں مدینہ طیبہ میں مقیم تھا، اپنے استاذ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب[1] مرحوم سے مختصر معانی پڑھا کرتا تھا، تو ماہ رمضان مبارک موسم گرما میں آ گیا میں دن کو روزہ رکھتا اور رات کو قرآن مجید سناتا اور ساتھ ہی حضرت استاذی سبق پڑھنے پر مجبور کرتے اور مجھے سبق پڑھنا شاق گزرتا۔ آخر تنگ آ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضہ مطہرہ کے پاس بیٹھ کر بطور شکوہ عرض کیا کہ یا حضرت دن کو روزہ رکھتا ہوں اور رات کو قرآن کریم سناتا ہوں اور ساتھ ہی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سبق پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں، جب عرض کر چکا تو آپ کے مزار مبارک سے آواز آئی کہ

"کدام حبیب الرحمٰن آں کہ شیفتہ ماست۔"

یعنی کون حبیب الرحمٰن، وہ جو ہماری محبت میں سرشار ہے۔

(حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے بھی فارسی زبان میں عرض کیا ہوگا) آپ (شاہ ابوالخیر صاحب) نے فرمایا: کہ ہم نے تو ضرور سنا۔

---

[1] حضرت مولانا سید حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ مقیم ہو گئے تھے اور شاہ ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ ایک عرصہ تک مدینہ طیبہ و مکہ مکرمہ میں

راقم الحروف (مولانا نور احمد) لکھتا ہے کہ جب یہ لفظ شاہ صاحب نے نقل فرمایا: تو میرے ہم راہی مرحوم وجد میں آگئے اور دیر تک اسی حالت میں رہے، کچھ آواز ان کے منہ سے نکلتی تھی مگر حواس قائم نہ تھے، آخر حضرت شاہ صاحب نے اپنے ایک خادم سے فرمایا: کہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرو، جب اس نے ہاتھ پھیرا تو کچھ سکون ہوا اور مجھ پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جو بیان سے باہر ہے۔ وللّٰہ الحمد علٰی ذالک[1]

اس واقعہ کو بیان فرمانے کے بعد مولانا صاحب نے دارمی کی روایت سے اس کی تائید کی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

> ''حضرت سعید بن عبدالعزیز سے روایت ہے، فرمایا کہ جب ایام حرہ کا واقعہ ہوا تو حضرت رسول خدا ﷺ کی مسجد میں نہ تین روز تک اذان کہی گئی اور نہ اقامت اور حضرت سعید بن مسیّب مسجد نبوی میں ہی رہا کرتے تھے اور آپ نماز کا وقت ایک ہلکی آواز سے معلوم کر لیتے تھے، جو نبی کریم ﷺ کی قبر سے سنا کرتے تھے۔''

وہ کیسا ہی مبارک زمانہ تھا کہ اس وقت ایسے ایسے پاک نفس اور سچے عاشق رسول بزرگ موجود تھے۔ حضور پاک ﷺ سے انہیں کیسی خاص نسبت تھی۔ افسوس ہزار افسوس کہ ہمارے زمانہ میں مقام رسول اللہ کو زیر بحث لانے والے تو بہت ہیں اور اس کے مدعی ہیں کہ ہم شیفتہ رسول ہیں مگر اندر سے سب خالی اور محض قالی ہیں اور وہ کیسے خوش نصیب مولانا تھے کہ انہیں خود رسول اللہ نے اپنا شیفتہ فرمایا۔ اللہ تعالٰی ان

---

[1] ماہ نامہ ''الفیض'' امرت سر، رمضان ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء

بزرگوں کی قبروں کو نور سے بھرے اور ہم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے، نیز انہی کے ساتھ محشور فرمائے (آمین)

مولانا کو تین بار زیارت ہوئی:

اسی مضمون میں بہ حالت خواب زیارت سے مشرف ہونے کے سلسلے میں مولانا صاحب نے لکھا ہے:

"فقیر راقم الحروف کو بھی اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے تین بار اس شرف سے مشرف فرمایا: اس کی تفصیل میں طول ہے۔"[1]

شرف زیارت کے حصول کا نسخہ:

حضرت نبی کریم ﷺ کی خواب میں زیارت حاصل کرنے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"اس شرف کے حصول کی خاطر بزرگان دین سے ایک طریق یہ بھی منقول ہے کہ بدن اور کپڑے خوب صاف کر کے نماز عشاء کے بعد کچھ دیر تک خوب توبہ واستغفار کرے، پھر درود شریف جو مندرجہ ذیل ہے اخلاص اور حضور قلب سے پڑھنا شروع کرے یہاں تک پڑھے کہ پڑھتے پڑھتے نیند غالب آجائے اور اسی حالت میں سو جائے، امید ہے کہ اس شرف سے مشرف ہوگا۔ درود شریف یہ ہے:

---

[1] ماہ نامہ "الفیض" امرت سر، شعبان المعظم ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء صفحہ ۱۴

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا الْمُصْطَفٰی وَاٰلِہٖ الْمُجْتَبٰی بِعَدَدِ اَسْمَاءِ کَ الْحُسْنٰی لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی. اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حَبِیْبَکَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُعَایَنًا فِیْ عَیْنِیْ کَمَا جَعَلْتَہٗ مُشَاھَدًا فِیْ قَلْبِیْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْکَ نَوِّرْ وَشَرِّفْ عَیْنِیْ بِمُعَایَنَتِکَ وَرُؤْیَتِکَ کَمَانَوَّرْتَ وَشَرَّفْتَ۔[1]

مولانا سے صلحاء واولیاء کے تعلقات:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حین حیات تک مسجد حاجی شیخ بڈھا مرحوم اولیاء، اصفیا اور علما کا مسکن ومستقر بنی رہی، کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ کوئی نہ کوئی بزرگ مولانا کی ملاقات کے لیے تشریف نہ لاتے، کئی کئی دن مولانا انہیں مہمان رکھتے حضرت مولانا میاں شیر محمد شرق پوری (متوفی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء)، حضرت پیر حافظ سید جماعت علی شاہ علی پوری (متوفی ۱۳۷۰ھ)، حضرت میر لطف اللہ مرحوم سجادہ نشین مکان شریف، مولانا پیر سراج الحق چشتی صابری گورداس پوری، مولانا میر جعفر علی شاہ طلانور والے، حضرت خواجہ عبدالخالق نقشبندی ساکن جہاں خیلاں ضلع ہوشیار پور اور حضرت مولانا ابوسعد احمد خان کندیاں والے۔ ان حضرات مشائخ میں سے جب بھی کسی بزرگ کا امرت سر میں ورود مسعود ہوتا تو مولانا صاحب کے پاس ضرور تشریف لاتے۔ بعض مشائخ کا تو قیام ہی مسجد شیخ بڈھا میں رہتا۔

---

[1] ماہ نامہ الفیض امرت سر، شعبان المعظم ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء صفحہ ۱۴

علمائے دیو بند میں سے حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیو بند کئی دفعہ امرت سر تشریف لائے اور مولانا صاحب کے پاس قیام فرمایا۔ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ

مولانا نور احمد صاحب عالم ربانی ہیں۔

مولانا نور احمد صاحب نے اپنے صاحب زادے مولانا محمد سلیمان صاحب مدظلہ کو حضرت شاہ صاحب سے بخاری شریف کی بسم اللہ کرائی۔

مولانا محمد علی صاحب مونگیری مرحوم و مغفور سے بھی آپ کے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا نور احمد نے ان کو ایک دفعہ خط لکھا کہ اپنا کوئی کپڑا میرے بچوں کے لیے تبرکاً بھیج دیجئے۔ مولانا مونگیری نے اپنا عمامہ پارسل کر دیا۔ مولانا نور احمد نے یہ عمامہ اپنے بیٹوں کو دے دیا کہ اسے برکت کے لیے رکھو۔

مولانا سلیمان صاحب کا بیان ہے کہ تقسیم ملک کے وقت تک یہ عمامہ میرے پاس محفوظ تھا۔ مولانا محمد سلیمان صاحب نے بتایا ہے کہ ایک عورت نے جو ہماری رشتہ دار تھی مولانا مرحوم سے اپنے بچوں کے لیے کوئی کپڑا مانگا تو آپ نے فوراً اپنی پگڑی منگوا کر دے دی۔

حضرت شرق پوری کا ایک سائل کو فرمان:

امرت سر کے مشہور رئیس شیخ میاں فضل حسین تاجر چرم کو ایک لاکھ روپے کا خسارہ ہو گیا۔ شیخ صاحب گھبرا کر حضرت میاں شیر محمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی، حضرت میاں صاحب نے شیخ صاحب کا اتا پتا پوچھ کر فرمایا۔ واپس امرت سر جاؤ، وہاں مسجد شیخ بڈھا میں جو خدا کے ولی رہتے ہیں، ان سے

دعا کراؤ۔ تمہاری پریشانی رفع ہو جائے گی ان شاء اللہ۔

میاں صاحب کے ارشاد کے مطابق شیخ صاحب سیدھے مسجد شیخ بڈھا میں حضرت مولانا کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقصد بیان کیا مولانا نے دعا فرمائی اور تسلی دی، شیخ صاحب مرحوم بیان کرتے تھے کہ حضرت مولانا صاحب کی دعا ایسی مقبول ہوئی کہ ایک لاکھ روپیہ کا جو خسارہ تھا وہ بہت جلد پورا ہونے کے علاوہ اسی سال مجھے مزید چودہ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی۔

کسر نفسی:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مرشد حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت حاصل تھی اور آپ کا روحانی مرتبہ نہایت بلند تھا۔ علوم ظاہری کے تو بحر ذخار تھے ہی۔ اس درجہ کے باکمال ہونے کے باوجود آپ نے اپنی زندگی میں صرف دو ایک آدمیوں کو مرید کیا اور اگر کوئی بیعت کی درخواست کرتا، آپ اسے کسی دوسرے شیخ کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیتے۔ مولانا محمد سلیمان صاحب بی اے نے بتایا ہے کہ آپ بیعت کے خواہش مندوں کو حضرت میاں صاحب شرق پوری، حضرت مولانا سراج الحق گورداس پوری، حضرت میر لطف اللہ صاحب مکان شریفی اور حضرت پیر جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمہم اللہ میں سے کسی ایک سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا کرتے اور جب تک حضرت شاہ ابوالخیر زندہ رہے، ایسے لوگوں کو ان کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔

مسلک:

مولانا علیہ الرحمۃ بڑے عالی ظرف اور معتدل مزاج صوفی بزرگ تھے۔ فرقہ

بندی اور پارٹی بازی وغیرہ قسم کے گھٹیا خیالات سے آپ کا دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ان کے اساتذہ کرام اور مشائخ عظام حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا علامہ احمد حسن کان پوری، حضرت رحمت اللہ کیرانوی ثم مکی، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کا جیسا معتدل مسلک تھا، ویسا ہی ان کا تھا۔

عود الی المقصود:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی مقام و مرتبہ کے سلسلے میں اور بھی بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں، مگر ہمیں زیادہ تر یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں کیا کیا علمی خدمات انجام دیں اور آپ کا علمی مرتبہ کس پایہ کا تھا۔ اگرچہ اس سلسلے کی بہت سی باتیں ہم لکھ آئے ہیں، مگر قارئین کرام کے اذہان کو پھر ایک بار اسی طرف مبذول کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

آپ کا ایک شعر:

جناب عرشی صاحب جوامرت سر کے معروف ادیب اور شاعر ہیں، آپ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظ بھی سنے ہیں اور آپ کی بعض تالیفات کا مطالعہ بھی دلی عقیدت سے کیا ہے، انہوں نے اپنے ایک مضمون کی تمہید میں لکھا تھا:

> ''ہمارے شہر امرت سر میں ایک بزرگ تھے مولانا نوراحمد (رحمۃ اللہ علیہ) مکہ معظمہ میں برسوں درس حدیث دے چکے تھے۔ امرت سر میں مدتوں تدریس وتصنیف کے ذریعے اسلام کی اہم خدمات انجام دیں۔ شریعت ظاہری کے ساتھ طریقت باطنی کے بھی رمزآشنا تھے۔ سلسلہ مجددیہ نقش بندیہ سے خاص شغف

رکھتے تھے۔ حضرت مجدد (رحمتہ اللہ علیہ) کے مکتوبات کو تہذیب وتحشیہ سے شائع کیا، تصوف کی کئی ایک اہم کتب کے ترجمے اور شرحیں لکھیں۔ ایسی ہی ایک کتاب مدت ہوئی میری نظر سے گزری تھی۔

میں انہیں عالم وعارف تو جانتا ہی تھا، لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ شعر سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب کے حاشیے پر ایک شعر تھا جس کے نیچے "لمترجمہ" مرقوم تھا، یعنی شعر مترجم کا طبع زاد ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ حضرت مولانا شاعر بھی تھے، یہ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا۔ اور شعر بھی اتنے پائے کا کہ اگر وہ عمر بھر میں صرف وہی ایک شعر کہتے تو ان کے شاعر عارف ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ شعر جو اسلام وعرفان کی جان ہے ملاحظہ فرمائیے۔

لِکُلِّ شَیْ ءٍ اِذَا فَارَقْتَہ عِوَضٌ
وَلَیْسَ لِلّٰہِ اِنْ فَارَقْتَ من عِوَضٍ

یقین کیجئے کہ میں ہفتوں اس شعر کے نشے سے سرشار رہا۔ اب بھی جب کبھی یاد آجاتا ہے تو ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ میرے دماغ میں اس کی شرح پھیلتی چلی گئی، اور کائنات کی ہر چیز جس تک میرے فہم کی رسائی ہوسکتی تھی، "لکل شی ء" کے احاطے میں سمٹی ہوئی محسوس ہوئی۔ شعر کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ

کائنات کی ہر چیز جو تم سے چھن جائے، اس کا کوئی نہ کوئی عوض یا بدل ممکن ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر تم روح کائنات اور حقیقۃ الحقائق خدائے پاک سے کٹ گئے تو اس کا بدل نہیں پاسکو گے۔"

راقم الحروف کی نظر سے بھی آپ کے دو شعر گزرے ہیں، جو آپ نے اپنے مرشد حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں کہے ہیں، یہ شعر کنز الہدایات کے صفحہ ۱۰۵ پر مرقوم ہیں:

وجودش ہمہ خیر آمد پدید   بایں شکل خیر مجسم کہ دید؟
فتد چشم لطفش بناقص اگر   کند کامل دہر از یک نظر

تراجم و تو الیف:

حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا یا جن کتابوں کے ترجمے کیے، وہ زیادہ تر سلسلہ نقشبندیہ کے مکاتیب و ملفوظات ہیں۔ اور یہ اتنا بڑا کام ہے جو مولانا کے نام نامی کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہونے کے علاوہ ان کے لیے بہترین صدقہ جاریہ بھی ہے اور حق یہ ہے کہ مولانا نے تصوف کے اس قیمتی سرمائے کو تباہ و برباد ہونے سے بچا کر اور ان میں نقل در نقل کے باعث جو بے حد غلطیاں پیدا ہوگئی تھیں، انہیں رفع کر کے تصوف و متصوفین پر احسان عظیم کیا ہے۔ اور اس بے مثال خدمت کی بدولت مولانا نے بزرگان نقشبند خصوصاً حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ و عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم کی ارواح طیبہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

(۱)   مبدأ و معاد

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے اس مبارک رسالے کو تصحیح اور ضروری

نوٹ لکھ کر شائع فرمایا۔ یہ مبارک رسالہ ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوا۔

(۲) مکتوبات امام ربانی

مکاتیب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح وتحشیہ کے سلسلے میں آپ کی کوششیں یقیناً بے مثال ہیں۔ ناشرین کی بے پروائی اور مصححین کی سستی یا کم فہمی کے باعث مکتوبات میں بہت سی تحریف واقع ہوئی اور کئی عبارتیں مسخ ہو چکی تھیں۔ اس حالت کو دیکھ کر مولانا مرحوم نے ان کی تصحیح کا کام شروع کیا اور اس غرض سے اطراف واکناف ملک سے قلمی مکتوبات اکٹھے کیے اور کمال عرق ریزی ومحنت کے ساتھ ہر ہر حرف کا بار بار مقابلہ کر کے اصل متن کی تصحیح فرمائی، نیز حواشی لکھ کر نکات دقیقہ اور معارف لطیفہ کو مشرح کر دیا۔ علاوہ ازیں مشکل الفاظ واصطلاحات کا حل بھی لکھ دیا، اور عربی عبارتوں پر اعراب لگانے کے علاوہ ان کا فارسی میں ترجمہ بھی کر دیا۔ متن میں جہاں جہاں آیات واحادیث ہیں، ان کا فارسی میں ترجمہ کرنے کے علاوہ ان کے حوالے بھی لکھ دیئے، تاکہ قارئین اپنے اصل مقام پر بھی ان آیات واحادیث کو دیکھ سکیں۔

اصل مکتوبات تو تین دفتروں میں ہیں۔ مگر مولانا مرحوم ومغفور نے ان کو نو (۹) حصوں میں منقسم کر کے شائع کیا کیونکہ کتابت نہایت عمدہ اور جلی کرائی۔ حواشی کا اضافہ اس پر مستزاد تھا۔ کاغذ بھی نہایت اعلیٰ لگانے کا انتظام کیا۔ اس لیے ان کو نو حصوں میں تقسیم کرنا نہایت ضروری تھا۔ مکتوبات شریف کے دفتر اول کے جزو اول کی تصحیح وتحشیہ کا کام ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، اور دفترِ سوم کا آخری حصہ یعنی جزو نہم اوائل جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء کو چھپ کر منظر عام پر آیا۔

یہ مکتوبات اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کے مختلف حصوں کے کئی کئی ایڈیشن

چند سالوں میں نکل گئے اور کثیر تعداد میں تاش قند، یارقند، سمرقند (بخارا) اور افغانستان میں فروخت ہوئے۔ مستشرقین یورپ نے بھی منگوائے۔ اب یہ مکتوبات بالکل نادرو نایاب ہو چکے ہیں، مگر ان کی مقبولیت کے مدنظر افغانستان کے کسی تاجر نے ان کے کچھ حصے مولانا مرحوم کا نام لکھے بغیر چھاپ دیے ہیں۔ چار پانچ برس ہوئے جب میں نے یہ مکتوبات (مطبوعہ افغانستان) لاہور میں کسی دوست کے پاس دیکھے تھے۔ مگر یہ امرت سری مطبوعہ جیسے قطعاً نہیں ہیں اور ناشر نے مولانا مرحوم کا نام نہ لکھ کر نہایت غیر مناسب حرکت کی ہے۔ مولانا کے شائع کردہ مکتوبات کے متعلق مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری لکھتے ہیں:

> "امام ربانی کے مکتوبات کے تین دفتر ہیں۔ سب سے بہتر اور دیدہ زیب ایڈیشن وہ ہے جس کو خاص الخاص اہتمام سے مطبع مجددی امرت سر نے ۱۳۳۳ھ میں شائع کیا تھا۔ اس پر نہایت مفید حواشی بھی ہیں اور تصحیح کا بھی حق ادا کر دیا گیا ہے۔ یہ فل سکیپ سائز کے ۱۲۶۲ صفحات پر ختم ہوا ہے۔"

(تذکرہ مجدد الف ثانی: مرتبہ محمد منظور نعمانی، مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۹۷)

یہ مکتوبات تین قسم کے کاغذوں پر شائع ہوئے تھے۔ سفید چکنے اور ولایتی کاغذ کی قیمت تیس روپے، کاغذ سفید ولایتی پچیس روپے، کاغذ بادامی کی قیمت بیس روپے تھی۔ اگر اس وقت یہ مکتوبات اسی شان سے شائع ہوں تو موجودہ نرخ کے لحاظ سے یک صد روپیہ قیمت کچھ بھی زیادہ نہ ہوگی۔

دو سال ہوئے جناب محترم مولانا محمد سلیمان صاحب مدظلہ، نے مجھے لندن

کے کسی فاضل شخص کا خط دکھایا تھا، جس میں تحریر تھا کہ

"مجھے مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کے محشی مکتوبات کی اشد ضرورت ہے، کسی قیمت پر بھی ملیں، میں ضرور لوں گا۔"

راقم آثم نے محترم مولانا محمد سلیمان صاحب کی خدمت میں کئی مرتبہ عرض کیا کہ ان مکتوبات کو پھر طبع کرائیے، مگر وہ ٹال جاتے رہے۔ اب انہوں نے بتایا ہے کہ میں پہلا حصہ عنقریب شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس نیک ارادے کو شرف تکمیل بخشیں۔ (آمین)

(۳) مکتوبات خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ جلد ثالث

حضرت امام ربانی قدس سرہ کے خلف الرشید حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب شریفہ فن تصوف کی پاک اور اصلی تعلیمات کا ایک بیش بہا گنجینہ ہیں۔ ان مکتوبات کی پہلی اور دوسری جلد تو مختلف مطابع کی طرف سے شائع ہو چکی تھی، مگر تیسری جلد اس وقت تک شائع نہ ہوئی تھی، بل کہ بعض حضرات کو ان کی تیسری جلد کا علم بھی نہ تھا۔ اس نادر و نایاب مجموعہ مکاتیب کو تصحیح و تنقیح اور نہایت گراں قدر حواشی لکھ کر بڑے اہتمام سے شائع کرایا۔

(۴) کنز الہدایات

یہ کتاب حضرت مولانا محمد باقر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ بن مولانا شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ اس کو بھی مولانا مرحوم نے تصحیح وغیرہ کے بعد نہایت عمدہ کاغذ پر بڑی عمدگی سے چھپوایا۔ یہ کتاب ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ۱۳۳۵ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اور اس کے آخر میں رسالہ کحل الجواہر،

رسالہ ملا جامی رحمۃ اللہ علیہ در بیان ذکر خفی و مختصر سوانح حیات حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ از شاہ رؤف احمد شامل کر دیے گئے ہیں۔

(۵) شمائل ترمذی:

اس مشہور و معروف رسالے کا ترجمہ کیا، اس کی عربی عبارت جلی مع اعراب کی اور ترجمہ بین السطور ہے۔ یہ نوے (۹۰) صفحات کا رسالہ ۱۳۴۱ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

(۶) ہدایۃ الطالبین:

یہ کتاب قیوم دوراں حضرت شاہ ابو سعید دہلوی نقش بندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف لطیف ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے۔ مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کے علاوہ اس کے بعض مشکل مسائل کا حل بھی لکھ دیا۔ ترجمہ اس طرح کیا کہ ایک کالم میں اصل فارسی عبارت رکھی اور اس کے بالمقابل ترجمہ دے دیا ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء میں طبع ہو کر مطبوع اہل نظر ہوئی۔

(۷) ملفوظات مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) کے ملفوظات کا ترجمہ کیا جو ماہ نامہ "الفیض" امرت سر میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس ترجمے کی پہلی قسط رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء کے پرچے میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، مگر جہاں تک میرا خیال ہے، یہ ترجمہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔

(۸) شرح اسماء الحسنیٰ:

اسماء الحسنیٰ کی نہایت عمدہ شرح وتفسیر تحریر فرمائی، جو ماہ نامہ ''الفیض'' میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اس مضمون کی پہلی قسط جمادی الاخری ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء میں چھپی تھی۔

ترجمہ ملفوظات حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ (اگر مکمل ہو چکا ہو) اور شرح اسماء الحسنیٰ چونکہ مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر انہیں مولانا مرحوم کے اخلاف کتابی صورت میں شائع فرمادیں تو طالبان تصوف پر ان کا بڑا احسان ہوگا۔

خصائل وعادات:

محترم ومکرم الحاج حکیم محمد علی صاحب مدظلہ، نے حضرت مولانا مرحوم ومغفور کے کچھ حالات لکھ کر ارسال فرمائے ہیں، ان میں سے عنوان کے لحاظ سے ضروری باتیں ذیل میں درج کی جارہی ہیں:

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی زندگی بالکل سادہ اور بے تکلف تھی، جب کبھی عام لوگوں کے ساتھ کہیں جانے کا اتفاق ہوتا تو آپ سب کے پیچھے پیچھے چلتے۔ اگر کوئی آگے سے ہٹ کر پیچھے ہونے لگتا تو آپ کہتے کہ بھائی میں آہستہ چلوں گا، آپ آگے ہو کر چلو۔

تقریر یا وعظ بالکل سادہ اور عام فہم ہوتا، شعر واشعار یا فرضی قصے کہانیاں ہرگز بیان نہ کرتے، صرف قرآنی آیات کی تفسیر اور ثقہ روایات عام فہم الفاظ میں بیان فرمادیا کرتے۔ آپ کی یہ سادہ تقریر ایسی مؤثر ہوتی کہ اکثر اوقات سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آپ اپنے وعظوں میں ہمیشہ متفقہ مسائل بیان فرماتے اور اختلافی مسائل کے نزدیک بھی نہ جاتے۔

رمضان شریف میں ایک قرآن کریم عام لوگوں کے ساتھ سنتے اور دوسرا

تہجد کے نوافل میں۔ حافظ محمد قاسم صاحب لدھیانوی مرحوم عموماً قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔آپ ان حافظ صاحب پر بہت زیادہ خوش تھے۔

آپ اپنے کام خود کیا کرتے تھے۔ کسی طالب علم سے اپنا ذاتی کام ہرگز نہ کراتے اور گھر کا سودا سلف خود خرید کر لاتے۔ جب کبھی خرید وفروخت کے لیے نکلتے تو بالکل اکیلے نکلتے۔آپ کبھی اس طرح بازار میں نہیں چلے کہ ساتھ طلبا اور معتقدین کا ہجوم ہو۔ کسی شاگرد کو اجازت نہ تھی کہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ چلے۔آپ فرمایا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوئے ہیں اور اپنے کام خود کیے ہیں، اس لیے ہمیں ان کے پیروی کرنی چاہیے اور اسی میں ہماری فلاح ہے۔

آپ کو آخر عمر میں کبھی کبھی درد نقرس ہونے لگتا تھا۔ایک مرتبہ اس مرض کے دورہ نے طول پکڑا، آپ صاحب فراش ہو گئے۔ علاج کے لیے کوئی گرم دوائی مقدار خوراک سے زیادہ کھائی گئی تو اس کے سبب پاخانے کے ساتھ خون آنے لگ گیا۔ڈاکٹر حاجی اشفاق محمد مرحوم نے یہ حالت دیکھ کر کہہ دیا کہ آپ کو بواسیر ہو گئی ہے۔

مولانا نے فوراً جواب دیا:

> ”ڈاکٹر صاحب! اللہ تعالیٰ سے ایسی امید نہیں کہ وہ مجھے ایسی تکلیف میں مبتلا کریں گے۔“[1]

چنانچہ دو چار دن کے بعد یہ تکلیف رفع ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ صرف گرم دوا کے استعمال سے خون آ گیا تھا، بواسیر ہرگز نہ تھی۔ اسی دوران مولانا نے اپنے

---

[1] مولانا نے غالباً اس لیے یہ فرمایا ہوگا کہ بواسیر تکلیف دہ بیماری ہونے کے ساتھ ساتھ آدمی کو پاک صاف نہیں رہنے دیتی اور عابدوں زاہدوں کے لیے پاک صاف رہنا نہایت ضروری ہے۔

صاحب زادے مولانا محمد سلیمان صاحب کو فرمایا:

"مسجد میں جہاں میں بیٹھتا ہوں جو چھوٹی الماری ہے اس میں دھاگے کا بٹوا رکھا ہے، اس میں کچھ روپے جمع ہو گئے ہیں اور میں روپے جمع نہیں ہونے دیا کرتا تھا۔ غالباً یہ تکلیف اسی وجہ سے ہے۔ لہٰذا یہ بٹوا اٹھا لاؤ۔"

مولانا محمد سلیمان صاحب کا بیان ہے کہ میں بٹوا لے کر حاضر ہوا تو آپ نے طلبا کو بلا کر ان میں تمام روپے تقسیم کر دیئے اور اس کے بعد آپ دو چار روز ہی میں تندرست ہو گئے۔

آپ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کے حقوق کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مستحق امداد رشتہ داروں کو نہایت خفیہ طور پر رقم بھجوانا آپ کا معمول تھا۔

مستری نور محمد صاحب نے ایک دفعہ بتایا کہ مجھے پختہ عمر میں نماز پڑھنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن تعلیم دین سے بالکل بے بہرہ تھا۔ صحیح طور پر وضو کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ چنانچہ ایک دن میں مسجد شیخ بڈھا کے حوض پر وضو کر رہا تھا کہ مولانا کی نظر پڑ گئی، اور آپ بھانپ گئے کہ بالکل اناڑی ہے۔ یہ دیکھ کر آپ میرے پاس آئے اور فرمایا: کہ میرے ساتھ ذرا مسجد کی چھت پر چلو، کچھ کام ہے، پانی کا لوٹا بھی ساتھ لے لو۔ اوپر جا کر جہاں بالکل تنہائی تھی، مولانا نے فرمایا: بھائی تم کو وضو کرنا نہیں آتا، وضو کا طریقہ سکھانے کے لیے تمہیں اوپر لایا ہوں۔ مستری صاحب مرحوم کہتے تھے کہ وضو کا طریقہ سکھانے کے بعد فرمایا: فلاں وقت میں بالکل اکیلا ہوتا ہوں، اس وقت آ کر نماز پڑھنے کا طریقہ اور ضروری مسائل سیکھ جایا کرو۔

کس قدر بلند اخلاق اور سمجھ دار مبلغ اسلام تھے مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ،

کہ انہوں نے اس بات کو سمجھا کہ اگر لوگوں کے سامنے اس نو وارد معمر کو کچھ سمجھایا تو ایسا نہ ہو کہ مارے شرم کے پھر یہ کسی مسجد میں قدم ہی نہ رکھے۔

مولانا پیر محمد شاہ اندرابی مرحوم امام مسجد رحمانیہ آرام گلی لاہور سے میں نے کہا کہ مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور عادات و خصائل کے متعلق کچھ بتایئے تو انہوں نے قرآن کریم کی یہ دو آیتیں پڑھ دیں:

وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا

''اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور وہ جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے اور (عجز وادب سے) کھڑے ہو کر راتیں بسر کرتے ہیں۔''

یعنی قرآن کریم نے اس مقام پر نیک بندوں کے جو فضائل بیان کیے ہیں وہ مولانا مرحوم میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔

حُلیہ ولباس:

آپ نہایت خوب صورت اور وجیہ تھے۔ چہرہ سرخ وسفید، بدن صاف و شفاف تھا۔ سر پر پٹھے (لمبے بال) رکھتے تھے۔ پیری کے باوجود ریش مبارک بالکل سفید نہیں ہوتی تھی۔ لباس نہایت سادہ زیب تن فرماتے جو آپ کے نورانی بدن پر خوب پھبتا تھا۔ مکلّف لباس پہننے سے عمر بھر احتراز کیا۔ جناب مولانا محمد سلیمان صاحب مدظلہ نے راقم الحروف کو بتایا کہ ایک مرتبہ مولوی عبداللہ درزی اور میری خواہش پر گرم کوٹ بنوالیا۔

لیکن اسے پہنا نہیں۔ کھونٹی پر ہی لٹکتا رہا۔ ایک دن کوئی غریب آیا اور اس نے سردی کی شکایت کی۔ مولانا نے سنتے ہی فرمایا کہ اس کوٹ کو اتار کر لے جاؤ اور پھر باہر جا کر پہننا۔ پھر فرمایا: کہ جلدی سے چلے جاؤ۔ کہیں سلیمان دیکھ کر ناراض نہ ہو۔ آپ موسم سرما میں روئی کی واسکٹ پر ایک گرم کپڑے کی واسکٹ پہنتے اور اوپر چادر اوڑھ لیتے تھے۔

بحث ومناظرہ سے احتراز:

آپ پر حقیقی تصوف کا اس درجہ اثر تھا کہ زندگی بھر کسی سے بحث ومناظرہ نہیں کی اور جو لوگ اس کے عادی تھے، انہیں بطریق احسن اس سے باز رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بحث ومناظرہ کا بازار گرم کرنے سے بے عملی پیدا ہوتی اور گمراہی پھیلتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ (متوفی ۱۹۴۸ء) کو خاص طور پر سمجھایا کرتے تھے کہ آپ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علماء سے جو مناظرے کرتے رہتے ہیں یہ دین کی خدمت نہیں بلکہ دشمنی ہے۔

بزرگ محترم حکیم مہر الدین صاحب راوی ہیں کہ میں نے ثناء اللہ صاحب کے پاس احیاء علوم الدین ا رکھی دیکھی تو ان سے پوچھا کہ آپ کے مسلک کے خلاف کتاب آپ کے پاس کیسے آئی ہے؟

ا اخبار ''اہلحدیث'' امرت سر کے منیجر حکیم سردار خاں نشاط جوانی سے پیری تک مولانا ثناء اللہ کے دفتر میں ملازم رہے، انہوں نے راقم سے بیان کیا کہ مولانا نور احمد نے مولانا ثناء اللہ کو علامہ ابن جوزی کی تصنیف تلبیس ابلیس مطالعہ کے لیے دی تا کہ وہ مناظرہ ومباحثہ کے مضر اثرات سے آگاہ ہو کر اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ ممکن ہے کہ حکیم مہر الدین صاحب اور حکیم سردار خاں مرحوم دونوں کی روایتیں صحیح ہوں اور مولانا نور احمد صاحب نے تلبیس ابلیس اور احیاء العلوم دونوں کتابیں بیک وقت یا مختلف اوقات میں مولانا ثناء اللہ کی تبلیغ حق اور خیر اندیشی کے خیال سے دی ہوں۔

مولانا ثناء اللہ نے جواب دیا:

''مولانا نور احمد صاحب کہا کرتے تھے کہ احیاء العلوم کے باب فتن العلم پڑھو۔ پھر آپ کو مناظرہ بازی کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اب مولانا نے خود ہی کتاب بھیج دی ہے اور میں نے یہ باب پڑھا ہے، اس کے مطالعہ سے میرے سر پر پانی پڑ گیا ہے اور سبق ملا ہے کہ و تبتل الیہ تبتیلا (اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ)۔''

مولانا ثناء اللہ نے یہ بھی فرمایا:

''جب ہم اپنی تصانیف کو دیکھتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ ہم اپنے اخلاف کے لیے کیا چھوڑ کر جائیں گے۔''

خوف و خشیت الٰہی:

مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ غایت درجہ عابد و زاہد اور پرہیز گار ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خشیت الٰہی رکھتے تھے جو جان عبادت اور روح زہد ہے۔ حاجی عبدالغفور مرحوم و مغفور جو ایک عرصہ دراز تک مسجد شیخ بڈھا میں مؤذن کے فرائض انجام دیتے رہے تھے، ان کی روایت ہے کہ ایک رات قریباً دو بجے مسجد سے رونے کی آواز آئی۔ میں دبے پاؤں وہاں گیا۔ دیکھا تو حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ رو رہے تھے اور روتے روتے ہچکی بندھ چکی تھی۔ میں ذرا ہٹ کر کھڑا رہا۔ آپ یہ پڑھ رہے تھے:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔[1]

---

[1] میں ہر ہر گناہ سے اللہ کی بخشش چاہتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔ ''فیض''

اور ایک دفعہ یہ بھی کہا:

الٰہی عاصیم استغفر اللہ

توئی فریاد رس الحمد للہ[1]

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے حضرات ہی کے لیے فرمایا ہے:

عاصیاں از گناہ توبہ کنند

عارفاں از عبادت استغفار

یعنی گنہ گار اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور عارف اپنی عبادت کو ہیچ سمجھ کر استغفار کرتے ہیں۔[2]

اللہ بخش زرگر مرحوم امرت سری حضرت مولانا مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر تھے۔ ان کی موجودگی میں ایک نوجوان آیا اور اس نے کہا: ''حضرت! میں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے۔ آپ مجھے سند لکھ دیجئے کہ میں ایک مسلمان ہوں۔''

مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قلم اٹھایا اور لکھ دیا۔ جب وہ نومسلم چلا گیا تو اللہ بخش زرگر نے عرض کیا:

''حضرت ایک کاغذ پر مجھے بھی لکھ دیجئے کہ میں مسلمان ہوں۔''

مولانا یہ سن کر زار و قطار رونے لگے اور فرمایا کہ

بھائی وہ تو قانونی بات تھی۔ اس لیے میں نے لکھ دی۔ دراصل مجھے تو اپنے

1۔ یا اللہ میں گنہ گار ہوں۔ مغفرت کا طالب ہوں تو ہی فریاد کو پہنچنے والا ہے سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ''فیض''

2۔ شعر کے اس ترجمے میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ فیض

متعلق بھی معلوم نہیں کہ میں حقیقتاً مسلمان ہوں یا نہیں ،ایسی صورت میں آپ کو مسلمانی کا سرٹیفکیٹ کیسے لکھ دوں؟

حزم واحتیاط:

آپ متفقہ طور پر امرت سر کے مفتی اعظم تسلیم کیے گئے تھے۔لیکن اس معاملے میں بہت زیادہ محتاط تھے۔جب تک انہیں ہر طرح سے اطمینان نہ ہو جاتا ہرگز فتویٰ نہ دیتے۔عیدالفطر کے موقع پر رویت ہلال کے متعلق اکثر جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔لوگ جھوٹی سچی شہادتیں پیش کر کے مفتیوں سے زبردستی فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں۔ایک دفعہ آسمان ابر آلود تھا اور چاند کا نظر آنا ناممکن تھا،لوگ فتویٰ حاصل کرنے کے لیے مسجد شیخ بڈھا میں جمع ہو گئے۔مولانا مسجد میں موجود نہ تھے اور تلاش بسیار کے باوجود آپ کا پتہ نہ چلا کہ کہاں ہیں؟ لوگوں نے مایوس ہو کر دوسرے علماء کی طرف رجوع کیا۔اگلے دن جناب محترم عبدالمجید صاحب پوسٹ ماسٹر نے دریافت کیا، حضرت آپ کل کہاں چلے گئے تھے تو آپ نے بتایا کہ

> ''بھائی دانستہ غائب ہو گیا تھا اور رات فلاں مسجد میں چھپ کر گزاری، کیونکہ چاند مجھے تو نظر آیا نہ تھا اور نہ ہی کسی اور کو آنے کا امکان تھا۔لیکن لوگ حسب عادت فتویٰ حاصل کرنے پر اصرار کیا کرتے ہیں اور میں مشتبہ امر میں فتویٰ دینے سے ڈرتا ہوں۔''

توکل واستغنا:

مولانا مولوی سید دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۵۴ھ) کے تقرر سے قبل مرزا سر ظفر علی جج متولی مسجد وزیر خان مرحوم نے کئی بار امرت سر میں

مولانا نور احمد کی خدمت میں حاضر ہو کر مسجد وزیر خان کی خطابت قبول کرنے کی درخواست کی، مگر آپ انکار کرتے رہے اور فرمایا:

''میرے لیے یہی گوشہ تنہائی کافی ہے۔''

مولانا مرحوم کے انکار پر مولانا دیدار علی مرحوم کو جج صاحب نے خطیب مقرر کیا۔

آپ نے جب مکتوبات حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ شائع کیے تو یہ مسٹر الفرڈ وولنر (ALFRED WOOLNER) وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی نظر سے گزرے۔ الفرڈ ان کے مطالعہ سے بہت محظوظ ہوا اور مولانا کی لیاقت وقابلیت کا قائل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مولانا کو امرت سر خط لکھا کہ میں آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں مگر مولانا نے لاہور آنے سے انکار کر دیا۔ آخر اس نے مولانا نجم الدین مرحوم پروفیسر اورینٹل کالج کو دستی چھٹی دے کر مولانا کی خدمت میں بھیجا جس میں ملاقات کی خواہش کا اعادہ کیا تھا۔ لیکن آپ نے پھر معذرت لکھ بھیجی۔

اس کے بعد وولنر نے آپ کو اورینٹل کالج میں (بحیثیت اول مدرس عربی) لانے کی کوشش کی مگر اس کی یہ امید بھی پوری نہ ہوئی۔ پھر اس نے مولوی فاضل کے امتحانات کے نگران اعلیٰ بننے کے متعلق لکھا تو آپ نے یہ لکھ بھیجا:

''میں فقیر آدمی ہوں، مجھے ایسی چیزوں کی ضرورت نہیں۔''

امراء سے بے نیازی:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مندوں میں بے شمار رؤسا وامراء بھی تھے۔ مگر ان سے آپ کا برتاؤ ہمیشہ مناسب طور سے رہا۔ کبھی ایسا نہیں ہونے دیا جس سے یہ ثابت ہو کہ بارگاہ علم وفقر میں بھی ان کی حیثیت وہی ہے جو فرنگی کے دربار

میں ہوتی ہے یا تن پرور مولویوں اور پیروں کی سرکار میں۔

ندوۃ العلماء کے اجلاس جو ۲۵۔۲۶۔۲۷ نومبر ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ کو ایم اے او کالج امرت سر میں منعقد ہوئے تھے۔ مجلس استقبالیہ کے آفس سیکرٹری مولانا محمد سلیمان صاحب تھے۔ اس جلسہ میں شرکت کے لیے نواب صدر یار جنگ صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۲۹ھ/۱۹۵۰ء) بھی تشریف لائے تھے۔ صدر یار جنگ صاحب نے مولانا محمد سلیمان صاحب سے کہا کہ

''میں مولانا نور احمد صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اس غرض سے کل صبح بعد نماز فجر مسجد شیخ بڈھا میں حاضر ہوں گا۔''

مولانا محمد سلیمان نے مولانا مرحوم کو اطلاع کر دی۔ چنانچہ دوسرے روز آپ بعد نماز فجر اپنے حجرے میں تشریف نہ لے گئے بل کہ مسجد کی محراب میں بیٹھے ذکر و فکر میں مشغول رہے جب نواب صدر یار جنگ تشریف لا کر مولانا کے حجرے میں بیٹھ گئے اور مولانا کو ان کے آنے کی اطلاع ہوئی تو آپ تشریف لائے۔ آپ کی آمد پر نواب صاحب مرحوم اٹھ کر ملے۔ پھر دیر تک یہ دونوں بزرگ باتیں کرتے رہے اور نواب صاحب نے ناشتا بھی نہیں کیا۔

مولانا صاحب کے مزاج شناسوں کا کہنا ہے کہ آپ اس دن خلاف معمول اپنے حجرے میں اس لیے نہیں گئے کہ جو مہمان تشریف لا رہے تھے وہ ''مولانا'' ہونے کے ساتھ ''نواب صدر یار جنگ'' بھی تھے اور ایسے لوگوں کے لیے تعظیماً کھڑے ہونا آپ کے مزاج کے سخت خلاف تھا۔

حاجی شیخ بڈھا مرحوم کے فرزند جناب شیخ دوست محمد مرحوم سے ایک مرتبہ

خلاف شرع کوئی فعل سرزد ہو گیا، مولانا کو اس کا علم ہوا تو فوراً لکھ بھیجا کہ اس گناہ سے توبہ کرو، ورنہ آپ کی مسجد سے ابھی نکل جاؤں گا۔

شیخ صاحب موصوف مولانا کا حکم نامہ پڑھتے ہی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے روبرو توبہ کی اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔

بعض لوگوں نے بتایا ہے کہ مولانا نے یہ رقعہ بھیجنے کے ساتھ ہی اپنا اسباب باندھنا شروع کر دیا تھا۔

حق گوئی کا ایک واقعہ:

انجمن اسلامیہ امرت سر ہر سال ماہ ربیع الاول میں مجلس میلاد منعقد کیا کرتی تھی جس میں حضرت مولانا مرحوم شرکت فرماتے اور ذکر ولادت نبی ﷺ بیان فرمایا کرتے تھے۔ جن ایام میں مسجد نور زیر تعمیر تھی (یہ مسجد آپ نے بنوائی تھی) تو آپ روزانہ انجمن پارک میں سے گزر کر مسجد نور جایا کرتے تھے، ایک دن آپ نے دیکھا کہ انجمن پارک میں کچھ لڑکے ڈھول اور باجے بجانے میں مصروف ہیں (یہ لڑکے اسلامیہ ہائی سکول قائم کردہ انجمن اسلامیہ امرت سر کے بینڈ والے تھے) آپ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان میں ایک وہ لڑکا بھی ہے جس کو آپ نے "مدرسہ تجوید القرآن" میں تعلیم دلا کر حافظ قرآن بنایا تھا۔ آپ نے حافظ طالب علم کو اسی وقت یہ فرمادیا کہ آج ہی بینڈ والوں میں سے اپنا نام کٹوادے اور اس کے والد کو بھی بلا کر تاکید کر دی کہ لڑکے کو اس گروہ میں ہرگز شامل نہ ہونے دے۔

اس واقعہ کے چند ہفتہ بعد آپ حسب معمول مجلس میلاد میں تشریف لے گئے، اور وہاں شہر کے امراء و رؤسا اور ممبران انجمن سب جمع تھے۔ آپ نے اس مرتبہ

نہایت غیظ وغضب کے ساتھ ڈانٹا اور کہا کہ میں نے جس لڑکے کو حافظ قرآن بنایا تھا انجمن اسلامیہ نے جو اسلام کے نام پر چندہ جمع کرتی ہے، اس کو بانسری بجانے پر لگا دیا ہے۔ جس منہ سے وہ خدا کا کلام پڑھتا ہے تم نے اس منہ میں بانسری دے دی ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ آپ نے حاضرین کو نہایت سخت لہجہ میں خطاب کیا اور خدا سے ڈرنے کی تلقین کی۔ پھر یہ کہہ چلے آئے کہ آئندہ میں انجمن اسلامیہ کی منعقد کردہ محفل میلاد میں ہرگز شریک نہ ہوں گا۔

قریباً اس کے ایک سال بعد آپ کا وصال ہو گیا اور آپ کے بعد آپ کے فرزند دل بند مولانا ابوالبیان محمد داؤد مرحوم ومغفور اس مجلس میں باقاعدگی سے شرکت فرماتے رہے۔

دعوت علماء:

ہر نماز جمعہ کے بعد امرت سر کے اکثر علماء مسجد شیخ بڈھا میں مولانا کے فیوض وبرکات سے متمتع ہونے کی غرض سے جمع ہوا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کی اہلیہ محترمہ الثران لوکوں لی ضیافت کے لیے دودھ، باقر خانی اور مٹھائی وغیرہ تیار رکھتی تھیں۔ یہ حضرات رخصت ہونے سے قبل مولانا کے گھر جا کر (جو مسجد سے متصل تھا) یہ ماحضر تناول فرما لیتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حسب معمول جماعت علماء ضیافت کھا کر فارغ ہوئی تو ان میں سے حضرت مولانا مفتی محمد حسن مرحوم نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ انہوں نے ابھی ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی:

لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُکُوۡرًا

''ہم تم سے کسی عوض کے خواست گار ہیں، نہ شکر گزاری کے طلب گار۔''

اور سب کو رخصت کر دیا۔

اسی ہفتہ واری مجلس میں اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ کی تفسیر فرماتے ہوئے شعر ذیل سنایا:

گلاں سبھو گلڑیاں تے نام چین دی گل

نام جپیں تو ایسا جپڑا بھے کلیجا مل[1]

ایک بار مکتوبات مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر گفتگو ہو رہی تھی تو عبارت ذیل اِنَّہٗ تَعَالٰی وَرَآءَ الۡوَرَاءِ کا ترجمہ اس طرح فرمایا:

اُتے نالوں اُتوں اُتے پریوں پرے پریرے۔[2]

تاثیر الفاظ:

ہمارے ممدوح مولانا مرحوم غایت درجہ متقی، پرہیز گار اور مخلص ترین بزرگ تھے۔ ان کے وعظ و نصیحت میں ریا و سمعہ کو ہرگز دخل نہیں ہوتا تھا۔ جو کچھ کہتے تھے اللہ ہی کے لیے کہتے تھے۔ اسی لیے ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ خاص تاثیر رکھتے تھے کیونکہ ''الکلام اذا خرج من القلب وقع علی القلب'' یعنی از دل خیزد بر دل ریزد''۔

---

[1] اور سب باتیں تو صرف باتیں ہی ہیں، اصل بات اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کا ذکر ہے۔ ذکر کرو تو اسی طرح کرو کہ تمہارے باطن میں خالص ذکر ہی ذکر ہو۔ دوسری طرف دھیان نہ جائے۔ فیض

[2] بلند سے بلند تر (عقول و افہام کی رسائی سے) آگے، ہر آگے سے آگے۔

میرے دوست حکیم محمد حسین ارشد مرحوم نے مجھ سے ایک عجیب واقعہ بیان کیا کہ میں نے کرم سنگھ پنساری (اس سکھ کو راقم بھی جانتا ہے) سے تین ہزار روپے لینے تھے کہ تقسیم ملک کا ہنگامہ شروع اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوا، مسلم اور غیر مسلم کا میل ملاپ محالات میں سے ہوگیا تھا، اندریں حالات کرم سنگھ پنساری کا خط مجھے (حکیم ارشد مرحوم کو) ملا کہ امرت سر کے سٹیشن پر فلاں وقت پہنچو، مجھے آپ سے خاص کام ہے حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں مقررہ وقت پر پہنچا تو کرم سنگھ کھڑا تھا، بڑی گرم جوشی سے ملا اور ہاتھ جوڑ کر تین ہزار روپے میرے حوالے کردیے میں یہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا کہ ایسے وقت میں اسے رقم ادا کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟

آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس خطرناک دور میں آپ کو یہ تحریک کیسے ہوئی؟ اس پر بھائی کرم سنگھ نے بتایا کہ مدت گزری میرا بچہ سخت بیمار ہوگیا تھا۔ اور کسی علاج وتدبیر سے اسے صحت نہ ہوتی تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں مجھے کسی نے بتایا کہ مسجد شیخ بڈھا میں مولوی نور احمد صاحب کے پاس اسے لے جاؤ! وہ دم کریں گے تو یہ ضرور شفایاب ہوجائے گا، چنانچہ میں بچہ کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے دم کیا، تین دن میں بچہ بالکل تندرست ہوگیا، کرم سنگھ صاحب نے مجھے بتایا کہ جس وقت میں بچے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچا تو وہ کسی شخص کو نصیحت فرما رہے تھے کہ

"کاروبار میں کسی سے دھوکا درست نہیں ہے اور کسی کا مال غصب نہیں کرنا چاہیے اور جو ایسا کرتے ہیں وہ دونوں جہان کے خساری میں ہیں۔"

مولانا صاحب کا یہ ارشاد میرے دل میں گھر کر گیا اور میں نے ہمیشہ کوشش

کی ہے کہ کسی کا ناجائز طور پر مال غصب نہ کروں۔ اب چونکہ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے سے ملنے اور کاروباری تعلقات قائم رہنے کی توقع بالکل نہیں رہی، اس لیے میں نے آپ کو بلا کر یہ رقم دے دی ہے تاکہ میں اس بارے سبکدوش ہو جاؤں۔

اللہ اللہ کیسے نیک اور مخلص لوگ تھے کہ ان کی باتوں کا کافروں پر بھی گہرا اثر ہوتا تھا اور آج وہ وقت ہے کہ خود ہمارے ہی علماء کا کردار مسلمانوں کو اسلام و اخلاق سے نفور و دور کر رہا ہے، الا ما شاء اللہ۔

تاثیر دعا:

امرت سر میں کوئی وباء پھیلتی، بارش نہ برستی یا اس قسم کی کوئی اور آفت آتی تو بارگاہ خداوندی سے معاصی کی معافی مانگنے اور رحم و کرم کی درخواست کرنے کے لیے عوام و خواص ایک جگہ جمع ہوتے (عموماً مسجد خیر الدین میں) اور طلب دعا میں مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہی منتخب کرتے، آپ اس خشوع و خضوع سے دعا مانگتے کہ اجابت خود استقبال کو بڑھتی۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مدت تک بارش نہ ہوئی۔ تمام شہر والے سخت گھبرائے ہوئے تھے، گرمی اپنے جوبن پر تھی، اس کی شدت کے باعث اموات ہو رہی تھیں۔ اندریں حالات مولانا نے اعلان کرایا کہ عید گاہ میں تمام مسلمان جمع ہو کر دعا کریں تاکہ یہ سختی رفع ہو جائے۔ حسب اعلان بعد نماز ظہر مسلمان جمع ہو گئے تو مولانا نے اپنا سر ننگا کر لیا اور جمیع حاضرین کو ننگے سر ہونے کی ہدایت فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے قرآن پاک کی چند آیات تلاوت فرمائیں اور اس خشوع و خضوع سے دعا فرمائی کہ

تمام کے تمام حاضرین زار و قطار رونے لگے اور آپ خود بھی گریاں تھے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ بادل آسمان پر محیط ہو گئے اور اس قدر برسے کہ لوگ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چل کر اپنے گھروں میں پہنچے۔

ابھی ابر رحمت برستا ہے آکر
اٹھائیں تو ساغر دعا کرنے والے

عجیب اتفاق:

جنگ عظیم میں جب انگریزوں، یونانیوں اور بلقانیوں وغیرہ نے متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کا تہیہ کر لیا اور ترکوں کو پے در پے شکستیں دے کر انہیں سمرنا کے آخری حصار میں محصور کر دیا اور یہ خبر نشر کر دی تھی کہ کل ہماری افواج سمرنا میں داخل ہو جائیں گی، اس اندوہناک خبر سے مسلمانوں کو بے حد صدمہ پہنچا، اور سب مسلمان اللہ کے حضور دست بدعا تھے کہ ان ظالموں کے پنجے سے ترکوں کو بچائے۔ اس دن مولانا نور احمد نے اعلان کیا کہ سب لوگ مسجد خیر الدین میں جمع ہو کر ترکوں کی کامیابی کے لیے دعا کریں۔ چنانچہ بعد نماز عشاء مسجد خیر الدین عوام و خواص سے کھچا کھچ بھر گئی اور سب نے مولانا ہی کو دعا کے لیے کہا۔ چنانچہ آپ نے اپنے کرتے کی آستینیں گلے میں ڈال اور ننگے سر ہو کر عربی زبان میں دعا مانگی۔ آپ پر رقت طاری تھی اور تمام حاضرین دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ارد گرد کے در و دیوار بھی رو اور چلا رہے ہیں، بارگاہ خداوندی میں گڑگڑانے اور عرض و معروض کرنے کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا، تا آنکہ "وکیل" اخبار امرت سر میں یہ تار پہنچ گیا کہ ابھی ترکوں نے نہ صرف محاصرہ ہی توڑ دیا ہے بلکہ اتحادیوں کی

افواج کو قید بھی کر لیا ہے، نیز قسطنطنیہ پر دوبارہ قابض ہو گئے ہیں۔ اس تار کو لے کر ''وکیل'' اخبار کے ایڈیٹر صاحب مسجد خیر الدین میں آئے اور مولانا کے پاس پہنچ کر یہ خوش خبری سنائی۔ تمام لوگ شاداں وفرحاں اپنے گھروں کو لوٹے اور سب کی زبان پر یہ تھا کہ مولانا نور احمد واقعی مستجاب الدعوات بزرگ ہیں۔[1]

یاں اٹھا ہاتھ وہاں باب اجابت وا تھا
عرش سے پھر کے نہ محروم دعائیں آئیں

ترکوں کی کامیابی کا تار ملنے پر شعراء نے نظمیں لکھی تھیں۔ طاہر مرادآبادی نے فوراً ایک طویل نظم چھپوا کر تقسیم کی تھی جس کا ایک مصرع یاد ہے:

ع تار آیا ہے کہ ترکوں نے سمرنا جیتا

خاص بات:

حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''مدرسہ نعمانیہ'' میں ایسے لوگوں کو ہرگز ہرگز داخل نہ کرتے تھے جو کام چور ہونے کی وجہ سے گھر سے بھاگ کر آتے اور محض روٹیاں کھانے کے لیے مسجدوں اور مدرسوں میں داخل ہو جاتے تھے اور حق یہ ہے کہ جب سے ایسے لوگ دینی مدارس میں کثرت سے داخل ہو کر ''مولوی'' اور ''مولانا'' بن بن کر نکلنے لگے ہیں، انہوں نے دین کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا ہے۔ احقر راقم الحروف کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایسے مولویوں کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ

''یہ علما نہیں بل کہ مسجد کے مینڈھے ہیں۔''

---

[1] اس روایت کے راوی بابو عبدالمجید صاحب پوسٹ ماسٹر ہیں جو اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ منہ

مولانا صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے جو بھی آتا، آپ اس کی صلاحیت اور ذوق وشوق کو خوب اچھی طرح جانچ کر مدرسے میں داخل کرتے، اگر آپ دیکھتے کہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اسے دھتکار نہ دیتے بلکہ بڑے پیار سے کوئی دوسرا کسب وحرفہ سیکھنے کی ہدایت فرماتے اور کچھ دن اپنے پاس رکھ کر اس کی ذہنی تربیت کرتے۔ پھر کسی دکان دار یا کارخانہ دار کے پاس لے جاتے اور فرماتے کہ اسے کام سکھاؤ اور کچھ گذارہ الاونس بھی دے دیا کرو۔ تمام شہری دل وجان سے آپ کا احترام کرتے تھے، کسی کو مجال انکار نہ تھی۔ فوراً تعمیل ارشاد پر آمادہ ہو جاتے، اسی طرح آپ نے بہت سے لوگوں کی زندگیاں سنوار دیں۔

امرت سر کے ایک خوش حال شخص نے راقم الحروف کو بتایا کہ میں بھی گھر سے بھاگ کر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوا تھا، میرے ساتھ بھی مولانا نے وہی سلوک کیا جو مجھ ایسے بھگوڑوں سے کیا کرتے تھے، چناں چہ مجھے ایک درزی کے پاس لے گئے اور اسے کہا کہ اسے درزی بناؤ اور اس کی خوراک اور رہائش کا بندوبست بھی تمہیں ہی کرنا ہوگا، اس نے بسر وچشم قبول کیا۔ یہ صاحب کہتے تھے کہ واقعی مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ پر خاص احسان فرمایا۔ ورنہ آج میں کسی مسجد میں مؤذن ہوتا اور اس سے زیادہ کچھ نہ بن سکتا، کیوں کہ مجھے اپنی استعداد کا یقین ہو چکا ہے کہ میں ہرگز عالم نہ بن سکتا تھا۔

مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن لوگوں کو صنعت وحرفت پر لگاتے تھے، انہیں فرمادیا کرتے تھے کہ

"رات کو میرے پاس آجایا کرو، میں تمہیں دین کا ضروری علم

سکھادوں گا۔"

قبلہ والد ماجد کی روایت ہے کہ میرے پاس اکثر ایسے لوگوں کو لاتے اور فرماتے کہ اس کو دواخانہ میں لگاؤ اور طب پڑھاؤ۔ضروری مسائل دین میں سمجھادوں گا" چناں چہ بہت سے لوگ کام سیکھ کر عطار (شربت شیرہ فروش) بن گئے اور دو ایک طبیب بھی ہو گئے۔ایک مرتبہ آپ ایک پٹھان کو اسی غرض سے لائے۔میں نے تعمیل ارشاد کی۔وہ چند روز بعد بیس روپے چوری کر کے بھاگ گیا۔مولانا کو کسی طرح اس واقعہ کا علم ہو گیا، تو خود تشریف لائے اور بیس روپے نکال کر مجھے دیئے کہ

"یہ لو آپ کا جو نقصان ہو گیا ہے۔"

میں نے باصرار روپے واپس کیے اور عرض کیا کہ

"اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟"

پھر اس کے بعد کسی آدمی کو والد ماجد مرحوم کے پاس نہ لائے ،اس خیال سے کہ ایک آدمی نے ان کا نقصان کر دیا تھا۔

اقوال وارشادات:

قبلہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ مولانا علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے:

"حلوائی سے ادھار کرنے کی بجائے پیٹ سے ادھار کرلیا کرو،

اس طرح تمہیں کبھی تقاضا کی شرمندگی نہیں اٹھانا پڑے گی۔"

آپ اکثر یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

"رات کو سوتے وقت یہ حساب کرلیا کرو کہ تم نے آج کتنی نیکیاں اور کتنی برائیاں کی ہیں۔"

یہ جملہ کتنا بڑا وعظ ہے؟ محاسبہ اعمال کا کتنا آسان طریقہ ہے؟ اگر کوئی اس پر عمل کرے تو اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں کیا ہوں؟ اور کیا کرتا ہوں؟ اور پھر یہ بھی بعید نہیں کہ اسے معاصی و معائب سے توبہ کی توفیق بھی مل جائے۔

آپ اپنے بیٹوں کو خاص طور پر یہ فرمایا کرتے تھے:

"اللہ کے راستے میں خرچ کرنے میں تنگی نہ کیا کرو۔ اگر تم تنگی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی تنگی کرے گا۔"

یہ قول دراصل ایک حدیث شریف کا ترجمہ ہے۔

بارہا اپنے فرزندوں کو یہ نصیحت کی:

"زکوٰۃ پابندی سے ادا کیا کرنا۔ مولوی لوگ نماز پابندی سے پڑھ لیتے ہیں، نوافل ادا کرتے ہیں لیکن زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں۔"

آپ نے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"اہل اللہ کے اخلاق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شرعی طریق سے بھوکے رہتے ہیں (مثلاً روزہ رکھتے ہیں یا کھانا کم کھاتے ہیں وغیرہ اگر ان کو حلال غذا میسر نہیں ہوتی، تب تو وہ کئی کئی رات دن بغیر کھائے گذار دیتے ہیں۔"[1]

ماہنامہ "الفیض":

اس مضمون میں ماہنامہ "الفیض" کے بکثرت حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس

---

[1] الفیض امرتسر ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کی بھی مختصر تاریخ بیان کر دی جائے۔ ''الفیض'' مولانا مرحوم ومغفور کے صاحبزادگان مولانا محمد سلیمان ومولانا محمد داؤد نے جاری کیا تھا۔ اس قابل قدر علمی ماہنامہ کا پہلا شمارہ جمادی الثانیہ۱۳۴۲ھ مطابق جنوری ۱۹۲۴ کو منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ یہ رسالہ مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زیرنگرانی طبع ہوتا تھا اور آپ کے متصوفانہ مضامین بھی اس میں چھپا کرتے تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۴۷ء تک امرت سر سے شائع ہوتا رہا، تقسیم کے بعد مولانا سلیمان نے لاہور سے نکالا، مگر گوناگوں مصروفیات اور مہاجرانہ حالات کے تحت اسے بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

''الفیض'' میں حضرت مولانا مرحوم کے جتنے مضامین شائع ہوتے تھے، وہ سب کے سب یک جا کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو بہت ہی اچھا ہو۔ امید ہے کہ مولانا محمد سلیمان اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

مسجد نور:

آپ نے اپنی وفات سے قریباً ایک سال قبل ہال دروازہ کے باہر، انجمن پارک[1] اور ہائڈ مارکیٹ کے درمیانی خطے میں مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا تھا جو سال بھر میں آپ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل تیار ہو گئی مسجد کی تکمیل کے فوراً بعد آپ نے مولانا مفتی محمد حسن صاحب کو اس کا امام مقرر کیا۔ مسجد نور اب بھی آباد ہے، کشمیر لوگ اس میں رہتے ہیں مولانا کا مزار شریف جو مسجد سے ملحق ہے، وہ بھی اپنی اصلی حالت میں ہے۔

---

[1] یہ پارک انجمن اسلامیہ امرت سر کی ملکیت تھا۔ اب (تقسیم کے بعد) اس میں میوہ منڈی بن گئی ہے۔

اردو کے بلند پایہ ادیب، مجموعہ مکاتیب ''ڈال ڈال پات پات'' اور متعدد قابل قدر کتابوں کے مصنف جناب چوہدری پریم ناتھ دت ناصر امرت سری کو راقم الحروف نے لکھا تھا کہ مسجد نور کی موجودہ حالت اور سن تعمیر وغیرہ لکھ کر بھیج دیجئے۔

چنانچہ انہوں نے موقع دیکھ کر لکھا:

''مسجد آباد ہے، مولانا مرحوم کی قبر محفوظ ہے، خودرو گھاس اگی ہوئی ہے اور بیر کا درخت (بیری) سایہ کیے ہوئے ہے۔ مسجد کے دروازے والے پتھر پر کندہ ہے۔

مسجد نور

بنا کردہ

حضرت مولانا نور احمد صاحب، الحاج مفتی امرت سر

نور اللہ مرقدہ الشریف

۱۳۴۸ھ

مسجد کے اندر والے پتھر پر یہ کندہ ہے:

مسجد نور

بنا کردہ

حضرت مولانا نور احمد صاحب الحاج مفتی امرت سر

نور اللہ مرقدہ الشریف

تاریخ بنیاد مسجد نور

۱۳۴۷ھ

اسی پتھر پر سال وفات قد دخل الجنۃ مولٰنا[1] کندہ ہے

۱۳۴۸ھ

تردید قادیانیت:

مولانا مرحوم و مغفور قادیانیوں کو قطعاً مسلمان نہیں سمجھتے تھے اور اس فتنے کا استیصال ازحد ضروری جانتے تھے۔ چناں چہ آپ اس کی تردید و مخالفت میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ اس موضوع پر جو علماء اچھا لکھ سکتے تھے، ان سے ہر طرح تعاون فرماتے۔ قادیان میں مسلمانوں کی طرف سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت فرماتے رہے۔ قادیان میں مسلمانوں کے جلسے کی بنا بھی آپ ہی کے ایک عقیدت مند جناب عبدالمجید صاحب پوسٹ ماسٹر نے ڈالی تھی۔ موصوف لکھتے ہیں:

> "حضرت مولانا کی تشریف آوری امرت سر کے بعد میرا تبادلہ قادیان ہوگیا۔ اور میں نے دوران قیام قادیان "انجمن اسلامیہ" کی بنیاد رکھی۔ اور وہاں اسلامی جلسے کا پروگرام مرتب کیا۔ علماء کو دعوت نامے اور آمد و رفت کا کرایہ ارسال کیا۔ حضرت مولانا

---

[1] اس مادہ تاریخ کے عدد ۱۳۴۹ھ ہوتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ مولانا کا سال وفات ۱۳۴۸ھ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ گو (حضرت مولانا آسی) سے غلطی ہوگئی ہے یا انہوں نے تخرجہ کر کے اس مادہ کو منظوم کیا ہوگا مگر پتھر پر کندہ کرنے والے محترم نے قطعہ تاریخ سے صرف مادہ کو لے لیا اور تخرجہ کے نکتہ کو نہ سمجھا۔

نوٹ: یہ پتھر مولانا کی وفات کے بعد مولانا محمد سلیمان صاحب متولی مسجد ہذا نے نصب کرائے تھے۔

نوراحمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں خود حاضر ہوااور کرایہ پیش کیا۔آپ نے فرمایا:

''میرے عزیز! الحمدللہ، میں صاحب نصاب ہوں، مجھے کرائے کی ضرورت نہیں، میں قادیان ضرور آؤں گا،ممکن ہے کہ میرے وعظ سے کسی کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے باعث میری نجات ہوجائے۔''

چناں چہ آپ کے وعظ کا یہ اثر ہوا کہ چند لوگوں نے آپ کی تقریر سن کر جلسہ گاہ میں اعلان توبہ کیا۔''

اولاد:

امرت سر تشریف لانے کے بعد آپ نے ظفروال ضلع سیال کوٹ کے ایک معزز اور دین دار گھرانے میں شادی کی۔اور آپ کے ہاں سات اولادیں ہوئیں۔

سب سے بڑے صاحب زادے کا نام مولوی محمد یحییٰ تھا جو اٹھارہ سال کی عمر میں فوت ہوگئے۔

دوسرے صاحب زادے مولانا مولوی ابوالفیض محمد سلیمان صاحب بی اے ہیں۔آپ لاہور میں کتابوں کی تجارت کرتے ہیں، کئی کتابوں کے مصنف اور قرآن مجید کے پارہ اول کے مفسر بھی ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر قریباً ساٹھ برس کی ہوگی۔(سلمہ اللہ تعالیٰ)

تیسرے فرزند حضرت مولانا مولوی ابوالبیان محمد داؤد صاحب فاروقی مرحوم ومغفور خطیب مسجد شیخ بڈھا تھے۔مولانا محمد داؤد صاحب بے نظیر مقرر اور بے مثل واعظ

ہونے کے علاوہ کتب کثیرہ کے مؤلف مصنف بھی تھے۔ راقم الحروف نے انہیں بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ سال ہا سال محلے داری کے علاوہ ہمسائیگی بھی رہی، نیز مسجد شیخ بڈھا میں تعلیم بھی حاصل کی۔ آپ بالکل فقیر منش اور درویش دوست انسان تھے۔ افسوس کہ آپ عین عالم شباب میں ۱۹۴۲ء میں انتقال کر گئے۔ بہ وقت رحلت آپ کی عمر تقریباً ۳۴ برس ہوگی، نور اللہ مرقدہ۔

چوتھے بیٹے کا نام محمد زکریا تھا جو تین سال کی عمر میں فوت ہوا۔

ان کے علاوہ تین لڑکیاں پیدا ہوئیں سب سے بڑی صاحبزادی امرت سر میں ہی فوت ہوگئی تھیں، اور دو چھوٹی صاحب زادیاں عیال دار ہیں۔ سَلَّمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰی

وفات کی پیش گوئی:

آپ کی وفات قریباً اسی برس کی عمر میں ہوئی اور وقت رحلت آپ بالکل صحت مند تھے کسی قسم کی کوئی جسمانی تکلیف بالکل نہیں تھی۔ سفر آخرت اختیار کرنے سے تقریباً ایک ہفتہ قبل مسجد شیخ بڈھا مرحوم کے بڑے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ وہیں اپنے دونوں صاحب زادوں (مولانا محمد سلیمان و مولانا محمد داؤد) کو اپنے پاس بلایا اور فرمانے لگے:

”اب میرا دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے اور یہ بات کسی وقت اچانک ہو جائے گی، غفلت میں نہ رہنا۔“

یہ سن کر دونوں صاحب زادوں نے عرض کیا کہ

”اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، اگر ایسا ہوا تو ہمارے لیے قیامت آ جائے گی“۔

آپ نے پھر فرمایا:

"بے فکر نہ رہو، اب یہ بات ہونے ہی والی ہے"۔

اور فرمایا:

"لوگ اپنے مردوں کے استعمال کردہ کپڑوں سے ڈرا کرتے ہیں
تم ایسا نہ کرنا، میرے بستر اور کپڑوں کو اپنے استعمال میں لانا۔"

غالباً اس سے ایک دو روز بعد جامع مسجد خیرالدین مرحوم کے مؤذن میاں خان جو انجمن نعمانیہ امرت سر کے محصل چندہ بھی تھے، کو بلا کر کہا کہ تم مجھے اس طریق پر غسل دینا اور فرمایا:

"غسال لوگ مردوں کے ہاتھ اور بازو مروڑ مروڑ کر کپڑے
اتارا کرتے ہیں، میرے ساتھ ہرگز ایسا نہ کرنا۔"

چناں چہ مولانا کی وفات حسرت آیات کے بعد آستینیں کاٹ کر ان کا کرتہ اتارا گیا۔

جب وفات کی رات آئی تو نماز عشاء سے فارغ ہو کر مسجد کے حجرے میں تشریف فرما ہو گئے۔ اور اپنے شاگرد حاجی محمد دین کو بلایا، جو اسی سال حج کر کے آئے تھے اور مولانا کے حجرے ہی میں ان کا قیام تھا، ان حاجی صاحب کو آپ نے اپنے چائے پینے کا سامان (برتن، چولہا وغیرہ) دے دیا۔ اس کے بعد اٹھ کر مسجد کی سیڑھیوں کی طرف آتے جاتے رہے، جیسے کسی کے انتظار میں ہیں، اتنے میں مولانا مرحوم کے بڑے صاحب زادے محمد سلیمان آ گئے اور آپ انہیں ساتھ لے کر حجرے میں چلے گئے اور طاق سے ایک پیکٹ اٹھا کر نیچے فرش پر رکھا۔ اسمیں کیک کے ٹکڑے

تھے۔ آدھے محمد سلیمان کو دے دیئے اور فرمایا کہ آدھے محمد داؤد کے لیے ہیں (مولوی محمد داؤد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت امرت سر میں موجود نہ تھے) اس کے بعد ایک طالب علم کو بلایا جس کا نام محمد دین تھا۔ اس کو مسجد کی دکانوں کے کرائے کا رجسٹر اور نقد دس روپے دے کر فرمایا: کہ صبح کی نماز کے بعد یہ روپے اور رجسٹر متولیان مسجد شیخ بڈھا کے منشی شیخ محمد شریف کو دے دینا اور کہہ دینا کہ مسجد کی دکانوں کے موصولہ کرایوں میں سے میرے پاس جو رقم باقی تھی، وہ یہ ہے۔

اسی دوران میں مسجد کی سیڑھیوں میں نگاہ کیے کسی کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ مولانا محمد داؤد صاحب پسرور سے آ گئے۔ آپ انہی کا انتظار کر رہے تھے، مولانا محمد داؤد صاحب پر مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر پڑی تو آپ نے بلند آواز سے فرمایا:

"محمد داؤد بہت اچھا کیا کہ آ گئے، میں تمہارے انتظار میں تھا"۔

اس کے بعد ان کو حجرے میں لے گئے اور بقیہ کیک کے ٹکڑے دے کر گھر جانے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ "میں ابھی آتا ہوں"۔

مولانا محمد داؤد صاحب نے کیک حاصل کرنے کے بعد مسجد سے باہر کنویں کے پاس آ کر بڑے بھائی مولانا محمد سلیمان صاحب سے کہا کہ میں نے ابھی پسرور میں کئی دن رہنا تھا مگر کل رات خواب دیکھا کہ والد صاحب وفات پا رہے ہیں، اس لیے گھبرا کر آ گیا ہوں۔

جس وقت مولانا نے یہ عجیب وغریب اور خلاف عادت باتیں شروع کیں گھر میں مولانا محمد سلیمان نے ایک کمرے کے دو حصے کرنے کا پروگرام بنایا۔ چناں چہ یہ حسب ارادہ گھر جا کر لکڑی کے تختے جوڑنے میں مصروف ہو گئے مولانا صاحب

بھی جا کر ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مولانا محمد سلیمان گھر کی بیٹھک کے اس حصے کو علیحدہ کرنا چاہتے تھے، جس حصے میں نلکا لگا ہوا تھا، تاکہ یہ حصہ غسل خانے کی شکل اختیار کر لے۔ حضرت مولانا مرحوم پاس بیٹھے یہ کام دیکھتے رہے۔ تختے لگاتے لگاتے جب دو تین فٹ جگہ رہ گئی تو مولانا نے فرمایا:

''اس ٹکٹ گھر کو بند نہ کرو صبح کام آئے گا''۔

پھر فرمایا کہ

''اس بات سے خوشی ہوئی ہے کہ محمد سلیمان کو گھر سنبھالنے کا ڈھنگ آ گیا ہے۔''

مولوی محمد سلیمان صاحب نے حسب ارشاد کام بند کر دیا، مگر یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ ٹکٹ گھر صبح کس کام آئے گا۔

سفرِ آخرت:

آپ کا یہ معمول تھا کہ ہمیشہ رات کے دو بجے اٹھ کھڑے ہوتے۔ مکان کے کمرے میں یا کوٹھے پر ٹہل کر قرآنی آیات اور دعائیں پڑھتے رہتے۔ اور پھر قضائے حاجت سے فارغ ہو کر نماز تہجد میں مشغول ہو جاتے، چناں چہ حسب دستور وفات کی رات بھی نماز تہجد کے لیے اٹھے۔ سردی کے ایام تھے۔ وضو سے فارغ ہونے کے بعد موزے پہنے۔ یہ معلوم نہیں کہ ابھی نماز تہجد ادا کر چکے تھے یا نہیں۔ آپ نے ساتھ والے کمرے میں جہاں سب گھر والے سوئے ہوئے تھے، اپنی اہلیہ محترمہ کو آواز دی۔ یک بیک سب حیران و پریشان ہو کر اٹھے اور بیٹھک میں آئے دیکھا تو مولانا صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اور سانس تیزی سے چل رہا ہے، آپ

نے گھر والوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''اب میرے رخصت ہونے کا وقت ہے''۔

مولانا محمد سلیمان صاحب اسی وقت خان بہادر ڈاکٹر میر ہدایت اللہ مرحوم سول سرجن کو لینے گئے، جو نزدیک ہی رہتے تھے ڈاکٹر صاحب مولانا کو دیکھنے کے لیے مولانا محمد سلیمان کے ساتھ آگئے، اور ادھر ڈاکٹر حاجی اشفاق محمد صاحب کو بھی بلا لیا گیا۔ ڈاکٹر میر ہدایت اللہ مرحوم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مولانا کو سلام عرض کیا۔ اور معائنہ کرنے کے بعد کھلانے کے لیے دوا نکالی اور انجکشن کا سامان تیار کیا۔ مولانا نے یہ دیکھ کر فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب یہ، یہ سکرات موت ہیں، ان کا کوئی علاج نہیں''۔

مولانا صاحب اس وقت بڑے اطمینان سے وہ دعائیں پڑھ رہے تھے جو دم واپسیں پڑھنی چاہئیں۔ گو سانس تیزی اور آواز سے چل رہا تھا۔

ڈاکٹر میر ہدایت اللہ مرحوم نے آپ کو اس وقت مخاطب کر کے کہا کہ ان شاء اللہ آپ کو آرام آجائے گا، اس پر آپ نے لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھ ڈاکٹر صاحب کی جانب بڑھائے اور انہیں مصافحہ کرنے کو کہا۔ مصافحہ کرنے کے بعد انہیں رخصت کرتے ہوئے فرمایا:

''آپ جائیں، یہ سکرات موت ہیں۔ میرے لیے دعائے خیر کرتے رہنا''۔

ڈاکٹر صاحب پر مولانا کے ان الفاظ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ جب تک زندہ رہے مولانا کے مزار پر پہنچ کر فاتحہ پڑھتے رہے۔

اسی آخری رات آپ نے اپنے فرزندوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"مجھے دفن کر کے جلدی سے واپس نہ چلے جانا۔ کچھ دیر تک میری قبر کے پاس ٹھہرنا تا کہ مجھے قبر سے انس پیدا ہو جائے۔"

چناں چہ اس ارشاد کے مطابق مولانا کے صاحب زادے دیر تک قبر کے قریب بیٹھ کر قرآن خوانی کرتے رہے۔

اس کے بعد پھر اپنے بیٹوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

"صلوٰۃ......زکوٰۃ......بناۃ"

یعنی نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی اور ہمشیرگان سے نیک سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی۔

ان الفاظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ آخری دم تک مطمئن اور باہوش تھے۔ اس کے چند منٹ بعد دعائیں پڑھتے پڑھتے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

صورت از بے صورتی آمد بروں

باز شد انا الیہ راجعون

۱۳ شعبان المعظم ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۴ جنوری ۱۹۳۰ء نماز فجر کا وقت شروع ہونے سے چند ساعت قبل شریعت و طریقت کا یہ بدر کامل مستور ہوا۔

مولانا کو بیٹھک کے اسی حصے میں غسل دیا گیا جو تختے لگا کر علیحدہ کیا گیا تھا اور جو تختہ لگنے سے رہ گیا تھا، جسے آپ نے "ٹکٹ گھر" فرمایا تھا، وہ غسل کا سامان وغیرہ منتقل کرنے کے کام آیا کیوں کہ غسل کا تختہ بچھانے کے بعد دروازہ رک گیا تھا اور اسی "ٹکٹ گھر" سے سامان دیا جاتا رہا۔ اگر یہ حصہ رات ہی بند کر دیا جاتا تو صبح غسل دیتے وقت ذرا دقت پیش آتی۔

غسل کے بعد آپ کو کفن پہنا کر چارپائی پر لٹایا گیا تو جسم بالکل زندگی کی طرح تروتازہ، نرم وگداز تھا، ان پر موت کے ورود کا یقین ہی نہیں ہوتا تھا۔ چہرہ سرخ وسفید اور بھرپور تھا۔ چارپائی پر پڑے ہوئے ایسے نظر آرہے تھے جیسے سوئے ہوئے ہیں۔ جس کو یہ پتا نہ ہو کہ آپ وفات پا چکے ہیں ہرگز نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ میت پڑی ہے۔

نماز جنازہ:

حضرت مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خبر وصال آناً فاناً شہر میں پھیل گئی اور امرت سر کے سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر بند رہنے کا اعلان ہوگیا۔ قریباً تیس ہزار افراد شریک جنازہ ہوئے۔ انجمن پارک میں نماز جنازہ پڑھی گئی۔

آخری آرام گاہ:

حضرت مولانا قدس سرہ، کی بنا کردہ مسجد نور کے ساتھ ایک تکیہ تھا، جس کی ایک دیوار مسجد سے ملی ہوئی تھی اس تکیہ کے مالک سے سید بڈھے شاہ مجسٹریٹ کے توسط سے قبر کے لیے زمین بعوض یک صد روپیہ خریدی گئی۔ اور یہاں قبر تیار کر کے آپ کے جسد اطہر کو دفنایا گیا۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ مَرْقَدَہٗ وَبَرِّدْ مَضْجَعَہٗ.

حضرت مولانا مرحوم ومغفور کی مرقد منور ابھی تک محفوظ ہے۔ آپ کے دائیں پہلو میں آپ کے فرزند ارشد حضرت مولانا ابو البیان محمد داؤد مرحوم ۱۹۶۲ء میں فوت ہو کر مدفون ہوئے۔ ان کے بعد (غالباً ۱۹۶۴ء میں) حضرت مولانا نور احمد علیہ الرحمہ کی اہلیہ محترمہ نے وفات پائی تو انہیں حضرت مولانا مرحوم کے بائیں پہلو میں دفن کیا گیا۔

ع   آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

قطعات تاریخ:

حضرت مولانا حکیم محمد عالم آسی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مولانا مرحوم ومغفور کے پیر بھائی تھے انہوں نے فصیح وبلیغ عربی میں آپ کا قطعہ تاریخ لکھا۔ اور ایک تاریخ اردو میں بھی کہی تھی، افسوس کہ یہ نوادر تلاش بسیار کے باوجود دست یاب نہیں ہو سکے، عربی قطعہ تاریخ کا مادہ (غالباً) ''قد دخل الجنته مولنا '' تھا۔ اس مادے سے ۱۳۴۹ھ برآمد ہوتے ہیں، اس لیے خیال ہے کہ ایک کا تخرجہ کیا ہوگا حضرت آسی رحمۃ اللہ علیہ نے جو قطعہ اردو میں موزوں کیا تھا، اس کا مصرعہ تاریخ یہ ہے:

ع ''فیض رسان عالم آہ'' (۱۳۴۸ھ)

حضرت مولانا مولوی سید شرافت نوشاہی مدظلہ العالی سجادہ نشین خانقاہ حضرت نوشہ گنج بخش قادری قدس سرہ نے جناب مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر جو قطعہ موزوں کیا تھا، راقم الحروف کے طلب کرنے پر انہوں نے تحریر فرما کر بھیجا ہے۔ وھو ھذا:

حضرت مولوی نور احمد	عالم باعمل، فقیہ حمید
زائر کعبہ، حاجی الحرمین	فاضل وقت شاہباز وحید
درعلوم شریعت وعرفاں	مثل ذاتش کسے ندید وشنید
بانی درس گاہ نعمانی[۱]	درجہاں فیض علم اوست مزید
نائب ذات شہ ابوالخیر[۲] است	قائد نقشبندیان مجید
رخت بستہ چوزیں سرائے فنا	روح والائے او بہ خلد رسید

۱۔ مدرسہ نعمانیہ امرت سر

۲۔ حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

سال ترحیل او اگر خواہی!
از شرافت شنو "چراغ سعید"

۱۳۴۸ھ

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ مشہور خوش نویس اور صوفی جناب سید نفیس الحسینی صاحب نفیس رقم تشریف لائے اور انہوں نے بتایا کہ

"عارف کامل حضرت مولانا سید شاہ عبدالکریم نقشبندی قدس سرہ[1] نے بھی حضرت مولانا نور احمد نور اللہ مرقدہ کی تاریخ وفات کہی تھی جو ان کی بیاض میں درج ہے۔ یہ تاریخ میں لکھ کر بھیجوں گا جو شامل مضمون کر دی جائے۔"

جناب سید نفیس صاحب کے شکریہ کے ساتھ یہ قطعہ درج ذیل ہے:

---

[1] حضرت مولانا شاہ عبدالکریم بن سید کرم شاہ رحمہما اللہ، موضع "الھر" نزد پسرور ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، پاک و ہند کے مشہور بزرگ خواجہ صدر الدین ابوالفتح سید محمد حسینی گیسودراز گل برگوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ شاہ حفیظ اللہ محمد شاہی دور میں ۱۱۳۴ھ میں دکن سے پنجاب تشریف لائے اور "الھڑ" میں فروکش ہوئے۔

حضرت شاہ عبدالکریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ صلاح وتقویٰ میں سلف صالحین کا کامل نمونہ تھے، طریقت میں پنجاب کے مشہور درویش بزرگ صوفی پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے شرف خلافت واجازت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ سے محبت والفت کا رشتہ تھا۔ آپ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کے برادر خورد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب نے آپ کی لاجواب تاریخ وفات لکھی:

"عاش حمیدًا وسعیدًا ومات شہیدًا"

۱۳۵۲ھ

برزباں این است ازقلب حزیں | آہ رفت آں حافظ شرع متیں
غلغلہ افتاد درقدسیاں | ''نوراحمد منتقل شد از زمیں''

۱۳ ھ ۴۸

احقر راقم الحروف نے بھی آج (۲۳-۱-۱۵۱ کو) بہ وقت تکمیل مضمون چارتاریخی مادے نکالے ہیں، جوذیل میں درج کرتا ہوں:

عاشق ذوالمنن	نوراحمد مخفی شدہ	حاجی مغفور	مغفورایزد
۱۳۴۸ھ	۱۳۴۸ھ	۱۳۴۸ھ	۱۳۴۸ھ

ختم کلمہ طیبہ:

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے وفات سے کچھ عرصہ قبل سوالاکھ مرتبہ کلمہ طیبہ کا ورد خودہی کرلیا تھا فرماتے تھے کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ بخش دیتے ہیں۔

آپ کے انتقال پرملال کے دوسرے ہی دن بغرض ایصال ثواب مسجد حاجی شیخ بڈھا مرحوم میں سوالاکھ کلمہ طیبہ اور سوالاکھ آیت کریمہ کا ختم کیا گیا۔ علاوہ ازیں آپ کے معتقدوں نے بے شمار قرآن کریم پڑھ کرآپ کی روح کوثواب پہنچایا۔

مزید معلومات

مضمون کوختم کرچکا تھا کہ معلوم ہوا کہ حضرت الحاج مفتی نوراحمد نوراللہ مرقدہ کبھی کبھی حضرت لاثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس علی پوربھی جایا کرتے تھے حضرت لاثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ سید چراغ شاہ صاحب نے اپنے مرشد کی سوانح حیات بنام ''تنویرلاثانی'' شائع کی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

"مولانا مولوی نور احمد صاحب امرت سری جو شیخ بڈھا مرحوم کی مسجد میں خطیب تھے، بڑے فاضل بے بدل اور تقویٰ شعار تھے بہت مدت بیت اللہ شریف اور مدینہ منورہ میں رہے، اور وہاں دینی تعلیم دینے پر فائز المرام تھے۔ آپ حضور قبلہ عالم کے مخلص تھے۔ مکتوبات شریف امام ربانی مجدد الف ثانی کی تصحیح کر کے شائع کیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی سعی قبول فرمائے آپ بڑی خدمت اسلام اور اہل اسلام بالخصوص صوفی مشرب حضرات کی بجالائے۔ جب آپ حضور (لاثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں آتے تو ان سے مسائل دین دریافت کرتے، تاکہ حاضرین مجلس دینی مسائل سے آگاہ ہوں۔"[1] (بتغیر قلیل)

حکیم خدا بخش صاحب لاہوری جو حضرت لاثانی علیہ الرحمۃ کے مخلص ترین مرید ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ حضرت لاثانی صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں بہت گہرے مراسم تھے۔ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اور آپ اپنے مریدوں کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کرو۔

حکیم صاحب موصوف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ لاہور کے چند احباب کے ساتھ میں امرت سر مسجد شیخ بڈھا میں گیا، اور پروگرام کے مطابق علی پور سے حضرت

---

[1] تنویر لاثانی، صفحہ ۴۴

صاحب تشریف لائے۔ پھر ہم سب مولانا کی رفاقت میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس پر سرہند شریف گئے، اور اکٹھے ہی واپس آئے۔ حضرت مولانا کے وصال کے بعد حضرت پیرلا ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ امرت سر کبھی تشریف نہیں لائے۔ لوگوں کے استفسار پر بتایا کہ "میں تو صرف مولانا نوراحمد رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات کے لیے امرت سر جاتا تھا۔"

ایک تصحیح:

"تطبیب الاخوان بذکر علمائے زمان" ملقب بہ "تذکرہ علمائے حال" [۲] مصنفہ مولوی محمد احسن وحشی نگرامی میں مولانا نوراحمد نوراللہ مرقدہ کے متعلق لکھا ہے:

"آپ پسرور ضلع سیال کوٹ ملک پنجاب کے رہنے والے اور بہت ہی متواضع اور منکسر المزاج ہیں، حضرت مولانا حاجی امداداللہ صاحب سے بیعت ہیں، طریقہ تعلیم آپ کا بہت اچھا ہے۔ بالفعل مدرسہ اسلامیہ سلون ضلع رائے بریلی میں اول مدرس ہیں، سلمہ اللہ تعالیٰ۔" (صفحہ ۹۵)

اس کے حاشیے پر لکھا ہے:

"مستعفی ہوکر اپنے وطن کو چلے گئے۔"

کتاب "تطبیب الاخوان" ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں تصنیف ہوئی اور ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تصنیف کتاب کے

---

[۲] یہ دونوں کتابیں صاحب مضمون کو تکمیل مضمون کے بعد حاصل ہوئیں، اس لیے ان کے یہ اقتباس آخری قسط میں شامل کرنے پڑے، پہلے سے سامنے ہوتیں تو مضمون کی ترتیب مختلف ہوتی۔ (ادارہ "فیض الاسلام" راول پنڈی)

وقت مولانا ''سلون'' میں تھے اور طبع کتاب کے وقت مستعفی ہو کر امرت سر تشریف لا چکے تھے۔ اس مستند حوالے کی روشنی میں یہ بات واضح ہوئی کہ مولانا ''ویلور'' (مدراس) سے نہیں، بل کہ ''سلون'' (رائے بریلی) سے امرت سر تشریف لائے تھے۔ اور مدرسہ باقیات الصالحات ''ویلور میں ''سلون'' آنے سے پہلے متعین تھے۔ لہٰذا اقرین قیاس ہے کہ حاجی شیخ بڈھا مرحوم کے کارندے مولانا کو ''سلون'' میں ملے ہوں گے، اور یہیں آپ کو امرت سر آنے کی دعوت پہنچی ہوگی۔ اس کتاب کے مطالعے سے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۹۷ء میں امرت سر تشریف لائے تھے۔ اس لیے ''ویلور'' سے امرت سر آنے کی روایت تصحیح طلب ہے۔

شاہ ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ:

حضرت شاہ محی الدین عبداللہ ابوالخیر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری دیکھنے کا موقع ملا، اس میں لکھا ہے کہ

> ''حضرت موصوف کی صاحب زادی صاحبہ کی شادی کی تقریب پر اکثر علماء، صلحا اور معزز خدام شریک مجلس ہوئے جن میں خاص طور پر جناب حضرت مولوی محمد عمر صاحب اخوند جی مرحوم جناب مولوی مشتاق احمد صاحب انبیٹھوی، جناب مولوی نور احمد صاحب امرت سری، جناب حضرت مولوی محمد شاہ صاحب قصوری، جناب مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب اور جناب ڈاکٹر اشفاق محمد صاحب قابل ذکر ہیں۔''

اس کے بعد لکھا ہے:

''اس موقع پر حضور نے دائرہ (ایک قسم کا باجا) پر بغیر ساز کے قوالی سنی تھی، جب قوالی ہو رہی تھی تو جناب حضرت مولوی سید محمد شاہ صاحب قصوری نے اپنے ایک دوست سے فرمایا کہ آج حضرت پر نسبت چشتیہ کا غلبہ ہے اور جناب مولوی نور احمد صاحب امرت سری (جنہوں نے مکتوبات شریف حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مقامات کے سمجھنے میں حضور انور سے مدد بھی لی ہے) نے دل میں کچھ برا مانا اور اس فعل کو شاید خلاف شریعت اور خلاف مصلحت سمجھا۔ لہٰذا خاموش علیحدہ بیٹھے رہے اور منہ سے کچھ نہ کہا، جب حضور پر ان کی یہ حالت منکشف ہوئی تو مولوی صاحب موصوف (نور احمد) کو پاس بلایا، اور آپ کے دل پر کچھ ایسی توجہ فرمائی کہ فوراً ہی مولوی صاحب موصوف سماع میں مشغول ہو گئے اور آپ پر اسی وقت رقت کی خاص کیفیت طاری ہو گئی، اس وقت حضرت نے فرمایا: کہ ''اس وقت اللہ کا فضل و کرم اور مہربانی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر کافر صد سال باشد، مسلماں گردد، مگر ہر سخن وقتے اور ہر موقع مکانے دراد۔'' (ص ۱۸۷)

ایک بزرگ کا خط:

خانقاہ مجددیہ نقشبندیہ ٹنڈو سائیڈ وڈاک خانہ ٹنڈو محمد خان کے سجادہ نشین حضرت مولانا پیر شاہ آغا صاحب مدظلہ، نقشبندی مجددی جو معمر بزرگ ہیں، ان کو راقم الحروف

نے مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی لکھنے کے ارادے کی اطلاع دی تو آپ
نے جواب سے سرفراز فرماتے ہوئے مرحوم و مغفور مولانا کے متعلق تحریر فرمایا کہ

''مولانا مولوی نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ بہت مبارک ہے۔ فی الحقیقت مولانا مرحوم کا وجود مسعود اس زمانہ میں صحیح طور پر نمونہ سلف صالحین تھا۔ ان کے اخلاق واطوار، افعال واقوال، شکل وصورت وسیرت مطابق سنت نبوی تھے۔ ہمارے تعلقات مولانا سے بہت مخلصانہ ومحبانہ تھے۔ ہم لوگوں کو تو امرت سر میں جب جانا ہوتا تھا تو مولانا مرحوم کے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ ان کی عنایات اور نیک اخلاق قابل فراموش نہیں، ہم دعا کرتے ہیں اللہ سبحانہ تعالیٰ آپ کو اس نیک ارادہ میں کامیاب فرمائے۔''

راقم الحروف نے کئی سال کی محنت، تلاش اور جستجو کے بعد یہ مضمون ترتیب دیا ہے اور ثقہ روایات وذاتی معلومات کو بلا کم وکاست پیش کردیا ہے، تاکہ حضرت ممدوح کی مثالی اور پاکیزہ زندگی کا صحیح صحیح نقشہ قارئین کرام کے سامنے آجائے۔ اس مضمون میں جو خوبیاں ہیں، وہ بزرگوں کی دعاؤں اور صاحب تذکرہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی توجہ کا اثر ہے۔ اور جہاں جہاں زبان وبیان کی غلطی ہوئی ہو یا مفہوم ادا نہ ہوسکا ہو، تو اسے احقر کی کم علمی پر محمول کیا جائے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بزرگ کے حالات زندگی لکھنے اور پڑھنے والوں کو عمل کی توفیق عطا فرمائے، نیز تمام بزرگوں کی محبت ومتابعت نصیب کرے اور انہی کے ساتھ محشور فرمائے آمین!

اُحِبُّ الصَّالِحِینَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰہَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا۔[1]

[1] یہ عاجزانہ شعر حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: میں نیک لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور خود ان میں سے نہیں ہوں۔ شاید (ان کی محبت کے طفیل) اللہ تعالیٰ مجھے بھی کچھ نہ کچھ نیکی کی توفیق بخش دے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. ''فیض''

شکریہ:

جناب محترم عبدالمجید صاحب ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر مقیم حال کوئٹہ، محترم الحاج حکیم محمد علی صاحب امرت سری مقیم حال گوجرانوالہ اور جناب شیخ عبدالرحیم صاحب رئیس امرت سر (نبیرہ حاجی شیخ بڈھا مرحوم بانی مسجد شیخ بڈھا امرت سر) حال مقیم جڑانوالہ کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ ان حضرات سے حضرت مولانا مرحوم کے نہایت قیمتی حالات میسر آئے۔ مولانا محمد سلیمان صاحب فرزند صاحب تذکرہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، اگرچہ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ دیا ہے، وہ میں نے زبردستی وصول کیا ہے۔

(ماہ نامہ فیض القرآن ،راول پنڈی مارچ، اپریل ،مئی ،جون ،ستمبر ،اکتوبر ،نومبر ۱۹۶۳ء،جنوری ۱۹۶۴ء)

مولانا ابوالبیان محمد داؤد فاروقی امرتسری

سیرت غوث اعظم (قدس سرہ) کے مؤلف مولانا ابوالبیان محمد داؤد فاروقی مرحوم حضرت علامہ مولانا نور احمد پسروری ثم امرت سر (رحمتہ اللہ علیہ) مصحح و محشی مکتوبات امام سوم تھے۔ انہوں نے ایف اے تک جدید تعلیم حاصل کی تھی اور دینی تعلیم اپنے والد ماجد کے علاوہ حضرت علامہ محمد عالم آسی امرت سری (خلیفہ حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی) اور مفتی عبدالرحمٰن ہزاروی سے پائی۔ جناب ابوالبیان شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ علم عروض کی تحصیل بھی حضرت مولانا آسی سے کی۔

مولانا محمد داؤد فاروقی ایک بلند پایہ خطیب تھے اور اوائل عمر ہی میں تالیف و تصنیف کا شغل اختیار کر لیا تھا، عین دوران شباب میں ان کی سحر بیانی کا ڈنکا بجنے لگا تھا، شدھی کی تحریک کے دنوں میں انہوں نے خطابت کے خوب خوب جوہر دکھائے اور اس کی پاداش میں مہمانِ جیل بھی رہے۔ حضرت مولانا نور احمد کے انتقال پر ملال کے بعد اپنی خداداد صلاحیت و اہلیت کی بناء پر ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ چنانچہ تاحیات مسجد شیخ بڈھا اور عیدگاہ کی خطابت کے علاوہ انجمن اسلامیہ امرت سر کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظم رہے۔[1]

خاندانی تعلقات اور ہمسائیگی کے علاوہ راقم الحروف نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک مولانا محمد داؤد کو بہت قریب سے دیکھا، ان ایام میں وہ فقیر منش، درویش

---

[1] مولانا محمد داؤد سے قبل حضرت مولانا نور احمد یہ خدمت سرانجام دیا کرتے تھے۔

دوست اور حضور پر نور نبی کریم ﷺ کے عاشق صادق تھے۔ انہوں نے بچپن میں حضرت شاہ ابوالخیر مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی۔ زندگی کے آخری سالوں میں حضرت میاں علی خان چشتی نظامی سجادہ نشین بسی شریف رحمۃ اللہ علیہ (مدفون پاکپتن شریف) سے اکتساب فیض کیا۔ مولانا داؤد پر جب فقر و درویشی کا غلبہ ہوا تو انہوں نے اپنی مصروفیات کو بہت محدود کر لیا تھا۔ صرف حسب ذیل معمولات کو بطریق احسن نبھاتے رہے:

خطبۂ جمعہ، خطبات عیدین، انجمن اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی محفل میلاد کا انعقاد و انصرام اور اس میں میلاد النبی ﷺ کے موضوع پر تقریر دل پذیر، معراج النبی ﷺ، شب براءت، لیلۃ القدر کی تین راتوں میں مسجد شیخ بڈھا میں محافل ذکر منعقد کراتے اور آخر میں صلوۃ و سلام مع القیام ہوتا، اور ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ محفل نعت منعقد کراتے، حضرت داتا گنج بخش اور حضرت مجدد الف ثانی (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے عرسوں میں باقاعدگی سے حاضری دیتے اور تقریر بھی کرتے، کبھی کبھی حضرت علی احمد صابر کلیری قدس سرہ کے عرس میں بھی شرکت کرتے، امرت سر میں عید میلاد النبی ﷺ اور بڑی گیارھویں شریف کے جلوس نکلتے تھے، ان جلوسوں کی قیادت مولانا پیر عبدالسلام ہمدانی، مولانا غلام محمد ترنم اور ابوالبیان محمد داؤد فاروقی (رحمہم اللہ) کرتے تھے۔ مولانا ابوالبیان کثیر التصانیف عالم تھے۔ چند ایک کے نام یہ ہیں، سیرت غوث اعظم، سیرت امام ربانی، خون کربلا، چاہ بابل، آسمانی کڑک (رد مرزائیت) مرزائیوں سے بائیکاٹ، سوانح صابر کلیری وغیرہ۔ آخر عمر میں جواز میلاد شریف پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی اور مجموعۂ مواعظ بھی ترتیب دیا تھا۔ یہ نوادر ان کی وفات کے

فوراً بعد کسی نے چرا لیے۔

مولانا ابوالبیان کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں، ان کے بڑے بھائی مولانا محمد سلیمان فاروقی نے صرف اس قدر بتایا تھا کہ بہ وقت وفات ان کی عمر ۳۴ یا ۳۵ سال تھی۔ مولانا ابوالبیان کی وفات پر اخبار الفقیہ امرت سر نے مندرجہ ذیل نوٹ شائع کیا:

"مولانا محمد داؤد صاحب ابن حضرت مولانا حاجی مولوی نور احمد صاحب پسروری حنفی امرت سری خطیب جامع مسجد شیخ بڈھا مرحوم وخطیب عیدگاہ، امرت سر چند یوم بیمار رہ کر عین عالم شباب میں مؤرخہ یکم جون ۱۹۴۲ء کو انتقال کر گئے (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ......) مرحوم نہایت خوش بیان واعظ تھے، امرت سر کی بے شمار خلقت نماز جنازہ میں شریک ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ہمیں ان کے خاندان سے اور ان کے بڑے بھائی مولوی محمد سلیمان صاحب بی اے سی دلی ہمدردی ہے۔" (ایڈیٹر)[1]

مولانا ابوالبیان کی وفات حسرت آیات پر ہر شخص کو شدید صدمہ ہوا۔ جب جنازہ اٹھا تو پیر و جوان دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ انجمن پارک کے وسیع گراؤنڈ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور مسجد نور سے متصل والد گرامی قدر (حضرت مولانا نور احمد) کے پہلو میں محو خواب ابدی ہوئے۔

---

[1] اخبار الفقیہ امرت سر، ۷ جون ۱۹۴۲ء

قطعہ تاریخ وفات از حضرت علامہ مولانا محمد عالم آسی امرت سری علیہ الرحمۃ

سنی مرگ داؤد کی جو خبر　　　ہوئے فکر تاریخ میں ہوش گم
سن وصل پر یوں پکارا سروش　　　کہو "مولوی داخل خلد" تم

۱۳۶۱ھ

مولانا ابوالبیان کی تمام تصانیف سے عمدہ سیرت سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہے جو ایک عرصہ دراز سے نایاب تھی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، مولانا صاحبزادہ محمد سعد سراجی الملقب بہ "مرشد بابا" کو کہ انہوں نے خانقاہ موسیٰ زئی شریف سے اسے دوبارہ طبع کرادیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

(ماہ نامہ نورالحبیب بصیر پور ۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ/اپریل ۱۹۸۰ء)

حضرت مولانا غلام محمد ترنم امرتسری

حضرت مولانا ترنم علیہ الرحمۃ کی ذات گرامی اور ان کے کمالات علمی وخدمات دینی بلاشبہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ لاکھوں ایسے افراد آج بھی موجود ہیں جنہوں نے ان کی شعلہ نوائیاں اور بارگاہ رسالت مآب (ﷺ) میں ترنم ریزیاں سماعت کر کے اپنے قلوب کو منور کیا ہے اور ہزاروں ایسے خوش قسمت موجود ہیں جنہوں نے ان کے مواعظ حسنہ سے مستفیض ہو کر گناہوں سے سچی توبہ کی اور صحیح معنوں میں مسلمان بن گئے۔ کتنے ہی ایسے سعادت مند موجود ہیں جو ان کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں وہ اہل علم ابھی بقید حیات ہیں جو مولانا کے شریک کار رہے اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو ہمہ وقت ان کی صحبت میں رہے۔

لیکن یہ سب کچھ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا محترمی جناب نذیر احمد اختر صاحب آنریری جنرل سیکرٹری ''انجمن تبلیغ الاحناف'' نے اس بے مثل اور مخلص مبلغ اسلام کے حالات زندگی مدون کیے جانے کا شدید احساس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں حضرت مولانا ترنم کے سوانح لکھوں، جو ان کے بارھویں عرس کے موقع پر شائع کیے جائیں گے۔

مولانا ترنم نور اللہ مرقدہ، میرے ہم وطن (سابق وحال)، ہم پیشہ اور

مسلک ہونے کے علاوہ میرے ایک محترم بزرگ کے رفیق خاص تھے، اس لیے ان پر کچھ لکھنا میرا حق تھا۔لہٰذا میں ان کے متعلق جو کچھ بوثوق جانتا ہوں اور جس قدر مواد میرے سامنے ہے اور جو کچھ ثقہ حضرات سے معلوم ہوا، اسے ترتیب دے کر حضرت اختر صاحب کے سپرد کر دیا ہے مگر

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا مرحوم ومغفور کے وہ احباب وتلامذہ، عقیدت منداس طرف متوجہ ہوں جو مولانا کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

اس مقالے میں مندرج بعض اہم واقعات محترمی ومکرمی جناب ابو الطاہر فدا حسین فدا مدیر اعلیٰ "مہر وماہ" لاہور، مولانا کے برادر بزرگ جناب گل محمد صاحب اور مولانا کے فاضل شاگرد آغا طالب یزدانی صاحب کے توسل سے حاصل ہوئے۔ میں ان حضرات کا ممنوں ہوں۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

محمد موسیٰ عفی عنہ

۲۷ ربیع الاخر ۱۳۹۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ،ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مولانا غلام محمد ترنم امرتسری

عمرہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات

تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرت مولانا حکیم غلام محمد ترنم امرت سری رحمۃ اللہ علیہ آقائے نامدار حضور نبی کریم شفیع المذنبین ﷺ کے سچے غلام تھے۔انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے آقا و مولیٰ کی صفت وثنا اور تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر رکھا تھا، وہ اسلام کی سربلندی اور دستور اسلامی کے نفاذ کے لیے کوشاں رہے۔معاشرے کی خرابی اور مسلمانوں کی زبانوں حالی پر ان کا دل داغ داغ تھا۔وہ اعلیٰ اخلاق وعادات کے حامل اور خادم ملک وملت ہونے کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ انسان تھے۔وہ مجسمہ غیرت ،نعت گو شاعر، بے باک خطیب اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے،ان جیسے مخلص ،خادمِ اسلام روز روز پیدا نہیں ہوتے۔اس قحط الرجال کے دور میں ان کا وجود مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا۔خلوص وایثار اور علم وعمل کے اس پیکرِ جامع کے مختصر حالات زندگی ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں، جو ان کو اور ان کے نیک کاموں کی یادوں کو زندہ رکھنے کے علاوہ اس دور کے اکثر علماء کے لیے دعوت فکر وعمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ابتدائی حالات:

مولانا ترنم مغفور ومبرور امرت سر کے ایک غریب کشمیری گھرانے میں جناب عبدالعزیز مرحوم کے ہاں ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم مولانا پروفیسر عبدالرحیم[1] مرحوم (المتوفی ۱۹۱۷ء) اور فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی عبدالصمد خاں کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء) سے حاصل کی۔ ازاں بعد قالین بافی اور شال بافی کے فن سیکھے اور اس میں خوب خوب کمال حاصل کیا اور ڈیزائنر ہوگئے۔ چند سال اسی فن کو ذریعہ معاش بنائے رکھا، مگر قدرت نے انہیں کسی اور مقصد کے لیے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ ان کی فطری مناسب اور طبعی رجحان نے علم حاصل کرنے پر مجبور کر دیا۔ مولانا اس نیک اور عظیم مقصد کے لیے جناب علامہ محمد حسین عرشی امرت سری کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اپنے علمی مشاغل کی کثرت کے باعث اظہار معذوری کرتے ہوئے انہیں اپنے استاذ گرامی حکیم شعراء حکیم فیروز الدین فیروز طغرائی (المتوفی ۱۹۳۱ء) کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔

حضرت طغرائی سے اس ذہین وفطین طالب علم نے بہت جلد منشی فاضل کا نصاب پڑھ کر امتحان بھی پاس کر لیا اور فن شاعری میں فاضل طغرائی سے باقاعدہ استفادہ واستفاضہ جاری رکھا۔ جانشین طغرائی علامہ عرشی نے اُن کا تخلص ترنم تجویز کیا، جسے استاد گرامی نے بھی پسند کیا۔ میں نے علامہ عرشی صاحب سے ترنم تخلص تجویز کرنے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ مولانا سے چند روز قبل صوفی غلام مصطفیٰ

---

[1] مولانا عبدالرحیم خالصہ کالج امرت سر میں عربی کے پروفیسر تھے اور مولانا ترنم کے بہنوئی تھے۔

حضرت طغرائی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے تھے اور ان کا تخلص ان کے متبسم چہرے کے پیش نظر "تبسم" رکھا گیا۔ "تبسم کے وزن پر مولانا کے لیے "ترنم" تجویز کیا گیا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے وزن پر مولانا کے لیے "ترنم" تجویز کیا گیا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی روایت ہے کہ ترنم صاحب طغرائی کی خدمت میں پہنچنے سے قبل "اصغر" تخلص کرتے تھے۔

طغرائی مرحوم کے فیض صحبت نے مولانا کی طبیعت میں جلا پیدا کر دی اور ان کے شوقِ حصول علم میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ مولانا عربی وفنون کی تحصیل میں مصروف ہو گئے۔ مختلف اساتذہ سے اکتساب علم کے بعد عربی زبان کے ادیب اریب استاذی حضرت مولانا علامہ محمد عالم آسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) کی خدمت میں حاضر ہوکر عربی ادب کی کتابیں پڑھیں اور پھر مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ دینی علوم کی تحصیل کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس فن شریف کی کتب حکیم حاجی محمد علی مستند طبیہ کالج دہلی مقیم حال گوجرانوالہ، حکیم محبوب عالم مرحوم اور حکیم فتح چند سے پڑھیں۔ لاہور کے نامور طبیب حکیم شہزادہ غلام محمد (المتوفی ۱۹۵۰ء) سے اصول مطب سیکھے اور انگریزی میں بھی خاصی استعداد پیدا کرلی۔ غرض کہ اس ذہین و طباع طالب علم نے حصول علم کے مراحل اس سرعت سے طے کیے کہ حیرت ہوتی ہے۔

مولانا ترنم کا دل سید الانبیاء، آقائے نامدار، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے عشق حقیقی کی لازوال دولت سے مالا مال تھا۔ اس لیے انہوں نے تحصیل علم کے بعد نعتیہ شاعری کی طرف توجہ دی اور ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے عوام میں متعارف ہوئے لیکن یہ شغل عارضی و وقتی ثابت ہوا۔ فطری صلاحیت و طبعی مناسبت نے پھر اصل

منزل کی طرف رہنمائی کی اور وعظ وخطابت کے میدان میں لا کھڑا کیا۔

خطیب ومبلغ:

چند ہی سالوں میں مولانا ترنم علیہ الرحمۃ ایک شعلہ بیان مقرر اور بے مثل مبلغ اسلام بن کر اطراف واکناف پاک وہند میں مقبولیت کا درجہ پا گئے۔ امرت سر کے عوام وخواص ان کے مواعظ حسنہ سننے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ مولانا امرت سر کی مختلف مساجد میں خطبہ جمعہ دیتے رہے۔ شہر کے کسی علاقے کی بھی مسجد میں جا کر خطبہ دینا شروع کرتے، لوگ جوق در جوق وہیں پہنچنے لگتے۔ امرت سر کی کئی تنگ، بوسیدہ، اور قریباً غیر آباد مسجدیں صرف ان ہی کی سحر بیانی کے باعث بڑی بڑی جامع مسجدوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جامع مسجد حنیفہ رانی بازار شریف پورہ اور جامع مسجد کوچہ قاصداں امرت سر کو ان ہی کے اثر وعظ کے نتیجے میں وسعت ورونق ملی۔ غرض کہ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ امرت سر میں سب سے زیادہ ہجوم ان کی مسجد (کوچہ قاصداں) میں ہوتا تھا۔ یہ مسجد تین منزلہ بن چکی تھی، پھر بھی لوگوں کو گلیوں اور گردونواح کے کوٹھوں کی چھتوں پر نماز ادا کرنی پڑتی تھی۔ جمعۃ الوداع کے موقع پر تولا تعداد لوگوں کو مایوس لوٹنا پڑتا تھا۔ اس پر مولانا نے جمعۃ الوداع کا خطبہ عیدگاہ (بیرون رام باغ) میں دینا شروع کر دیا، تو یہاں عید کا سا سماں نظر آنے لگا۔

خصوصیات خطابت:

لب پہ ترنم کے جو ابھرا
روح میں ڈوب گیا وہ ترانہ

(ترنم)

مولانا موصوف کا تخلص اس لحاظ سے حسب حال نہیں تھا کہ دوران تقریر اشعار ترنم سے نہیں پڑھتے تھے۔[1] قرآن مجید کی آیات بھی سادہ طریق پر تلاوت فرماتے۔ ان کی خطابت کی بڑی خوبی ان کا بے پناہ خلوص اور عشق رسالت مآب علیہ تھا۔ دیگر خوبیاں یہ تھیں کہ نہایت روانی کے ساتھ بے تکان گھنٹوں بولتے اور موتی رولتے تھے۔ انہوں نے بقدر استعداد سید وارث شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ہر طبقہ و پیشہ کے لوگوں کی نفسیات، احساسات، عادات و خواہشات اور رسوم و رواج کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ مولانا یہ جانتے تھے کہ غرباء کی کیا کیا ضرورتیں ہیں؟ اور ان میں تربیت کی کمی کے باعث کیا کیا خامیاں ہیں؟ امراء کی اسلام بیزاری اور ان کی چیرہ دستیوں سے خوب آگاہ تھے۔ اس دور کی تعلیم یافتہ خواتین کی اسلام سے دوری اور پرانی وضع کی مستورات کے (شعروں کو بطرز ترنم ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ راستہ بہت ہی دور دراز ہے۔)

توہم پرستانہ خیالات اور مشرکانہ (یا قریب بہ شرک) رسومات سے بھی پورے طور پر باخبر تھے۔ غرض کہ ہر طبقہ اور ہر پیشہ کے لوگوں کے رسم و رواج اور اچھے برے خیالات سے واقفیت رکھنے کی بناء پر معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل پر ایسے سلجھے ہوئے انداز میں تنقید و تبصرہ کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی اور جب طنز کرتے تھے تو اکبر الہٰ آبادی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور صاحب ذوق حضرات بے حد محظوظ ہوتے تھے۔

---

[1] مولانا کے اسی عادت کے پیش نظر حضرت استاذی علامہ آسی رحمۃ اللہ علیہ نے شعر ذیل کہا تھا:

طریق ترنم الاشعار صعب　　طویل فی طویل فی طویل

مشکل سے مشکل دینی مسائل کو عام فہم لفظوں اور مثالوں سے اس طرح حل کر دیتے تھے کہ بڑے بڑے علماء وفضلاء حیران رہ جاتے تھے۔ خطابت پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ ابھی ہزاروں کے مجمع کو رلا رہے ہیں اور یک بیک ہنسانے لگے ہیں۔ ایسے قادرالبیان تھے کہ اگر چاہیں تو دوران تقریر سو بار رلائیں اور سو بار ہنسائیں۔ مگر جب واقعات شہادت سیدنا حضرت امام حسینؓ بیان کرتے تھے تو خود روتے تھے اور سارے کا سارا مجمع اشک بار رہتا اور بہتوں کی چیخیں نکل جاتیں۔ مولانا کا بیان شہادت اہل سنت وجماعت کے عقائد حقہ کے عین مطابق ہوتا تھا۔ اس پر بھی ایک شیعہ ذاکر نے کہا تھا کہ

''ہم ترنم صاحب کے مقابلے میں جھک مارتے ہیں۔''

حضرت ترنم جب مقام مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا پر تقریر کرتے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ مضامین عرش سے اتر رہے ہیں اور بعض اوقات ان پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ آنسو گھنی داڑھی میں سے بہہ کر قمیص کو تر کر دیتے تھے اور سامعین یہ محسوس کرتے تھے کہ مولانا وجد کی حالت میں ہیں۔

وعظ وتبلیغ کے علاوہ مولانا ترنم مرحوم مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ اس لیے ہر شخص کی زبان پر مولانا کا نام جاری رہتا تھا۔ مولانا ترنم علیہ الرحمۃ کی اسی شان مقبولیت کے پیش نظر مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا

ترنم چاند ہے اس شہر میں علم اور حکمت کا
درخشاں اس کے ہالے ہیں مسلماناں امرت سر

ذریعہ معاش:

مولانا کا ذریعہ معاش پہلے تو قالینوں کے ڈیزائن بنانا تھا۔ بعد میں درس و تدریس اور طبابت ہو گیا۔ مسلم ہائی سکول شریف پورہ امرت سر میں اسلامیات کے مدرس تھے اور فارغ اوقات میں مطب کرتے تھے، مگر آپ کے مطب کی حیثیت ہمیشہ فری شفا خانہ جیسی ہی رہی۔ رقم دینے والے کم آتے تھے۔ خطبہ جمعہ بلا معاوضہ دیتے تھے۔

ملکی و مسلکی خدمات:

قومی، ملی اور مسلکی خدمات انجام دینے میں مولانا ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ مسلمان نوجوانوں کو تعلیم کے میدان میں پیچھے دیکھ کر بہت کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ امرت سر میں ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا، جہاں السنہ شرقیہ کے امتحانات (منشی فاضل وغیرہ) کی تیاری کرائی جاتی ہو اور غریب مسلمانوں کے لیے یہی ایک ذریعہ تھا۔ میٹرک پھر بی۔ اے کرنے کا۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے غالباً ۱۹۳۱ء میں ''جامعہ اسلامیہ'' کی بنیاد اس طرح رکھی کہ سکتری باغ (امرت سر) میں درختوں کے سایہ میں طلبہ کو پڑھانا شروع کر دیا۔ پھر کٹڑہ رام گڑھیاں کوچہ[1] مست کھوہ میں میرے ایک بزرگ کے مکان کی بیٹھک میں سلسلہ تدریس جاری رکھا، حتیٰ کہ چند برس ہی میں اس جامعہ نے بڑی ترقی کر لی اور بالآخر اس کو ہال بازار امرت سر میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جامعہ کی بدولت محنت کش غریب مسلمان نوجوانوں کے لیے یونیورسٹی کے امتحانات پاس کرنے آسان ہو گئے اور کثیر التعداد نوجوان یہاں سے فیضیاب ہوئے جن میں

---

[1] مولانا کی سکونت اسی محلہ میں تھی۔

سے اکثر آج مناصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ جامعہ اسلامیہ کا جب کام بہت بڑھ گیا تو دیگر مدرسین کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں، جن میں سے دو تین تو مولانا کے شاگرد ہی تھے اس جامعہ کے پہلے طالب علم جناب محمد سعید شیدا مرحوم (مولانا ترنم کے بھانجے) پرنسپل بنا دیئے گئے تھے لیکن مولانا خود باقاعدگی سے پڑھاتے رہے۔

مولانا کو اپنے مسلک سے جو والہانہ وعشق تھا اس کی مثال بھی کم ملے گی۔ امرت سر کے احناف نے ''انجمن تبلیغ الاحناف'' قائم کر رکھی تھی۔ مولانا اس کے روح و رواں تھے، اس انجمن کے زیر اہتمام سیدنا حضرت امام اعظمؒ کا عرس مبارک ہر سال مسجد میاں جان محمد ہال بازار میں نہایت تزک واحتشام سے منایا جاتا تھا۔ عرس مقدس کے سہ روزہ جلسوں میں مقامی علماء متحدہ ہندوستان کے جلیل القدر علماء وفضلاء اور مشائخ عظام شمولیت فرما کر اپنے مواعظ حسنہ سے عوام کو مستفیض فرماتے تھے۔ اس عرس مبارک کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس میں شرکت فرمانے والے علماء میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

امیر ملت حضرت حافظ الحاج سیدنا جماعت علی شاہ محدث علی پوری، شیخ العرفا حضرت شاہ علی حسین کچھوچھوی، صدر الافاضل حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی، مبلغ یورپ حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، فقیہ اعظم حضرت مولانا محمد شریف کوٹلوی، حضرت مولانا سید محمد دیدار علی شاہ محدث الوری ثم لاہوری، ابوالحامد حضرت مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی، بلبل بستان رسالت حضرت مولانا محمد یار فریدی بہاولپوری، مناظر اسلام مولانا حکیم قطب الدین جھنگوی، حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری خطیب مسجد وزیر خاں لاہور، حضرت مولانا عبدالمجید

قادری والد ماجد مولانا عبدالحفیظ حقانی بریلوی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اس عرس میں ایک دفعہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ، کے صاحب زادے حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں رحمتہ اللہ علیہ نے بھی شمولیت فرما کر مسلمانان امرت سر کو اپنی فاضلانہ تقریر سے مستفید فرمایا تھا۔ شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی اور حضرت مولانا محمد سردار احمد محدث لائل پوری (رحمہما اللہ تعالیٰ) بھی اس عرس میں شرکت فرماتے رہے مگر اس وقت یہ حضرات جوان علماء میں شمار ہوتے تھے۔

ایسا عظیم الشان تبلیغی جلسہ میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ ایک خاص قسم کی روحانی ونورانی محفل ہوتی تھی۔ اس عرس مبارک کے جلسوں میں امرت سر کے مسلمانوں کو دوقومی نظریہ کی صداقت بتا کر تحریک پاکستان کی تائید وحمایت کے لیے تیار کیا گیا۔ ۱۹۴۵۔۴۶ء میں اس عرس شریف کے موقع پر صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مرادآبادی، حضرت امیر ملت علی پوری اور حضرت محدث کچھوچھوی (رحمہم اللہ) نے تحریک پاکستان کے حق میں جو مدلل اور پرمغز تقریریں کی تھیں، ان کے بعض حصے ابھی تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں اور اچھی طرح یاد ہے کہ ان بزرگوں کی تقاریر نے امرت سر کے کانگریسی اور احراری مولویوں کا طلسم توڑ کر رکھ دیا تھا۔

مولانا عبدالحفیظ بریلوی مرحوم بھی ان حضرات کی دعوت پر امرت سر تشریف لا کر قیام پذیر رہے اور انہوں نے بڑی علمی خدمات سرانجام دی۔ اسی انجمن نے دارالعلوم حنفیہ رضویہ کی بنیاد رکھی جس کا فتتاح ۲راپریل ۱۹۴۵ء کو حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی نے کیا۔ اس مدرسے میں مولانا امین الدین بدایونی مرحوم اور مولانا عنایت

اللہ (سانگلہ ہل) تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد یہ انجمن لاہور میں قائم کردی گئی، جس کے زیر اہتمام قلعہ گوجر سنگھ میں ایک مدرسہ تعلیم القرآن جاری ہے اور ہر سال مسجد مائی لاڈو میں عرس امام اعظم منعقد ہوتا ہے مگر امرت سر والی شان کہاں؟ عرس امام اعظم اور انجمن تبلیغ الاحناف پر ان شاء اللہ ایک علیحدہ مقالہ لکھا جائے گا جس میں وہ تمام واقعات آجائیں گے جو یہاں بخوف طوالت لکھے نہیں گئے۔

خان محمد شاہ رئیس اعظم امرت سر (المتوفی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۶ء) نے ایک عظیم الشان سرائے تیار کرائی تھی، جس کی مثال پورے متحدہ پنجاب میں نہیں تھی۔ مگر افسوس کہ ان کے اخلاف نے اس امانت کو بڑی آسانی سے فروخت کردیا۔ لہٰذا مسلمان مسافروں کو سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مولانا نے ۱۹۴۵ء میں اپنی تقریروں میں سرائے اور ایک عظیم فری یونانی شفاخانہ کی ضرورت کی طرف عوام کو متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا اور شہر کے سب مسلمان اس کام کے لیے تیار ہو چکے تھے کہ ملک تقسیم ہوگیا۔

مولانا ترنم مغفور و مبرور نے مختلف سیاسی تحریکوں میں بھی حصہ لیا، خصوصاً تحریک پاکستان میں مثالی کردار ادا کیا۔ اپنی شعلہ بار تقریروں کے ذریعے مسلمانوں کے خفتہ جذبات کو بیدار کر کے تحریک پاکستان کا ہم نوا بنایا۔ ۱۹۳۹ء میں طبی کانفرنس سے منسلک ہوئے اور آخر دم تک اس میں شامل رہ کر ترقی طب کے لیے کوشاں رہے، ایک مدت تک پاکستان طبی کانفرنس کے شعبہ نشر و اشاعت کے سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیئے۔

لاہور میں آمد:

تقسیم ملک کے بعد مولانا ترنم لاہور کے سکونت پذیر ہوگئے اور یہاں ان

کے تبلیغی مشاغل میں اور بھی اضافہ ہو گیا، جنہیں بڑی ہمت اور کمال استقلال سے نباہتے رہے۔ طبابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ جامعہ اسلامیہ کو بھی ریلوے روڈ پر جاری کیا جو رفقائے کار کے بچھڑ جانے کے باعث ترقی نہ کر سکا اور بالآخر ختم ہو گیا۔ لاہور پہنچنے کے ساتھ ہی مولانا نے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں گاہے گاہے وعظ و درس دینا شروع کر دیا۔ پھر مسجد حنفیہ موری دروازہ میں خطابت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔

خطیب جامع سول سیکرٹریٹ:

حضرت مولانا نے بعض عقیدت مندوں کی خواہش پر مسجد سول سیکرٹریٹ میں خطابت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ مسجد بہت چھوٹی سی تھی۔ جائے تنگ و مردماں بسیار کا منظر پیش کرنے لگی۔ نمازیوں کو دھوپ میں بیٹھنا پڑتا۔ مولانا لوگوں کی اس تکلیف سے پریشان رہتے لیکن کچھ عرصہ بعد یہ پریشانی رفع ہونے کے اسباب پیدا ہو گئے۔ اس مسجد کی تعمیر جدید اور توسیع کے بارے میں مولانا کے ایک مخلص (م،ص خورشید) کا بیان ملاحظہ ہو:

> "سیکرٹریٹ کی مسجد ان دنوں بہت چھوٹی تھی۔ آپ کا وعظ سننے کے لیے لوگ دور دراز سے آتے تھے۔ چنانچہ سینکڑوں لوگوں کو باہر دھوپ میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ اس وقت کے گورنر سردار عبدالرب نشتر جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لائے۔ اتفاق سے انہیں جہاں جگہ ملی، وہاں دھوپ کی تمازت تیز تر تھی، مولانا نے موقع غنیمت جانا اور گورنر کی رگ حمیت چھیڑ دی۔ گورنر نے دفتر جا کر

مسجد کی توسیع کے لیے بیس ہزار روپے کی منظوری دے دی۔''

''مولانا کی کوشش سے الحاج محمد دین پروپرائٹر نیشنل فین فیکٹریز اور حاجی کریم بخش اینڈ سنز نے بھی مسجد کی تعمیر کے لیے عطیات دیئے۔ ایک جمعہ کے روز سیکرٹریٹ کے قریب ایک صاحب ثروت کی کار خراب ہوگئی اور وہ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں آ گئے۔ مولانا وعظ فرمارہے تھے، ان پر وعظ کا اس قدر اثر ہوا کہ دوسرے دن اس نوجوان چودھری منظور احمد ساہی نے مولانا کے ذاتی نام پر دس ہزار روپے کا چیک کاٹ دیا۔ مولانا اس وقت نہایت پریشانی اور مفلسی میں دن گزار رہے تھے اگر چاہتے تو یہ رقم اپنے مصرف میں لے آتے، مگر آپ نے ایسا ہرگز نہیں کیا، بلکہ وہ چیک مسجد کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ چودھری صاحب نے مولانا کے اصرار پر مبلغ پانچ ہزار روپے اور دیے۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر مسجد نبوی کی طرز پر شروع کی گئی۔ مسجد کا سنگ بنیاد مولانا سے رکھوایا مگر مقام تاسف ہے کہ جامع مسجد سول سیکرٹریٹ کی تاریخ بنیاد جو تحریر کی گئی ہے، وہاں مولانا کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ مسجد کمیٹی اور عوام کی بے حسی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے۔''[1]

اس مسجد میں مولانا جس جرات و بے باکی سے ملکی وملی مسائل اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے تھے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ بڑے بڑے افسروں اور وزیروں تک

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۴ جولائی ۱۹۶۸ء

کی موجودگی میں کلمہ حق کہتے تھے۔ مداہنت سے بالکل نا آشنا تھے، بسا اوقات ان کی تنقید اس قدر شدت اختیار کر جاتی تھی کہ وزراء سخت گھبرا جاتے تھے۔ جو مرد قلندر ایوان حکومت میں زلزلہ خیز تقریر سے باز نہیں رہتا تھا، وہ عوامی جلسوں میں کیا کچھ نہ کہتا ہوگا۔ چنانچہ مولانا کی زبان بند کرنے کے لیے الاٹمنٹوں کی بار بار پیشکش کی گئی مگر انہوں نے آبروئے فقر وقناعت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آہ! جب سے اس مسجد سے اس ضیغم حق کے صدائے حق بلند ہونا بند ہوئی ہے، اس کے درودیوار اور محراب ومنبر اداس، فضا خاموش اور مینار سوالیہ نشان بنے کھڑے ہیں۔

مولانا سول سیکرٹریٹ کی مسجد کے علاوہ ہر بدھ کو مسجد محکمہ انہار پرانی انارکلی میں بھی وعظ فرماتے تھے۔ عشرہ محرم میں مسجد مائی لاڈو چیمبرلین روڈ میں شہادت کے موضوع پر تقاریر کرتے تھے۔ عیدین کا خطبہ باغ رانجھا دل محمد روڈ میں دیتے تھے۔

حق گوئی و بے باکی:

مولانا ترنم جن دنوں سول سیکرٹریٹ کی مسجد میں خطیب مقرر ہوئے۔ سیکرٹریٹ میں داخل ہوتے ہی باغیچے میں صلیب پر نظر پڑتی تھی جو سنگ مرمر کی تھی اور بڑے چبوترے پر نصب تھی، مولانا نے خطبہ جمعہ میں اس کے ہٹائے جانے کا مطالبہ کیا اور قرارداد منظور کرا کے چیف سیکرٹری اور گورنر کے پاس بھجوائی مگر صدائے برنہ خاست۔ اس پر مولانا نے خطبہ جمعہ میں اعلان کیا کہ حکومت اس صلیب کو یہاں سے نہیں ہٹواتی لہٰذا آئندہ جمعہ کو میں گینتی لے کر آؤں گا اور کچھ نمازی گینتیں اور کدالیں لے کر آئیں۔ بعد از نماز جمعہ اس کو توڑ دیا جائے گا۔ مولانا کے اس بے باکانہ اعلان کا یہ نتیجہ ہوا کہ اگلے جمعہ سے پہلے ہی فرنگی کی یہ یادگار اپنی جگہ سے ہٹا دی گئی۔

دولتانہ وزارت کے زمانے میں گول باغ میں عید میلاد النبی (ﷺ) کے چند اجلاس منعقد ہوئے تھے۔ صدر اجلاس گورنر ہوتا تھا۔ ارد گرد وزراء براجمان نظر آتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ترنم کو بھی تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا۔ مولانا نے دوران تقریر اعیان مملکت پر تنقید شروع کر دی اور اتفاق کہ سامنے سے ایک ٹرک گزرا۔ مولانا نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ دیکھو ''چھکڑا'' جا رہا ہے۔ لوگوں نے حیران ہو کر دیکھا تو مولانا نے کہا کہ اس کے ڈرائیور کو میری جگہ لا کر گھڑا کر دو اور مجھے چھکڑے میں بٹھا دو۔ پھر تقریر ہو گی نہ چھکڑا چلے گا۔ اسی طرح میں دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان میں ایسے لوگوں کو ذمہ داریاں سونپ دی گئی ہیں جو قطعاً اس کے اہل نہیں۔ مولانا یہ کہہ رہے تھے اور صدر جلسہ اور وزراء کا حال دیدنی تھا۔ اس پر اسٹیج سیکرٹری کی طرف سے مولانا کو رقعہ ملا کر آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے مگر مولانا نے تقریر جاری رکھی۔

پنجاب کے ایک وزیر نے کسی مسلکی مسئلے پر تبادلہ خیال کے لیے لاہور کے مختلف مکاتب فکر کے علماء کو دعوت دی۔ سب علماء وقت پر پہنچ چکے تھے۔ مولانا ترنم اتفاقاً پانچ منٹ دیر سے پہنچے اور دیکھا کہ وزیر صاحب صوفے پر نیم دراز ہیں اور اسی ہیئت میں علماء سے محو گفتگو ہیں۔ مولانا یہ منظر دیکھ کر طیش میں آ گئے اور علماء کو مخاطب کر کے کہا:

> ''اے علماء کرام! آپ وزیر صاحب کو ''یٰسین'' سنانے آئے ہیں؟ آپ بیٹھے ہیں اور یہ صوفے پر دراز ہیں۔ یہ علماء اور علم کی توہین ہے۔ اٹھو ہم ان سے کوئی بات نہیں کریں گے۔''

چنانچہ مولانا سب کو لے کر باہر آ گئے۔ وزیر صاحب نے باہر آ کر بڑی

منت سماجت کی مگر مولانا نے جوشِ غیرت میں ان کی ایک نہ سنی۔

نائب صدر جمعیت العلماء پاکستان:

مولانا ترنم مرحوم و مغفور ایک عرصہ تک جمعیت العلماء پاکستان پنجاب کے صدر رہے پھر مرکزی جمعیت کے نائب صدر ہو گئے اور اس سلسلے میں ان کی خدمات نہایت وقیع اور قابل قدر ہیں۔ صدر جمعیت حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء) ان کی سیاسی بصیرت کے بے حد معترف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ترنم مرحوم جمعیۃ کا دماغ تھے۔ جمعیۃ کی طرف سے پاکستان کے اسلامی دستور پر ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جو مولانا کی ذہانت اور بالغ نظری کا ایک بہترین نمونہ ہے، اس کتابچے کو قانونی اور علمی حلقوں میں بہت زیادہ پسند کیا گیا۔

جہاد کشمیر:

مولانا ابوالحسنات علیہ الرحمۃ جب مجاہدین کشمیر کی امداد و اعانت کے لیے کمر بستہ ہوئے تو مولانا ترنم نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ یہ دونوں بزرگ فراہمی و ترسیل سامان کے علاوہ خود بہ نفس نفیس کشمیر کے مختلف محاذوں پر جا کر جذبہ جہاد پیدا کرنے والی تقاریر کرتے رہے اور خطرناک مورچوں تک پہنچ کر مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرنے کے علاوہ ان کی ضروریات کا جائزہ لیتے رہے۔

خان لیاقت علی خاں (سابق وزیر اعظم پاکستان) نے جب بد فطرت بھارتی حکومت کو مکہ دکھایا تو حکومت کی درخواست پر مولانا ترنم مرحوم نے سرحدی دیہات میں نہایت پر جوش تقریریں کر کے عوام کے دل و دماغ کو جذبۂ جہاد سے سرشار کیا۔

مولانا ابوالحسنات اور مولانا ترنم نے جمعیۃ العلماء پاکستان کے مناصب جلیلہ پر فائز رہ کر گوناگوں مصائب برداشت کر کے اپنی صحت کو برباد کیا اور ہر قسم کی آلودگیوں سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو اجر عظیم سے نوازے۔ آمین!

مگر صد افسوس کہ مولانا ترنم مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش اور مولانا ابوالحسنات قادری کی رحلت کے بعد جمعیۃ کی قیادت ایسے ہاتھوں میں چلی گئی جنہوں نے ہر موقع پر سواد اعظم کا سودا کیا، خود بکاؤ مال مشہور ہو گئے اور سواد اعظم کے دینی اور ملی مسائل کو سخت نقصان پہنچایا۔ دس بارہ سال سنیوں نے ان کے ہاتھ ذلت اٹھانے کے بعد گذشتہ سال شیخ الاسلام حضرت علامہ خواجہ محمد قمر الدین مدظلہ العالی زیب سجادہ سیال شریف کو جمعیۃ کا صدر منتخب کیا۔ جس سے جمعیۃ کے تن مردہ میں جان پڑ گئی ہے اور کچھ کام بھی ہوا ہے مگر خوف کی بات یہ ہے کہ ابھی تک چند ضمیر فروش اور مفاد پرست جمعیۃ کی مجلس شوریٰ میں داخل ہیں۔ محترم صدر جمعیۃ اور دیگر اکابر کو چاہیے کہ ان کو نکال باہر کریں، وگرنہ انجام بخیر نہیں۔

فراست ایمان اور دستور اسلامی:

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

مولانا بھی اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں منعقد ہونے والی جمعیۃ کی کانفرنس کے ایک اجلاس میں اپنا مقالہ بعنوان ''دستور پاکستان'' پڑھا تھا جس کا آغاز درج ذیل الفاظ سے کیا ہے:

''برادران ملت! پاکستان ہمارا وطن ہے، اس مملکت میں

اکثریت فرزندان توحید کی ہے۔ مسلمانوں میں ایسے بھی ہیں
کہ جو دو قومی نظریہ کے معترف نہ تھے، انہیں پاکستان
مطلوب نہیں تھا۔ مگر زیادہ تر وہ ہیں جو دلدادہ پاکستان تھے
اور دو قومی نظریہ کو تسلیم کرتے تھے اور آج بھی تسلیم کرتے
ہیں۔ غیر مسلم اہل پاکستان میں اکثریت بنگالی ہندوؤں کی
ہے جن میں سے ایک متنفس بھی دو قومی نظریہ کا قائل نہیں تھا،
ان کی آرزو یہ ہی کہ پاکستان کا دستور لادینی ہو اور وہ بہ
مسرت کہہ سکیں کہ بھارت اور پاکستان کا دستور یکساں نوعیت
کا ہے، قائداعظم راستی پر نہیں تھے، سچائی مہاتما گاندھی کے
دامن میں تھی۔''[1]

درج بالا اقتباس یہ ظاہر کر رہا ہے کہ مولانا نے آج سے چدرہ سال پہلے مشرقی پاکستان کے ہنود کے عظیم خطرے کو محسوس کر لیا تھا، جس کا افواج پاکستان نے حال ہی میں مقابلہ کیا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ۔

پھر فرماتے ہیں:

''پاکستان کے دو گوشے ہیں ایک مغربی پاکستان کہلاتا ہے۔
دوسرا خدا کرے کہ ''مشرقی بنگال'' کی بجائے ''مشرقی
پاکستان کہلائے۔''[2]

---

[1] دستور پاکستان از مولانا ترنم شائع کردہ مفتی حکیم غلام معین الدین نعیمی، صفحہ ۲

[2] دستور پاکستان از مولانا ترنم شائع کردہ مفتی حکیم غلام معین الدین نعیمی، صفحہ ۲

مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کے اختلاف طبائع، طرز ندگی. اور جغرافیائی حالات وغیرہ بیان کرنے کے بعد اس عظیم ومہیب خطرے کا علاج بھی بتایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''مغربی پاکستان سندھ کی وادی اور مشرقی پاکستان ''برہم پترا'' کی پہنائی میں آباد ہے۔ ان دونوں کے درمیان بھارت حائل ہے۔ ایک بازو دوسرے سے ایک ہزار میل سے زائد فاصلے پر واقع ہے۔ از دیدہ دور ہے مگر از دل دور نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں مکانی وجغرافیائی جدائی ہے، وابستگی و پیوستگی نہیں۔ نسلی اعتبار سے مغربی ''آریائی'' ہیں، مشرقی ''دراویدی'' ہیں۔ مغربی گورے چٹے ہیں، مشرقی کالے اور سانولے ہیں۔ مشرقی کی ثروت کا دارومدار طلائی ریشہ (پٹ سن) پر ہے، مغربی کی دولت نقرئی ریشہ (روئی) ہے۔ مشرقی چاول اور مچھلی کا شیدائی ہے، مغربی گندم اور بکرے کا فدائی ہے۔ مغربی کی خوشی اسی میں ہے کہ اس کے سر پر صافہ ہو، کلاہ ہو، مشرقی کو سر کی برہنگی بھلی معلوم ہوتی ہے، مغربی کا غور طلب مسئلہ قلت آب ہے، مشرقی کا عقدہ لانیحل کثرت آب ہے۔ مغربی اپنی افتادطبع کے لحاظ سے فوجی ہے، مشرقی کی خو بو انقلابی ہے۔ مغربی کی تحریری زبان اردو ہے، اس کی تاریخ، اس کے ادب اور اس کے مذہب کا بہت بڑا سرمایہ اردو میں ہے، مشرقی بنگال کی تحریری بولی بنگالی ہے، ہندو روایات

وادبیات کا کافی ذخیرہ بنگالی میں ہے۔ اردو اس طرح لکھی جاتی ہے جیسے قرآن لکھا جاتا ہے، بنگالی یوں تحریر میں لائی جاتی ہے کہ جیسے "وید" اور "منوکا" "دھرم شاستر" ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے۔"

"ان گوناگوں اختلاف کے باوجود مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اسلامی بھائی ہیں۔ قرآن مجید کے اس ولولے کو تسلیم کرتے ہیں۔ "انما المومنون اخوۃ" حقیقت یہی ہے کہ مومن دوسرے کا برادر ہے۔ نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد درست ہے کہ "میری امت ایک شخص کی مانند ہے۔" (امتی کرجل واحد) متعدد منور الفکر غیر مسلم بھی مانتے اور جانتے ہیں کہ اسلامی اخوت کے آفتاب کے سامنے نسل، ذات، خوراک، پوشاک، زبان، افتادطبیعت کے اختلاف کے چاند، تارے، ہنڈے اور دیے ماند پڑ جاتے ہیں۔"

"اگر ہمارے مغربیت زدہ "روشن ضمیر" حضرات بھی اس حقیقت کو مان جائیں تو بہت اچھا ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان مستحکم ہو۔ استحکام پاکستان یہ ہے کہ پاکستانیوں کے افکار میں زیادہ سے زیادہ وحدت ہو۔ ہماری رائے میں موثر وحدت ویگانگت ربط اسلام سے ہے۔ اس لیے پاکستان کی بقا اسی میں ہے کہ اس کا دستور اسلامی ہو۔"[1]

---

1. ایضاً صفحہ: ۲، ۳، ۴

ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:

''قائداعظم کی تصریح عیاں کر رہی ہے کہ جو دستور ہندو کے لیے موزوں ہے، مسلمان کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اگر بھارت کا دستور ''لادینی'' ہے تو قدرتی بات ہے کہ پاکستان کا دستور ''دینی'' ہو۔''

''اگر خدانخواستہ پاکستان کا دستور اسلامی نہ ہوا تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا، جو پاکستان کا بھلا نہیں چاہتا، ہم اسے اپنا دشمن خیال کرتے ہیں۔

ہماری دعا یہ ہے:

جو عدوئے باغ ہو برباد ہو
چاہے وہ گل چیں ہو یا صیاد ہو''[1]

مندرجہ بالا اقتباسات کسی تشریح وتبصرہ کے محتاج نہیں، انہیں پھر ایک بار پڑھیے اور غور کیجئے کہ اللہ کے نور سے دیکھنے والے اس رجل عظیم نے جن خطرات کی پیش گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں؟

کاش! اللہ کے ان نیک بندوں کے مشوروں کو تسلیم کرلیا ہوتا تو ہمیں یہ برے دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام دل وجان سے قبول کرتے ہوئے ملک میں اسلامی دستور نافذ کریں اور ہر ''غیر اسلامی ازم'' پر لعنت بھیجیں اور نظریہ پاکستان کے مخالفوں سے ہوشیار رہیں۔ پھر مشرقی ومغربی پاکستان میں ہرگز کوئی بعد نہیں رہے گا اور کوئی دشمن ہمیں نیچا نہیں دکھا سکے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

---

[1] ایضاً صفحہ:٦

جیل میں:

تحریک ختم نبوت (۱۹۵۳ء) کے ایام میں مولانا ترنم نے پورے ملک میں دورہ کر کے تقریریں کیں اور قادیانیوں کے بارے میں علماء اور عوام کے متفقہ مطالبات منظور کیے جانے پر زور دیا۔ بالآخر دیگر قائدین کے ساتھ انہیں بھی جیل بھیج دیا گیا۔ چھ ماہ سے زائد عرصہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

فیلو پنجاب یونیورسٹی و رکن بورڈ آف سنڈیکیٹ:

مولانا ترنم پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور بورڈ آف سنڈیکیٹ کے رکن مقرر ہو گئے تھے۔ مولانا نے یونیورسٹی میں اسلامی تعلیم کے لیے جو مقدور بھر کوششیں کیں، واقفان حال کے دلوں میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہے۔

بیعت:

مولانا ترنم مغفور و مبرور علوم ظاہری کی تحصیل کے ساتھ ساتھ روحانیت کے چشموں سے بھی سیراب ہوئے تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت حافظ سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری نور اللہ مرقدہ سے بیعت تھے اور حضرت شاہ علی حسین قادری چشتی کچھوچھوی قدس اللہ تعالیٰ سرہ، سے بھی اکتساب فیض باطنی کیا تھا۔

اخلاق و عادات:

مولانا زندگی بھر نہایت سادہ رہے۔ قمیص، شلوار، ترکی ٹوپی ان کا پہناوا تھا۔

موسم سرما میں ایک کوٹ کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ دور چار میل کے سفر کے لیے کسی سواری کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔[1] بڑے بڑے جلسوں میں اور وفود کے ساتھ وزیروں اور گورنروں کے پاس جاتے تو بھی ان کا لباس وہی ہوتا۔ جلسہ گاہوں میں تقریر کرنے جاتے تو اس طرح کہ اسٹیج پہنچ جاتے تو لوگوں کو خبر ہوتی کہ ترنم صاحب آ گئے ہیں۔ انہوں نے ایک صاحب بصیرت عالم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم اور علماء کا خادم ہی سمجھا۔ اہل اللہ کی کفش برداری موجب فخر وسعادت سمجھتے تھے۔ غریبوں کے مونس وغمخوار اور سب شناساؤں اور شاگردوں کے بہترین دوست تھے۔ دوستوں ملاقاتیوں کی تواضع کر کے راحت محسوس کرتے تھے۔ لوگ ان کی اپیل پر ہزاروں روپے ڈھیر کر دیتے تھے اور مستورات اپنے زیور اتار کر دے دیتی تھیں مگر انہوں نے اس مال کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنی زندگی عسرت میں بسر کی۔ کوئی جائیداد نہیں بنائی، نہ نقد مال جمع کیا۔ غرضیکہ مولانا اخلاق وعادات کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ انسان تھے۔ ہر بڑے چھوٹے سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ غرباء کی امداد واعانت کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

مستری محمد شریف نے راقم السطور کو بتایا کہ

---

[1] راقم آثم کو ذاتی طور پر علم ہے کہ مولانا بعض اپنے غریب اقربا کی ہمیشہ امداد واعانت کرتے رہے۔ غرض کہ وہ اپنی محدود آمدنی میں سے بہت سی رقم ایسی مدوں پر صرف کر دیتے تھے۔ اس لیے ان کی عسرت کو ''فقر اختیاری'' کہنا بجا ہوگا۔ راقم السطور کے ایک محترم بزرگ (جناب غلام محمد مرحوم) مولانا ترنم کے محلّہ دار اور عزیز دوست تھے۔ ان کی زبانی مولانا کی درویشانہ زندگی کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے جن کا بیان طوالت کا موجب ہوگا۔

''میری لڑکی کی شادی تھی اور اس وقت میں بالکل قلاش تھا۔ اس پریشانی کا ذکر مولانا سے کیا تو مضطرب ہو گئے اور اگلے ہی روز علی الصبح مبلغ پانصد روپے لے کر میرے گھر پہنچ گئے اور رقم دیتے ہوئے فرمایا: کہ اس میں ضروری سامان خرید لو۔ رخصتی کے دن پھر آؤں گا۔ چنانچہ جس دن برات آنی تھی مولانا پہنچے اور ایک خطیر رقم پھر دے گئے۔''

تصانیف:

مولانا ترنم کی مصروفیات اس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ انہیں تالیف و تصنیف کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی چند علمی تبرکات بطور یادگار چھوڑ گئے۔

۱۔ نعتیہ کلام جو سارے کا سارا محفوظ نہیں ہے۔

۲۔ دستور پاکستان

چالیس صفحات پر مشتمل یہ فاضلانہ مقالہ مولانا نے صدر جمعیۃ العلماء پاکستان پنجاب کی حیثیت سے جمعیت کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ ۱۰، ۱۱ دسمبر ۱۹۵۰ء) کے ایک اجلاس میں پڑھا جسے بعد میں مولانا حکیم غلام معین الدین نعیمی سابق نائب ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء پاکستان (مدیر سواد اعظم) نے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔

اس مقالے کے آخر میں مولانا کا یہ شعر درج ہے:

مرا حرفے ز دستور حکومت مدعا باشد
که ایں حسب کتاب وسنت خیر الوریٰ باشد

اس فکر انگیز مقالے کے چند اقتباس گذشتہ اوراق میں نقل کیے جا چکے ہیں۔

یہ مقالہ دوسری بار ۱۹۵۶ء کے اوائل میں خوب صورت انداز میں چھاپ کر اراکین دستور یہ اور اکابر پاکستان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ دوسرے ایڈیشن کے ابتداء میں یہ سطور درج ہیں:

''یہ مقالہ حضرت علامہ غلام محمد صاحب ترنم نائب صدر جمعیۃ العلماء کل پاکستان نے سپردقلم فرمایا اور سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ دسمبر ۱۹۵۵ء میں پڑھا۔ اب بار دوئم طبع کرا کر اوائل ۱۹۵۶ء کے اجلاس دستور سے قبل اراکین دستور یہ کے علاوہ اکابرین ملت کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر آج دستور پاکستان کی تکمیل ہوگئی تو سمجھا جائے گا کہ یہ مقالہ جمعیت کی آٹھ سالہ شبانہ روز مساعی جمیلہ کی آخری اور کامیاب کوشش ہے۔''

مولانا نے اس مقالے میں اسلامی آئین کے جو بنیادی اصول بتائے ہیں، ان میں سے بیشتر ۵۶ء کے آئین میں شامل کر لیے گئے تھے۔ یہ مقالہ آج بھی اسی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیے۔

۳۔ مقدمہ وحواشی ''بطل نبوت''

بطل نبوت مشہور انگریز مصنف تھامس کارلائل کے ان لیکچروں کا ترجمہ ہے (از محمد سکندر) جن میں اس نے بعض مقامات پر حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس واطہر کے بارے میں مخصوص مستشرقانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مولانا نے اس کتاب کے فاضلانہ مقدمہ اور حواشی میں کارلائل کی ہرزہ سرائیوں کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ مولانا کے مقدمہ وحواشی نے اس کتاب کو کارلائل کی غلط بیانیوں کا مکمل رد بنا دیا

ہے۔خود لکھتے ہیں کہ

""بطل نبوت"" تھامس کارلائل کے لیکچروں کا دندان شکن جواب ہے۔""

کارلائل کفر پر مائل رہا

کس قدر تھا بے ضمیر و بے یقیں

(ترنم)

۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چودھری منظور احمد ساہی کے تعاون سے ۱۹۵۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر مفت تقسیم ہوئی۔

۴۔ الجہاد

یہ جہاد کشمیر کے زمانے کی یادگار ہے۔

۵۔ غذائی چارٹ

فائدہ عوام کے لیے دو قسم کے چارٹ چھپوائے۔ ایک میں پھلوں اور دوسرے میں سبزیوں کے خواص و فوائد درج ہیں۔

۶۔ ماہنامہ ""ٹمپرنس"" لاہور

اس کے پرنٹر، پبلشر مولانا ترنم تھے مگر مدیر کے طور پر ان کے فرزند محمد سکندر صاحب کا نام مرقوم ہوتا تھا۔ اس رسالے میں شراب خانہ خراب اور جملہ قسم کے منشیات کی برائیوں اور اسلامی اخلاق پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ دو تین سال تک جاری رہا۔ افسوس کہ اس وقت کوئی شمارہ پیش نظر نہیں۔

ذوق سخن:

حضرت مولانا ترنم علیہ الرحمۃ نے اپنی علمی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے

کیا اور قریباً دو تین سال تک خوب خوب دادِ سخن دی۔ ان ہی دنوں میں غلام محی الدین مونس مرحوم حضرت ترنم کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے اور انہوں نے فیض ترنم کے بدولت پنجابی کے شعراء میں ایک خاص مقام پیدا کیا۔ مولانا ترنم پنجابی، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے منقبت اور نعت کے علاوہ غزلیں بھی کہیں اور ایک طویل عشقیہ مثنوی لکھی۔ مگر مداح محبوب خدا ﷺ کے مقام سے فروتر سمجھتے ہوئے اس ادبی شاہکار کو نذر آتش کر دیا ور شعر و شاعری سے طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ پھر اس فن سے صرف اس قدر تعلق باری رہ گیا کہ جب کبھی تنہائی میں آلام روزگار کے خیال سے مضطرب ہو جاتے تو ملجاو ماوئے بے کساں (ﷺ) کے حضور میں ترنم ریز ہو جاتے۔

ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آ گئے ہیں سب غم بھلا دیے ہیں

جناب ترنم نے شاعری کے ابتدائی دور میں دنیا داروں اور بڑے لوگوں کے قصائد لکھنے سے کلیۃً اجتناب واحتراز کیا۔ حالاں کہ جس ماحول میں انہوں نے اس فن کی تحصیل و تکمیل کی، اس میں یہ چیزیں روا بلکہ ضروری تھیں۔ لیکن وہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی قدس سرہ کے شعر ذیل کی عملی تفسیر بنے رہے:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارہ ناں نہیں

مولانا کا نعتیہ کلام چونکہ آخر کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے، لہٰذا اس جگہ نمونہ کے طور پر بھی کچھ نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

سفرِ آخرت:

مولانا ترنم وفات سے ڈھائی تین سال قبل ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔ رفتہ رفتہ مرض نے غلبہ پالیا۔ جگر متورم اور دل بڑھ گیا۔ مگر ان تکالیف کے باوجود ان کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ آخری دو ماہ میں امراض نے بالکل نڈھال کردیا تو خطبہ جمعہ دینے سے معذور ہوگئے۔ بالآخر اس عظیم مبلغ اسلام اور عاشق رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ۱۷ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۴ جولائی ۱۹۵۹ء جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور بزبانِ حال یہ کہتا گیا:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

قابلِ رشک جلوسِ جنازہ:

مولانا کے انتقال پر ملال کی خبر وحشت اثر ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئی۔ نماز جمعہ کے بعد لیاقت پارک بیڈن روڈ سے جنازہ اٹھایا گیا۔ ہزاروں عقیدت مندوں نے باچشم تر جلوس جنازہ میں شرکت کی اور بڑے علماء وفضلاء بلا امتیاز مسلک ومشرب شریک جنازہ ہوئے۔ عیدگاہ بہاولپور روڈ میں جنازے کی نماز مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ناظم مرکزی حزب الاحناف لاہور نے پڑھائی۔ مولانا ترنم کا جلوس جنازہ مختلف بازاروں سے گھومتا ہوا جب چوک گوال منڈی میں پہنچا تو کسی نے چوک میں کھڑے ہوکر مولانا کی رحلت کے متعلق چند پر حسرت جملے کہے تو مجمع تڑپ اٹھا۔ اس پر میرا ذہن اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ کے اشعار ذیل کی طرف منتقل ہوگیا:

واسطہ پیارے کا ایسا ہو کہ جو سنی مرے
یوں نہ فرمائیں تیرے شاہد کہ وہ فاجر گیا
عرش پر دھومیں مچیں وہ مومن صالح ملا
فرش سے ماتم اٹھے وہ طیب وطاہر گیا

آخری آرام گاہ:

مولانا کی آخری آرام گاہ گورستان میانی بہاولپور روڈ پر (برلب سڑک) بالمقابل مزار حضرت مہر محمد صوبہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ **نور اللہ مرقدہ وبرد اللہ مَضْجَعَہٗ۔**

۱۹۶۹ء میں محترم نذیر احمد اختر صاحب کی کوشش سے انجمن تبلیغ الاحناف (امرت سر) لاہور نے مولانا کے مزار کو سنگ مرمر سے پختہ بنوادیا اور لوح نصب کرادی ہے۔ اللہ تعالیٰ اراکین انجمن کو جزائے خیر سے نوازے۔

جذبات عزیز:

مولانا کی رحلت کو ہر مکتب فکر کے علماء نے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ اخبارات نے اداریے لکھے۔ مختلف انجمنوں اور تنظیموں نے تعزیت کی قراردادیں منظور کیں۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز سابق ایڈیٹر روزنامہ ''تسنیم'' لاہور، جو مسلکاً اہلحدیث اور جماعت اسلامی کے سرکردہ رکن ہیں، نے ''تسنیم (مرحوم) میں افکار امروز'' کے کالم میں اپنے جذبات کو یوں پیش کیا تھا:

''آج مولانا مرتضیٰ احمد[1] میکش کے انتقال کی خبر ملی...... اس سے

---

[1] مولانا میکش جمعیت علماء پاکستان کے مشیر قانونی تھے اور ترنم صاحب سے تین روز بعد رہگرائے ملک بقا ہوئے۔ رحمہ اللہ

قبل مولانا غلام محمد ترنم نے داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔ یہ دونوں حضرات اہل علم تھے اور ملک کی خدمت میں ان کی زندگیاں گزری تھیں۔ ان خادمان ملت کا اٹھ جانا ایک افسوس ناک سانحہ ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

کہیں سے آب بقائے دوام لاساقی!

مولانا ترنم سے پہلی مرتبہ امرت سر میں تعارف ہوا تھا۔ وہ اسم بامسمی اور اپنے تخلص کا علمی نمونہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی غلامی پرانہیں فخر تھا اور بڑے شیوابیان واعظ تھے۔ پاکستان آنے کے بعد بھی ان کے دینی وملی مشاغل میں فرق واقع نہ ہوا۔ دستور اسلامی کے حامی تھے اور سیکرٹریٹ کی جامع مسجد کے خطیب ہونے کے باوجود اسی مسجد کے منبر سے اس وقت حق بات کہتے تھے جب کہ وقت کی حکومتیں اس بات کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ مسلک کے اعتبار سے بریلوی تھے مگر مرنجاں مرنج اور مسلکی اختلافات کو خوش طبعی اور بذلہ سنجی سے ٹال جاتے تھے۔ قادیانی ایجی ٹیشن میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بندر ہے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد ان کے دم خم میں فرق نہیں آیا تھا۔ ہر فن مولا تھے۔ واعظ، مدرس، سیاسی کارکن، خطیب، عالم، عامی سب کچھ تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے اسے کشت زعفران بنادیتے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر اور ان کی نیکیوں کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین!" [1]

---

[1] بحوالہ فیض الاسلام راولپنڈی بابت جنوری ۱۹۶۰ء

تعزیتی اجلاس:

مولانا ترنم چونکہ پاکستان طبی کانفرنس کے سرگرم رکن تھے۔ اس لیے ۷ر اگست ۱۹۵۹ء کو برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں کانفرنس کی جانب سے ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا، جس میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی، حکیم عبدالمجید عتیقی (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) اور دیگر فضلاء نے حضرت مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس اجلاس کی کارروائی تلاوت قرآن مجید کے بعد مولانا ترنم کے دیرینہ رفیق اور جامعہ اسلامیہ امرت سر کے مدرس جناب حکیم غلام نبی امرت سری (جو تقسیم کے بعد راولپنڈی میں مقیم ہو گئے تھے۔ اب چند سالوں سے انگلستان میں شان خداوندی کے مشاہدہ میں منہمک ہیں) کی نظم سے شروع ہوئی۔ یہ نظم بے حد پسند کی گئی۔ ملاحظہ ہو!

تمدن کے آداب سکھلانے والا — جہاں میں فقط ہے نظام محمد ﷺ
بنی نوع انسان کو امن واماں سے — بسا دینے والا ہے نام محمد ﷺ
عبادت ہے نعت محمد کا پڑھنا — عبادت درود اور سلام محمد ﷺ
زبانِ محمد زبانِ خدا ہے — کلامِ خدا ہے کلامِ محمد ﷺ
خدا کو پیارے ہوئے ہیں ترنم — خدا کو ہیں پیارے غلام محمد ﷺ
خدائے محمد ترنم کو بخشے!! — سناتے تھے ہم کو پیام محمد ﷺ
بہشت بریں ہو عطا ان کو مولا — سراپا تھے خوبی غلام محمد ﷺ
یہ ساقی بلاتا تھا بادہ کشوں کو — مئے عشق مولا بجام محمد ﷺ
پلائے خدا حوض کوثر سے اس کو — بدست محمد بجام محمد ﷺ

ترنم تھا گلزار احمد کا بلبل
کہ گاتا تھا ہردم کلام محمد ﷺ

ترنم تھا باغ محمد ﷺ کا درباں!

ترنم تھا دل سے غلام محمد ﷺ

جمعیۃ العلماء پاکستان کی طرف سے بھی برکت علی اسلامیہ ہال میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا، جس میں اکابر علماء نے حضرت ترنم کی شاندار اسلامی خدمات کو سراہا اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی، نیز جمعیت کی طرف سے اطراف واکناف ملک میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔

تاجران لنڈا بازار لاہور نے ۱۵ مئی ۱۹۶۰ء کو مولانا کی یاد میں ایک جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں منعقد کیا، جس کی صدارت کے فرائض علامہ علاء الدین صدیقی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں مشہور طبیب حکیم عبدالرشید تلمیذ جیلانی ایڈیٹر ماہنامہ ''کلید صحت ڈائجسٹ'' لاہور نے ایک نظم پڑھی جس کے چند بند ذیل میں درج ہیں:

فصیح البیاں، تاجدار تکلم

محیط سخن کا درخشندہ گوہر
وہ دریائے علم وادب کا شناور

جہان خطابت کا ماہ منور
وہ افلاک حکمت کا خورشید خاور

غلام محمد ترنم ترنم!!

فصیح البیاں تاجدار تکلم

بلا کا مفکر، غضب کا مقرر
فقیہ ومحقق، معلم، مفسر

حقائق بیاں کرنے والا مبصر
مسائل کو حل کرنے والا مدبر

غلام محمد ترنم ترنم!!

فصیح البیاں تاجدار تکلم

وہ مانا ہوا دہر میں عالم دیں جسے حق نے بخشی تھی چشم خدا بیں

ریاض طریقت کا ہشیار گل چیں رہا زندگی بھر وہ با عز و تمکیں

غلام محمد ترنم ترنم!!

فصیح البیاں تاجدار تکلم

میرے محسن خاص اے فخر دوراں گئی تیرے جانے سے بوئے گلستاں

ہوئی بزم علم وادب وقف حرماں ہراک آنکھ تیری جدائی میں گریاں

غلام محمد ترنم ترنم!!

فصیح البیاں تاجدار تکلم

زمانے میں تیرا نہ تھا کوئی ثانی ترا نطق تھا اک بحر معانی

تری خدمتِ دین ہے غیر فانی ابد تک رہے گی یہ تیری نشانی

غلام محمد ترنم ترنم!!

فصیح البیاں تاجدارِ تکلم

حضرت مولانا کو ہم سے جدا ہوئے بارہ برس گزر چکے ہیں لیکن ان کی ناقابل فراموش یادوں سے ان کا احباب اور لاتعداد عقیدت مندوں کے سینے آباد ہیں اوران کے دل ان کا مزار ہیں۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

تواریخ وفات:

حضرت مولانا ترنم علیہ الرحمۃ کی وفات حسرت آیات پر تاریخ گو شعراء نے تاریخ قطعات کہہ کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس وقت دو حضرات کے قطعات پیش نظر ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

قطعہ

از

مولانا پیر غلام دستگیر نامی لاہور رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۱ھ)

غلام محمد ہوئے آہ فوت — وفات ان کی ہے ایک عالم کی موت
جو تاریخ مطلوب نامی! ہے تو — "ہوا فوت عذب البیاں ہے" کہو

۱۳ ھ ۷۹

ولہ

غلام محمد کی نامی! وفات — ترنم پہ اک خط تنسیخ ہے
غلام محمد طبیب اجل — جہاں سے گئے آہ تاریخ ہے

۱۳ھ۷۹

دیگر

از

جناب ابو الطاہر فدا حسین فدا لاہوری مدظلہ،

ہوئے ہیں واصل حق اللہ اللہ آج مولانا

بہاریں منتظر ان کے لیے تھیں باغ جنت کی
مؤدب بہر استقبال تھے حور وملائکہ بھی
کشادہ ہوگئی ان کے لیے آغوش جنت کی
ہمیں داغ غم فرقت وہ دے کر چل دیے ہیں آہ
پے ملت رہی تھی وقف جن کی زندگی ساری
مبلغ تھے، محقق تھے، خطیب بے بدل تھے وہ
عظیم وارفع واعلیٰ تھی ان کی باعمل ہستی
چمن والوں کو ہرگز وہ نہ بھولیں گی کبھی واللہ
کہ تھیں عشق نبی میں جو ترنم ریزیاں ان کی
ہے سال وصل پر ان کے فدا بے ساختہ مجھ کو
ندا یہ غیب سے آئی ''ہوئی رحلت ترنم کی''

۱۳ ھ ۷۹

راقم السطور نے مولانا ترنم کی وفات پر یہ تاریخی مادے نکالے تھے:

''ترنم داخل خلد'' ''فاضل حکمت'' ''رحلت شیریں مقال''

۱۹۵۹ء ۱۳۷۹ء ۱۳۷۹ھ

بحر خطابت

جناب اے حمید صاحب کو مرحوم امرت سر کے گلی کوچوں، باغوں، نہروں، ہواؤں اور فضاؤں سے پیار ہے اور جن غیور اور بہادر مسلمانوں کے دم قدم سے یہ شہر

''عروس البلاد'' کہلاتا تھا ان کی پر بہار محفلوں، پر خلوص مجلسوں اور وہاں کے سراپا وفا لوگوں کی مہر و محبت اور تہذیب و ثقافت سے انہیں عشق ہے۔

پتہ آب حیات مہر و الفت کا کوئی پوچھے

تو کہہ دینا کہ ہاں ملتا ہے امرت سر سے ملتا ہے

(شمس مینائی مرحوم)

اے حمید صاحب اپنے اس عشق کی داستان مختلف عنوانوں کے تحت اردو ڈائجسٹ اور دیگر رسائل میں لکھتے رہتے ہیں۔ حضرت ترنم پر میرا یہ مقالہ کتابت کے آخری مراحل میں تھا کہ حکیم کامل نظامی صاحب نے ان کا ایک مضمون بعنوان ''امرت سر کی ایک گلی'' دکھایا۔ یہ مضمون ان کے دورہ امرت سر (مرحوم) کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا ترنم کی خطابت کا خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ اس مضمون کا وہ حصہ جو مولانا ترنم سے متعلق ہے بطور ضمیمہ درج ذیل ہے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

مسجد قاصداں کے دونوں میناروں پر اکالی سکھوں نے اپنے زرد جھنڈے گاڑ رکھے تھے اور اس کی محرابوں پر سکھ عورتیں اوپلے تھاپ رہی تھیں۔ یہ وہی مسجد تھی جس کے در و دیوار جمعے کے روز مولانا غلام محمد ترنم کی ولولہ انگیز تقریروں سے گونجا کرتے تھے، شہر کے دور دراز محلوں سے مسلمان مسجد قاصداں میں مولوی ترنم کی تقریر سننے آیا کرتے۔ سیاہ کالی گھنی ڈاڑھی، گٹھا ہوا مضبوط بدن، چوڑا چکلا ہر وقت مسکراتا ہوا نورانی چہرہ...... مولوی ترنم گیندے اور سرخ گلاب کے ہاروں سے لدے

پھندے جب منبر پر چڑھتے تو نمازیوں میں عقیدت اور جوش ایمان کی ایک لہر دوڑ جاتی، مسجد کا صحن، ہال کمرہ، چھتیں اور گلی نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ چھت پر تمبو، قناتیں لگی ہوتیں، جہاں پردہ دار بیبیاں ہمہ تن گوش ہوتیں۔ مولوی ترنم عشق رسالت مآب میں سرشار آنکھوں سے مجمع پر نگاہ ڈالتے۔ والہانہ انداز میں گردن دائیں کو بائیں گھماتے اور پھر جیسے خدا کے حضور میں مؤدب ہو کر آنکھیں بند کر لیتے اور لب معجز گفتار سے یہ الفاظ نکلتے:

"نحمدہ و نصلی ...."

اس کے بعد خطابت و بلاغت کا ایک دریا بہہ نکلتا جو پر پیچ وادیوں کے ٹیلوں سے ٹکراتا، کھائیوں کو پر کرتا، سنگلاخ چٹانوں کو پیچھے چھوڑتا، بالآخر ایک بحرِ زخار میں جا ملتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار محرم کے دنوں میں مولانا ترنم شہدائے کربلا کا ذکر کر رہے تھے، کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ چھت پر عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

مولانا ترنم تبلیغ دین کے لیے گلی گلی محلے محلے جا کر جلسے کیا کرتے۔ ان کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی۔ تقریر کرتے ہوئے ایک آدھ جملہ سامعین پر کچھ اس طرح چست کر جاتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ ان دنوں امرتسر کے سینما گھروں میں بدھ وار سپیشل: نانہ شو نیا نیا شروع ہوا تھا۔ ترنم صاحب ہمارے محلے میں بعد از نماز عشاء تقریر کر رہے تھے۔ گلی میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مکانوں لی چھتیں اور کھڑکیاں عورتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ تقریر کرتے کرتے مولانا نے زنانہ فلمی شو کی بات شروع کر دی۔ اچانک مکانوں کی منڈیروں کی طرف دیکھ کر بولے۔

"اُتوں اِٹ نہ سٹ دینا۔"

پھر انہوں نے نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ بدھ وار کو میٹنی شو پر جانے کے لیے کس طرح ایک دوسری کو اکٹھی کرتی ہیں۔

"نی سکینہ! اج منڈوے چلنا ایں۔ روٹی جلدی پکائیں۔"

"نی واراں! جلدی جلدی کپڑے دھو، آج بدھ وارا اے۔"

لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے۔ پھر فوراً ہی مولانا ترنم کا لہجہ پر عتاب ہو جاتا اور کہتے:

"سنو! ہماری بیٹیوں اور بہنوں کو تو خدا کے حضور میں جانے کی تیاریاں کرنی چاہیے تھی۔"

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

ایک جلسے میں کشمیر گھرانوں کی شاہ خرچیوں اور خاص طور پر بیاہ شادیوں کے موقع پر ان کی خوش خوراکی اور بے جا اسراف پر تقریر کر رہے تھے کہ شادی کی دعوت کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا۔

"دیگیں کھل گئی ہیں۔ دستر خوان لگ گئے ہیں، پلاؤ کی مہک اڑنے لگی ہے۔ زردہ، بریانی، متنجن سے بھرے ہوئے قاب جا رہے ہیں۔ اوئے چھیدے قورمہ ہور دے جا۔ کاکا جی پٹھ دی بوٹی بھیج دیا جے۔ نی صغراں متنجن دا قاب دے جا۔"

لوگ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے۔ اچانک مولانا ترنم کا لہجہ بدل گیا، بجلی کی طرح کڑک کر کہا:

"شرم کرو۔ ہنستے ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں ہمارے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)

نے پیٹ پر پتھر باندھے تھے۔ ان کے گھر میں فاقہ آجاتا تھا۔

مسلمانو! کہاں سے چلے تھے اور کہاں آ گئے ہو؟''

اس کے بعد اسلامی تاریخ کے اوراق کچھ ایسے دلگداز انداز میں الٹنا شروع کرتے کہ وہ مجمع جو ایک منٹ پہلے ہنس رہا تھا۔ سسکیاں بھرنے لگتا''۔[1]

وہ سوز کہاں مطرب دوراں کی زباں میں

جو سوز ترنم کو عطا تو نے کیا ہے

(ترنم)

التماس

حضرت مولانا علامہ غلام محمد ترنم مرحوم و مغفور کا روح پرور اور وجد آفریں نعتیہ کلام جس قدر دستیاب ہو سکا وہ نذر قارئین ہے۔

مولانا کی بیاض جس میں ہجرت سے قبل کی کہی ہوئی نعتیں درج تھیں، ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد غلام محی الدین مونس شائع کرنے کے ارادے سے راولپنڈی لے گئے مگر وہ جاتے ہی انتقال کر گئے اور بیاض لاپتہ ہو گئی۔

زمانہ قیام لاہور میں مولانا نے جتنی نعتیں کہیں، وہ چھپوا دیں یا نعت خوانوں کو دے دیں اور ان کی نقل نہیں رکھی، اس لیے ان کے کلام کی تدوین و ترتیب اس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ وہ حضرات تعاون نہ فرمائیں، جن کے پاس ان کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام محفوظ ہے۔ لہٰذا مولانا کے عقیدت مندوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں تعاون فرمائیں تاکہ مولانا کے نعتیہ کلام کا ایک ضخیم مجموعہ ترتیب دیا جا سکے۔

---

[1] اردو ڈائجسٹ مارچ ۱۹۷۱ء ص ۳۴۸۔ ۳۴۹

نغمات ترنم

یاداللہ

تیرا در ہے سب کی سجدہ گاہ رب العٰلمین
اے شہنشاہوں کے شہنشاہ رب العٰلمین
تو ہے عالی جاہ عالی جاہ رب العٰلمین
دیتا ہے تیری گواہی تو ہے رب لاشریک
ذرہ ذرہ تابہ مہر وماہ رب العٰلمین

ہادی برحق ہے تو ہو گر ذرا مرضی تری
راہ پر آجائے ہر گمراہ رب العٰلمین
جان ودل سے ہر زماں قرباں ہے تیرے حکم پر
سارا عالم کوہ سے تاکاہ رب العٰلمین

حور وغلماں وقف طاعت ہیں ملائک سجدہ ریز
ہے بشر کے دل میں تیری چاہ رب العٰلمین
کج ہیں راہیں کفر کی باطل کے دستے تنگ وتار
راہ سیدھی ہے تو تیری راہ رب العٰلمین

جن وانساں انبیاء واولیاء ہوں یا ملک
تیرا در ہے سب کی سجدہ گاہ رب العٰلمین

نوح و ابراهیم و اسمٰعیل و ایوب و مسیح
سب کی جانیں تیری قرباں گاہ رب العٰلمین

سب گدا ہیں تو غنی ہے تو ہے اللہ الصمد
تو ہے بے پرواہ بے پرواہ رب العٰلمین

میں سراپا معصیت ہوں بخش دے میرے گناہ
اے مرے مالک مرے اللہ رب العٰلمین

یہ ترنم ذرہ ناچیز و بے مقدار ہے
اس کا سر ہے تیرا فرشِ راہ رب العٰلمین

شخصیات

- بی بیاں پاک دامن
- حضرت وحید احمد مسعود
- فاضل جلیل عبدالحکیم خاں اختر شاہجہان پوری

بی بیاں پاک دامن

واقعات کو مسخ کر کے اور اپنی مرضی کے مطابق قطع و برید کے بعد پیش کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ جو حضرات تاریخ نگاری کے ارادے سے قلم اٹھا کر میدان میں آتے ہیں لیکن محض سماعی باتوں کو اپنا مآخذ قرار دے لیتے ہیں، ان کی کتب جب بھی کوئی محقق اٹھاتا ہے تو اسے اس کی مندرجات کی تکذیب ہی کرنا پڑتی ہے۔ فلسفۂ تاریخ کے اصول وضوابط سے لاپرواہی مؤرخ کی موت کا دوسرا نام ہے۔ فلسفۂ تاریخ کا اصول ہے کہ جس شخصیت یا واقعہ کے متعلق معاصر شواہد موجود نہ ہوں، اس پر قلم اٹھانا تو درکنار قیاس آرائی بھی ''گناہ کبیرہ'' ہے۔ لیکن اگر اس پر اظہارِ خیال کے بغیر چارۂ کار نہ ہو تو ثانوی مآخذ کا استعمال اس طرح کیا جائے کہ واقعہ کسی طرح مجروح نہ ہونے پائے۔ لیکن تاریخ مزارات بیبیاں پاک دامن کے مؤرخین و وقائع نگار حضرات نے اولین اور ثانوی مآخذ تک رسائی تو درکنار متاخرین کی سماعی باتوں کو عقلِ سلیم پر پرکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اس وقت ہمیں لاہور کے مشہور مزارات بی بیاں پاک دامن کی تاریخی حیثیت کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ متاخر مؤرخین نے حقائق پر جس طرح پردہ ڈالا ہے۔ مستقبل کا مؤرخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ آج سے پیشتر جن حضرات نے بھی ان مزارات کی حقیقت پر قلم اٹھانے کی کوشش کی یا تو ان کی

کاوشوں کو ''سعیٔ لاحاصل'' قرار دے دیا گیا یا ذاتی اغراض و مقاصد پر پردہ ڈال کر واضح اور بین دلائل سے انکار کر دیا گیا۔ پس پردہ کیا کیا مقاصد تھے۔ ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں محترم جناب میاں محمد دین کلیم بی اے (مرحوم) کی کوشش بھی قابل قدر ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد تذکرہ قطبیہ کو بنایا جس کی حیثیت مسلمہ ہے۔ اس کے بعد ''تذکرۂ حمیدیہ'' سے استفاد کیا ہے۔ داراشکوہ کی سکینۃ الاولیاء سے بھی حقیقت واضح کرنے کے لیے مدد حاصل کی ہے۔ محترم کلیم صاحب سے قبل جناب پیر غلام دستگیر نامی مرحوم و مغفور نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا اور اپنی متعدد تصانیف میں متاخر مؤرخین مولوی نور احمد چشتی، مفتی غلام سرور لاہوری اور رائے بہادر کنہیالال کی تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ جناب نامی کی اس سعی و کوشش کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اکثر ارباب علم اور تاریخ کے اساتذہ نے اس بات کو تسلیم کیا کہ بی بیاں پاک دامن فی الحقیقت حضرت سید احمد توختہ ترمذی حنفی لاہوری کی صاحبزادیاں ہیں۔ چنانچہ ہمارے زمانہ کے مشہور ماہر تاریخ پروفیسر شجاع الدین ایم اے مرحوم صدر شعبہ تاریخ دیال سنگھ کالج لاہور نے اپنے کئی مضامین میں نامی صاحب کی تحقیق کی تائید کی۔ ہمارے سامنے جدید تحقیق ''حضرت بیبیاں پاکدامناں کون ہیں؟ اور کہاں سے آئیں؟'' مؤلف حفیظ اللہ خاں منظر کی جو تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے کامیاب ترین اور ناقابل تردید ریسرچ ہے۔ فاضل مؤلف نے گراں قدر اور مصدقہ تاریخی حوالہ جات سے کھوج لگا کر ثابت کیا ہے کہ یہ مزارات حضرت بی بی حاج، بی بی تاج، بی بی حور، بی بی نور، بی بی گوہر اور بی بی شہباز رحمۃ اللہ علیہن دختران مرشدِ پنجاب حضرت سید احمد توختہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۶۹۲ھ کے ہیں۔ حفیظ اللہ خاں

منظر نے اس بے بنیاد سوچ کو کہ "یہ مزارات بی بی رقیہ بنت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ہمشیرگان حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہیں" گمراہ کن اور غلط ثابت کیا ہے۔...... وہ دمشق (شام) میں واقع مشہد الشریف السیدہ رقیہ بنت سیدنا علی رضی اللہ عنہ زوجہ حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے مزارات کی بارہ عدد تازہ تصاویر جو انہیں حکومت شام کی طرف سے موصول ہوئی ہیں، مزید چھاپ رہے ہیں۔

محمد موسیٰ عنہ

حضرت وحید احمد مسعود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہٖ الکریم

حضرت وحید احمد مسعود فریدی [1] رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام والمسلمین حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ العزیز کی اولادِ امجاد میں سے تھے۔ شیخو پور ضلع بدایوں (یو۔پی۔ انڈیا) میں ان کا خاندان ذی وجاہت اور با اثر چلا آ رہا ہے۔

جناب وحید احمد مسعود مرحوم و مغفور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، وہ بیک وقت ادیب، مصنف، صحافی، مؤرخ اور ایک باوقار سیاست دان تھے۔ رئیس ہونے کے ساتھ ساتھ کامل فقیر اور بے ریا صوفی بھی تھے۔ یو۔ پی۔ اسمبلی کے ممبر اور پارلیمنٹری سیکرٹری بھی رہے۔ بدایوں سے ایک شاندار رسالہ نقیب کے نام سے جاری کیا، جس کا شمار ملک کے وقیع رسائل و جرائد میں ہوتا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے لیڈروں، ادیبوں اور علماء و مشائخ سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ علامہ اقبال مرحوم و مغفور سے بھی ان کی مراسلت رہی۔ امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہ سے

---

[1] ان کے بہت سے مضامین و تو الیف پر ان کے نام کے ساتھ مختلف القابات و خطابات درج ہیں، کسی پر شیخ لکھا ہے تو کسی پر مولوی اور اکثر پر صرف وحید احمد تحریر ہے۔ نام کے ساتھ مسعود کا اضافہ غالباً انہوں نے بہت بعد میں کیا تھا۔

غایت درجہ عقیدت رکھتے تھے۔[1] سیاست میں حصہ لینے سے قبل انگلستان کا سفر بھی کیا تھا۔ مختلف موضوعات پر انہوں نے متعدد تالیفات یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے سوانح بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ، سوانح حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، اسلام مشرق میں اور سیّد احمد "شہید" کی صحیح تصویر، بہت مشہور و مقبول ہیں۔

فہرست تالیفات درج ذیل ہے۔

مصنف کی دوسری تصانیف

۱۔ منصوری۔ ظریفانہ انداز میں کوہ منصوری کی سیر۔ مطبوعہ نقیب پریس بدایوں

۲۔ تصوف۔ عام فہم تشریح تصوف۔ شانتی پریس بدایوں

۳۔ نشہ کا اُتار۔ نشہ بندی کی تحریک کے متعلق ڈرامہ۔ ہاشمی پریس بدایوں

۴۔ تصوف کی اصلیت۔ تاریخ واصولِ صوفیہ۔ نول کشور پریس لکھنو

۵۔ گردِ راہ۔ سیاسی وادبی مضامین کا مجموعہ۔ نامی پریس لکھنؤ دیونائیڈ انڈیا پریس

۶۔ سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ تاریخ وتصوف[2] کی روشنی میں

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن سلمان اکیڈمی کراچی نے شائع کیا، اب ضیاء القرآن پبلی کیشنز شائع کر رہا ہے۔

۷۔ اسلام مشرق میں۔ ابتدائی اقوام مغل اور اسلام کی تاریخ۔ دکن دار الاشاعت کراچی۔

۸۔ محبت کی بلندیاں۔ اسلامی تاریخ کا سچا ڈرامہ۔ نظامی پریس بدایوں

---

[1] اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ پر انہوں نے ایک مضمون لکھ کر مجھے بھیجا تھا۔ جو تا حال نہیں چھپا۔ اب اسے طبع کرا دیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

[2] ناشر، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

۹۔ جمال صابر کلیری۔ نظامی پریس بدایوں

۱۰۔ سید احمد ''شہید'' کی صحیح تصویر۔ طبع لاہور

۱۱۔ دھوپ چھاؤں۔ سیاسی ادبی وظریفانہ مضامین زیر طبع

۱۲۔ انتخاب رسالہ نقیب۔ //

۱۳۔ عقل وعقیدہ۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تشریح وتنقید //

حضرت وحید احمد مسعود صاحب زندگی کے آخری تین سالوں میں گوشہ نشین ہو کر ہمہ وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہے۔ احقر راقم السطور کو ان کی ملاقات کا شرف کبھی نصیب نہیں ہوا۔ لیکن خط وکتابت کئی سال تک برابر جاری رہی اور ان کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی ایک صاحبزادی (بیگم مونس) لاہور میں قیام پذیر ہیں۔ ان کا ایک خط مرقومہ ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ء مجھے موصول ہوا تھا۔ جس میں حضرت وحید احمد کی رحلت کی خبر وحشت اثر اور کیفیت سفر آخرت بالفاظ ذیل درج ہے۔

''آپ کے عظیم دوست جن کو آپ نے دیکھا بھی نہ تھا اور دوستی اس طرح تھی کہ دل حیران تھا، آپ سے ملنے کا ان کو بہت ارمان تھا اور آپ کا سفر نامہ حج لکھنے کی تمنا تھی[۱] آپ کی خدمت میں .... آخری سلام ۳ر جنوری ۷۷ء

۱؎ ۱۳۹۳ھ میں حج بیت اللہ شریف اور زیارت روضۂ رسول اللہ ﷺ کے لیے رختِ سفر باندھا تو میں نے حضرت مرحوم کو اطلاع دی تو انہوں نے تحریر فرمایا کہ ''سفر حرمین طیبین کی مشاہدات اور واردات قلم بند کر کے لائیں، میں انہیں مرتب کر کے طبع کراؤں گا۔'' پھر ان کا ایک تاکیدی مکتوب حضرت قبلہ مولانا شیخ ضیاء الدین احمد قادری مدظلہ العالی (مدینہ منورہ) کی معرفت ملا۔ مگر مدینہ منورہ کی نورانی فضاؤں میں بیٹھ کر مجھ جیسے عاصی وناتواں کے لیے کچھ لکھنا بہت ہی مشکل تھا۔

کو مجھ کو......لکھا تھا اور بالکل ٹھیک تھے۔ ۵ جنوری کو طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے کہا کہ سردی کا اثر ہے۔ ۶ رتاریخ کو آیت الکرسی کا ورد رہا کہ ایک منٹ کو زبان نہ رُکی۔ ۷ رکو آیت کریمہ اس طرح پڑھی کہ ایک منٹ کو زبان نہ رُکی۔ ۸ رکو یا اللہ۔ یا رحمٰن۔ یا رحیم مسلسل پڑھتے رہے۔ ۹ رکو سکوت کا عالم رہا۔ ۱۰ ر کو سیدھی جانب دیکھ کر کہتے یا خواجہ! اُلٹی جانب دیکھ کر کہتے یا بابا! اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہتے یا اللہ۔ شام کو کہا کہ اگر میرے بعد کوئی میری اولاد میں سے روئے گا تو میری روح کو تکلیف ہوگی۔ رات کو ۷ بجے کہا کہ آج ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ کھاؤ، پیو، خوش رہو اور خود شوربا پیا اور پانی خوب پیا، وضو کیا اور نماز پڑھی اور سو گئے، مگر میرا بھائی وہیں رہا۔ ۱۲ بجے رات اُٹھے اور ۳ مرتبہ پے در پے وضو کیا اور لیٹ گئے۔ اور میرے بھائی سے کہا کہ کمرہ کا دروازہ کھول دو، اُس نے کھول دیا۔ پانچ آدمی کمرہ کے اندر آ گئے دو کو نہایت احترام سے اپنی سیدھی طرف بیٹھنے کو کہا اور تین کو اپنی اُلٹی جانب بیٹھنے کو کہا۔ پھر سامنے دیکھ کر اپنے چہرہ کے بالکل سامنے ہاتھ ہلا کر کہا ابھی آتے ہیں۔ ابھی آتے ہیں اور بآوازِ بلند تین بار یا اللہ۔ یا رحمٰن یا رحیم پڑھا پھر خوب آواز سے کلمہ پڑھا اور تین سانسیں لیں اور خالق حقیقی سے جا ملے......"

صورت از بے صورتی آمد بروں

بازشد انا الیہ راجعون

گویا آپ ۱۰ ر اور ۱۱ جنوری ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو بمقام شیخوپورہ (ضلع بدایوں) واصل بحق ہوئے۔ رَحِمہُ اللہ تعالیٰ رَحمۃً وَاسِعَۃً

محترمہ موصوفہ (بیگم مونس) نے میرے تعزیت نامہ کے جواب میں جو

مکتوب ارسال کیا اس میں حضرت کی زندگی کی ایک حیرت انگیز کرامت بھی درج ہے۔مگر یہ چیزیں مفصل مضمون کی متقاضی ہیں اور ان پر تفصیل سے لکھنا پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب (کراچی) کے فرائض میں شامل ہے، امید ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی ہر ممکن سعی کریں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

فاضل جلیل عبدالحکیم خاں اختر شاہجہان پوری

فاضل جلیل، عالم نبیل، زعیم اہل سنت، جناب عبدالحکیم خاں اختر شاہجہان پوری نقشبندی مجددی مظہری مدظلہ العالی مترجم کتب احادیث مبارکہ و مؤلف کتب کثیرہ...... مسلک حقہ اہل سنت و جماعت کی تائید وحمایت میں بے پناہ لکھنے کے علاوہ مخالفین و معاندین اہل حق کے بے ہودہ اور لغو اعتراضات کے مسکت جوابات دینے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ مخالفین اہل حق کے بڑے بڑے قلم کار اور فن مناظرہ میں ید طولیٰ رکھنے والے علماء ان کے نام اور کام سے خائف و ہراساں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی دینی، مذہبی، مسلکی اور مشربی پر خلوص خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ اپنوں اور بیگانوں میں یکساں طور پر متعارف ہیں...... مگر میں ان کے دیرینہ نیاز مند ہونے کی بنا پر ان کے دلی جذبات اور سوز دروں تک سے واقف ہوں۔

حضرت اختر مدظلہ سے میرا پہلا غائبانہ تعارف ۱۹۶۲ء میں اس طرح ہوا کہ ملک کے مشہور شاعر، صحافی اور ادیب شورش کاشمیری صاحب نے ہفتہ وار ''چٹان'' لاہور میں مسلک حقہ اہل سنت و جماعت کو بدنام کرنے کے لیے اکابر اہل سنت پر بہتان تراشیوں اور دروغ بافیوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس وقت حضرت اختر نے

شورش صاحب کی ان دل آزار اور نہایت غیر ذمہ وارنہ تحریروں کا محاسبہ اور تعاقب ہفت روزہ ''سواد اعظم'' لاہور میں کیا۔ مگر چند ماہ میں جناب شورش کی یہ شورش فرو ہو کر رہ گئی وگرنہ جناب اختر صاحب سال ہا سال تک شورش صاحب کے خلاف لکھنے کا تہیہ کر بیٹھے تھے۔(۱)

حضرت اختر سے اس تعارف کے بعد ۱۹۶۸ء میں ان کے قریب ہونے کا سبب یہ ہوا کہ اہل سنت کے تغافل و تساہل اور کانگرسی مولویوں کی پاکستان میں آمد اور ان کے اپنے مخصوص انداز میں پروپیگنڈہ کی مہم اور جماعت اسلامی کی غیر اسلامی کارروائیوں کے باعث، اس پاکستان میں جسے اہل سنت نے ووٹ، نوٹ، عزت، آبرو اور جانیں دے کر حاصل کیا تھا، اس میں منعقدہ علمی وادبی مجالس ومحافل (جن میں راقم الحروف کو شمولیت کا اکثر موقع ملتا تھا) اہل سنت کے امام اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ کا نام لینا جرم یا باعث عار سمجھا جانے لگا تھا اور جب ذرائع ابلاغ پر اغیار کا مکمل طور پر قبضہ اور ''قلم در کف دشمن است'' کا معاملہ درپیش تھا اور کتب فروشوں کے ہاں امام اہل سنت کی تصانیف نظر ہی نہیں آتی تھیں اور نہ ان پر کوئی کتاب باصرہ نواز ہوتی تھی۔

اگر چہ ۱۹۶۸ء سے قبل اعلی حضرت، امام اہل سنت قدس سرہ پر دو کتابیں چھپ چکی تھیں مگر وہ صرف حلقہ مولویاں تک محدود تھیں۔ یہ ارمغان علمی، ذی علم حضرات سے مخفی تھے۔ ان کتب کی طباعت سے کچھ عرصہ پہلے کا اپنا ایک واقعہ جناب محترم حفیظ تائب صاحب نے راقم سے بیان فرمایا تھا۔ وہ یہ کہ موصوف نے ایک مرد بزرگ پیر طریقت قدس سرہٗ کو خط لکھا کہ میں امام اہل سنت شاہ احمد رضا بریلوی رحمۃ

اللہ علیہ کے حالات، مقامات علمیہ اور خدمات دینیہ وملیہ سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہوں، ان پر لکھی گئی کسی کتاب کی نشان دہی کیجئے...... اس پر حضرت قبلہ شیخ الحدیث قدس سرہ نے جواباً تحریر فرمایا کہ "حزب الاحناف لاہور سے "وصایا شریف" خرید کر پڑھئے" (مفہوماً)

یہ بڑا کرب ناک اور ذہنی اذیت کا دور تھا، مگر صرف ہمارے لیے ہی تھا وگرنہ مولوی لوگ تو اپنی اپنی پناہ گاہوں میں بیٹھے اپنے آپ کو ولایت عظمیٰ پر فائز سمجھتے ہیں اور انہیں کسی علمی محفل میں جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، گویا وہ اس مصیبت سے محفوظ ہوتے ہیں اور یہ لوگ اپنی مجالس یا حلقہ مریداں میں بیٹھے ہم ایسوں کو عام طور پر جاہل، ان پڑھ کہہ کر یاد فرماتے ہیں اور جس وقت بہت ہی زیادہ مہربان ہوں تو ناسمجھ اور بے عقل کے القابات سے بھی نواز دیتے ہیں اور کبھی ہمارے مرض کا نام پاگل پن تشخیص فرماتے ہیں۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ چند رسائل چھاپ کر کونسا تیر مارا ہے؟ (۲)

اس تکلیف دہ دور میں احقر راقم السطور نے مرکزی مجلس رضا، لاہور قائم کی، تاکہ اس کے ذریعے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے فاضل اساتذہ اور ذہین طلبہ کو نہایت معیاری لٹریچر بلا قیمت پیش کر کے اس مکدر اور مسموم فضا کو صاف وشفاف کیا جائے تاکہ سچے عاشق رسول مقبول یعنی امام احمد رضا بریلوی کا روشن ومنور چہرہ سب کو نظر آنے لگے۔

اس وقت فاضل محترم جناب اختر شاہجہان پوری کی خدمت میں بندہ نے ایک عریضہ بذریعہ ڈاک ارسال کیا کہ "آپ ہمارے ساتھ قلمی وعلمی تعاون فرمایا

کریں''۔ موصوف نے عاجز کی اس درخواست کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے مرکزی مجلس رضا کی علمی معاونت شروع کردی، اگرچہ وہ امام اہل سنت پر اس سے پہلے بھی مضامین لکھا کرتے تھے جو ان اخبارات و رسائل میں طبع ہوا کرتے تھے جو صرف حلقہ مولویاں میں پڑھے جاتے تھے۔ مگر میری یا مرکزی مجلس کی معاونت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو اعلیٰ حضرت، امام اہل سنت، مجدد دین وملت علیہ الرحمہ کے لیے وقف کردیا اور دن رات لکھتے ہی چلے گئے، اس سے بے نیاز ہوکر یہ مبسوط تحقیقی مقالات شائع ہوں گے بھی یا نہیں؟ ان کے مطبوعہ اور ہنوز منتظر اشاعت مقالات جو صرف اعلیٰ حضرت پر ہیں، کو یک جا جمع کردیا جائے تو کئی جلدوں پر مشتمل ایک حجیم وضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

مرکزی مجلس رضا لاہور سے طبع ہونے والی چند کتب کے مسودات کو حضرت اختر نے محنت شاقہ کے بعد طباعت کے قابل بنایا یعنی ان کی زبان کی درستی کے علاوہ پیرابندی کی اور حوالے تلاش کرکے درج کیے۔ انہیں یہ زحمت اس لیے اٹھانا پڑی کہ ہمارے ایک مقالہ نگاری ردی کے کاغذوں بلکہ چیتھڑوں پر مسودات تیار کرکے بھیجتے تھے۔

حضرت اختر مدظلہ کی صرف ایک تالیف ''اعلیٰ حضرت کا فقہی مقام'' مرکزی مجلس رضا کو شائع کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی یہ محققانہ تالیف اہل قلم اور ارباب علم و دانش میں بے حد مقبول و مطبوع ہوئی، گویا حضرت اختر صاحب نے دوسروں کے کام کو سوار کر ان کو لکھنے کا ڈھنگ سکھانے کی کوشش کی اور دوسری طرف مجلس کی علمی بنیادوں کو استحکام بخشا مگر مرکزی مجلس رضا اِن کی دیگر گرانقدر تصانیف کو

چھپوا نہ سکی، گویا ان کے مخلصانہ جذبات اور بے لوث خدمات کی صحیح قدر نہ کی گئی۔

مرکزی مجلس رضا پر ناقدر دانی کا الزم دھرنے سے یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ احقر حضرت موصوف کی محققانہ توالیف اور بیش بہا علمی رسائل کو محض اس لیے نہ طبع کرا سکا کہ میں تین مولویوں کو علمائے حق سمجھ بیٹھا تھا اور ان تین کے علاوہ ایک مولوی کے رشتہ دار کو خادم دین جان لیا تھا۔ ان مولوی حضرات سے تعلق کی بنا پر میں نے بہت کچھ کھویا، مگر دور حاضر کے اکثر مولویوں کی حقیقت واضح ہوگئی ہے۔

ان ملنٹ اللہ فی الارض (۳) کے مجھ پر جو اثرات مرتب ہونا تھے انہیں جناب اختر صاحب زید مجدہ نے بہت جلد بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ چار سال کی مسلسل جانکاہی کے بعد کوئی وجہ بتائے بغیر ۱۹۷۲ء میں وہ مجلس سے لاتعلق ہو گئے تھے، مگر انہوں نے احقر سے تعلق خاطر منقطع نہ فرمایا اور میں بھی ان کی بے پناہ محنت و خدمت کی آج بھی تہ دل سے قدر کرتا ہوں...... مقام صد افسوس ہے کہ اس خادم دین متین (حضرت اختر) کے ساتھ بعض، علمی و روحانی، ہستیوں نے ابتدا ہی سے معاندانہ یا حوصلہ شکنی کا رویہ اپنا رکھا ہے، غالباً صرف اس لیے کہ وہ ''مولوی پیشہ'' نہ ہونے کے باعث ان کے پیٹی بند بھائی نہیں بن سکے۔

مذکورۃ الصدر حقائق کے پیش نظر میں نے حضرت اختر صاحب زید علمہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے علاقہ میں مرکزی مجلس امام اعظم (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کریں اور اس کے ذریعے اپنے رشحات قلم کے ساتھ ساتھ دیگر علمائے حق کی تصانیف کو بھی شائع کر کے متلاشیان حق کے سامنے پیش کریں۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ میرا یہ مشورہ شرف قبولیت سے بار آور ہوا اور ۱۳ ستمبر ۱۹۸۵ء کو واٹن

سکول کے نزدیک لاہور چھاؤنی میں مرکزی مجلس امام اعظم کے متبرک و مقدس نام سے موسوم ایک علمی ادارہ حضرت اختر صاحب قبلہ نے قائم کر دیا۔ جزاء اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

اس ادارے نے اپنی صرف سہ سالہ زندگی میں ایک درجن سے زائد نہایت معیاری اور دیدہ زیب کتب و رسائل طبع کرنے کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ اور یہ قیمتی جواہر پارے پورے ملک کے ارباب علم و دانش تک پہنچ چکے ہیں۔ مرکزی مجلس رضا لاہور نے جو بلا قیمت (۴) یعنی بعوض دعائے خیر کتب مہیا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اسی طرح حضرت اختر کی قائم کردہ مرکزی مجلس امام اعظم بھی تمام مطبوعات قارئین کی نذر کر رہی ہے۔

میری دعا ہے کہ سچ خادم دین اور مرد قلندر حضرت اختر کا لگایا ہوا یہ پودا ملک کا ایک عظیم تناور درخت بنے اور اس فتنوں کے دور کی ہر آفت اور ہر نظر بد سے محفوظ و مصئون رہے اور مبینہ حدید کتاب الحبل (۵) پر عمل کرنے والے خائن دوست اور خیانت پسند افراد اس سے کوسوں دور رہیں تا کہ اس کے ثمرات علمیہ دنیا بھر میں پھیل جائیں، آمین! یہاں حضرت اختر کے اس جذبہ ایثار کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے مرکزی مجلس امام اعظم کی طرف سے اپنی صرف چار کتابیں چھپوائی ہیں جبکہ پندرہ کتابیں دیگر حضرات کی ہیں۔

پیش نظر کتاب ''کلمہ حق'' حضرت محترم عبدالحکیم خان اختر صاحب مدظلہ کی نہایت تحقیقی و تدقیقی تالیف و تصنیف ہے، جو اہل سنت و جماعت اور دیوبندی علماء کے جملہ اختلافات میں سے سب سے اہم، سب سے نازک اور سب سے دقیق اور

اصولی اختلاف یعنی افاضل واکابر دیوبند کی کفریہ عبارات اوران کی تکفیر سے متعلق ہے۔

پاکستان میں دیوبندی حضرات کے مشہور و مقبول مولف مولوی محمد سرفراز گکھڑوی صاحب نے اپنی بعض تالیفات میں اس مسئلہ تکفیر پر بحث کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہ اور چند دوسرے سنی علماء پر نہایت رکیک حملے کئے ہیں۔ فاضل محترم جناب اختر صاحب نے محققانہ، منصفانہ اور غیر جانب دارانہ جوابات دے کر جناب گکھڑوی صاحب اوران کے جملہ ہم نواؤں کے اس سلسلہ کے تمام اعتراضات کا لغواور باطل ہونا ثابت اور مبرہن کر دیا ہے۔ جو صاحب علم و دیانت بھی (مخالف و موافق) بنظر انصاف اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس تالیف منیف کا مطالعہ کرے گا یقیناً اس کا ضمیر اسے یہ کہنے پر مجبور کردے گا۔

۱۔ معترضین کے اس سلسلے کے جملہ اعتراضات ان کے حسد، ان کی علمی کم مائیگی، ان کی ضد، ان کی ''اکابر پرستی'' پر شاہد عادل ہیں اور معترض یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ایک طرف حضور پرنور سرور عالم وعالمیان وشفیع عاصیان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کی عزت وحرمت اور ناموس کا سوال ہے اور دوسری طرف اواخر تیرھویں اور چودھویں صدی کے ''علمائے دیوبند''!!!

۲۔ فاضل مولف کے پیش کردہ تمام دلائل حقائق پر مبنی ہیں اور انھوں نے کسی مقام پر انصاف اور دیانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

۳۔ ہر فرقہ وگروہ کے ''علماء'' کو حضرت اختر کی طرح وزن دار بات کرنی چاہئے۔

۴۔ ''کلمہ حق'' میں گستاخانہ یعنی کفریہ عبارتوں کو ان کے سیاق وسباق کے ساتھ

پیش کر کے ان سے برآمد ہونے والے مطالب، مفاہیم اور نتائج کو بالترتیب آسان لفظوں میں دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ عوام الناس بھی سمجھ سکیں کہ عبادتیں فی الواقع ایمان سوز ہیں یا ایمان افروز؟

۵۔ اس تالیف کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت اختر صاحب اس میدان کے شہسوار ہیں اور امام اہل سنت، علی حضرت قدس سرہ سے غایت درجہ عقیدت رکھنے کے علاوہ ان کے حالات و مقامات عالیہ اور ان کے بے پناہ دینی و ملی خدمات وغیرہم سے کما حقہ، واقفیت رکھتے ہیں۔

یہاں ایک اہم حقیقت کو بیان کرنا بھی از بس ناگزیر ہے کہ آج کا دور الحادکا دو ہے، دین کے رکھوالوں کو منصب، جاہ، مفاد اور زر کی ہوش لاحق ہو گئی ہے، جس کے باعث باطل عقائد کے لوگوں کا مشاغبہ (پروپیگنڈا) اس قدر موثر ہوگیا ہے کہ کچھ حضرات اتحاد بین المسلمین کے نام پر عوام الناس کو اس مسئلہ کی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور کچھ خاموشی اختیار کرنے یں ''بہتری'' سمجھتے ہیں اور بعض افاضل اس اہم ترین موضوع پر اظہار خیال ضروری خیال کرتے ہیں مگر خود سامنے آنا پسند نہیں کرتے۔ میرے ایک عالم و فاضل دوست نے اس موضوع پر بہت ہی اچھے انداز میں دعوت فکر دی مگر کسی اور کے نام سے...... ایسے حالات میں جناب اختر کی جرات رندانہ قال صد داد اور لائق صد تحسین و تبریک ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

آخر میں ''مولوی صاحبان سے'' یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ تالیف

کتب میں علم و دیانت کے تقاضوں کو پورا کیا کریں، جیسا کہ پیش نظر تالیف میں ملحوظ رکھا گیا ہے...... کتاب کے حوالے اصل کتابوں کو بچشم خود دیکھ کر نقل کیا کریں اور انہیں اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علم اب ہر طبقے کے افراد کے پاس پہنچ چکا ہے۔ تحقیق کے انداز اور طریقے کو وہی لوگ خوب جانتے پہچانتے ہیں جنہیں آپ اپنی مساجد میں ''بہت کچھ'' کہتے ہیں...... مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی کمزور، غلط بیانیوں سے پُر اور محض جانب دارانہ تالیفات کے مطالعہ کے بعد جدید طبقہ کے اہل علم کو آپ پر بالکل اعتماد نہیں رہا۔ اس بے اعتمادی کی ایک مثال مشہور محقق و دانشور پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب نے احقر سے بیان کی تھی۔ وھوھذا۔

ایک روز (مجددی صاحب) بسلسلہ خریداری کتب ایک کتاب فروش کے پاس کھڑے تھے کہ ایک صاحب آئے اور کتاب فروش سے کہا کہ ''میرے ایک دوست جو امریکہ میں رہتے ہیں، نے رد قادیانیت پر کوئی نہایت ذمہ دارانہ اور محققانہ کتاب طلب کی ہے، آپ کوئی معیاری کتاب دیں۔'' اس پر تاجر کتب نے جناب ابوالحسن علی ندوی صاحب کی تالیف ''قادیانیت'' دکھائی تو اس شخص نے کہا...... ''یہ تو کسی مولوی کی لکھی ہوئی ہے اس میں حوالے ضرور توڑ مروڑ کر پیش کیئے گئے ہوں گے، کسی پروفیسر کی تصنیف ہو تو دیں'' ...... یہ کہا اور کتاب ''(قادیانیت)'' کو نفرت سے پھینک کر چلتا بنا۔

میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ''قادیانیت'' میں درج تمام حوالہ جات و اقتباسات درست و صحیح ہیں (٦)۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے ''البریلویہ'' اور اس جیسی چند اور کتابوں میں منقول اقتباسات کو اصل کتابوں سے ملا کر دیکھ لیا ہوگا اور اس

کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہوگی کہ ''سارے کے سارے مولوی اسی طرح کی غلط بیانیاں کرتے ہیں''۔ اس طرح کے نام نہاد ''علماء اور مبلغین اسلام'' کی غیر ذمہ دارانہ تحریروں اور تقریروں کے باعث صحیح لکھنے اور سچ بولنے والوں پر سے بھی پڑھے لکھے، لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اگر آپ یونہی ''تقویٰ برطرف'' لکھتے رہے اور ''دیانت برخاست'' تقریریں کرتے رہے اور مفتی حضرات فاقہ کی سنت پر عمل پیدا ہونے کی بجائے پلاٹ (۷) حاصل کر کے ''دین کی خدمت'' میں مگن رہے تو خدارا سوچئے پھر کیا حشر ہوگا؟ دعوت اسلام کس کو دی جائے گی؟ تبلیغ کس کو کی جائے گی؟ کون آپ کی بات سنے گا؟

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے محترم ومکرم جناب اختر صاحب شاہجہان پوری ایک سرکاری سکول میں خدمت تدریس پر مامور ہیں اور ''رائج الوقت مولویت'' سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی اس تالیف میں حق وصداقت کو ہر موقع پر ملحوظ رکھا ہے اور اعلیٰ حضرت، امام اہل سنت، فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ جو ایک سچے عاشق رسول تھے، کی ایمانی تحریروں کا دفاع صرف اس لیے کیا ہے کہ اس قدسی صفات بزرگ نے ''علمائے دیوبند'' کا تعاقب صرف اور صرف اس لیے کیا تھا کہ انہوں نے یقیناً سب کے آقا مولیٰ مدنی تاجدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس وارفع واعلیٰ میں واقعۃً گستاخی کا ارتکاب کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مفتی اعظم پاکستان سید ابوالبرکات صاحب اور شیخ الحدیث حضرت سردار احمد صاحب (رحمہما اللہ) نے ان گستاخوں سے وقتی وعارضی اتحاد کو بھی جائز قرار نہیں دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کسی ''نام نہاد اتحاد'' میں شمولیت کی

غلطی کی گئی، اس کا نتیجہ اہل سنت اور پاکستان کے سراسر خلاف نکلا۔ ''تحریک ختم نبوت'' ۱۹۵۳ء کے اتحاد کی بناء پر ان ''مولویوں'' کو جو ''نظریہ پاکستان'' کے سخت مخالف تھے۔ عوام کے سامنے آنے کا موقع مل گیا اور اسی اتحاد کی بدولت ''شیعہ فضلاء'' کو بھی امام باڑوں سے باہر آ کر کام کرنے کی تربیت ملی اور اب وہ ایک طاقت بن چکے ہیں اور وہ اپنا ہر مطالبہ منوا کر ہی دم لیتے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں ''قومی اتحاد'' معرض وجود میں آیا۔ اہل سنت (ملک کی غالب اکثریت) کا صرف ایک ستارہ آسمان پاکستان پر نظر آیا۔ جو بہت جلد آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ یعنی اہل سنت کی قسمت کا ستارہ ڈوب گیا...... اب ۲۷ فروری ۱۹۸۹ء کو راولپنڈی میں ایک اور ''اتحاد علماء'' کی خبر آئی ہے مگر یہ اتحاد سابقہ اتحادوں سے کمزور اور غیر موثر ثابت ہوگا، اس لیے کہ نام نہاد ''اسلامی اتحاد'' (جو فی الحقیقت ''جماعت اسلامی کے وارے نیارے اتحاد'' ہے) اور پیپلز پارٹی دونوں نے ''فتویٰ باز'' مولوی خرید لیے ہیں، لیکن یہ لایعنی اتحاد بھی ہمارے تشخص کو مزید نقصان پہنچا کر مخالفین اہل حق کے اثرات کو خانقاہوں تک پہنچاوے گا یعنی پہلے اتحادوں کے نتیجے میں دیوبندیوں کا صرف مساجد میں عمل دخل بڑھا، اب انہیں خانقاہوں کا راستہ خود ہی دکھا دیا گیا ہے اور اس سے بہت پہلے شیعوں نے خانقاہوں پر قابض ہونے کے لیے بہت کچھ کیا ہوا ہے اور وہ اپنا اثر و نفوذ اس قدر بڑھا چکے ہیں کہ پاکستان کی ایک تہائی خانقاہیں ان کے معتقدات کی تبلیغ کے مراکز بن چکے ہیں۔ بہر حال آئندہ کا مورخ یہ بتائے گا کہ اہل سنت کی میراث سے شیعوں کو کیا اور کتنا ملا اور دیوبندیوں نے کس قدر پایا......!

فی الحقیقت پیش نظر تالیف صرف اعلیٰ حضرت بریلوی کا دفاع ہی نہیں بلکہ جذبہ حب رسول ﷺ کے تحت گستاخوں سے بیزاری کا اظہار بھی ہے۔......اللہ تعالیٰ محترم مولف کی اس سعی کو منظور و مقبول اور قارئین کرام کے لیے موجب ہدایت بنائے۔آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وسلم۔

خاک راہ دردمنداں:......محمد موسیٰ عفی عنہ

داتا کی نگری

۸شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

حواشی

۱۔ ان دنوں احقر نے بھی ایک مضمون لکھا تھا جو قلمی نام سے ''سواد اعظم'' میں چھپا تھا۔ حضرت ابوالطاہر فدا حسین صاحب نے اپنے موقر ماہنامے ''مہر وماہ'' لاہور میں شورش صاحب کو زوردار تنبیہ کی تھی اور ایک بڑی تند و تیز نظم بطور جواب آں غزل ہفتہ وار ''طوفان'' ملتان کے لیے لکھی، مگر اس وقت کے وزیر قانون شیخ خورشید نے یہ جنگ بند کرانے میں خیر سمجھی اور وہ نظم چھپنے سے رہ گئی۔

۲۔ مگر دیوبندی مکتبہ فکر کے استاد تاریخ پروفیسر محمد اسلم صاحب لکھتے ہیں۔: ''یہ عمارات (دہلی) دیکھنے کے بعد حکیم محمد موسیٰ امرتسری سیکرٹری مجلس رضا پاکستان کو خط لکھا کہ آپ لوگوں نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے، یہاں تو کچھ بھی نہیں۔'' (بھارت کا سفرنامہ، مطبوعہ ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک اپریل ۱۹۸۵ء)

۳۔ اس اصطلاح کو حضرت بابا محمد اعظم نوشاہی میروالی نے اپنی بے مثال تالیف ''بے مثل بشر'' کے دیباچہ میں استعمال کیا ہے اور اعلیٰ حضرت نے ''ملو'' لکھا ہے۔

۴۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ طریقہ احقر نے مخدومی ومحترمی حضرت پیر غلام دستگیر نامی علیہ الرحمۃ سے سیکھا تھا۔ حضرت نامی دائرۃ الاصلاح کی جانب سے تمام لٹریچر بلا قیمت فراہم کیا کرتے تھے۔ آخر زندگی میں انہوں نے احقر کو نائب دبیر بنا دیا تھا۔

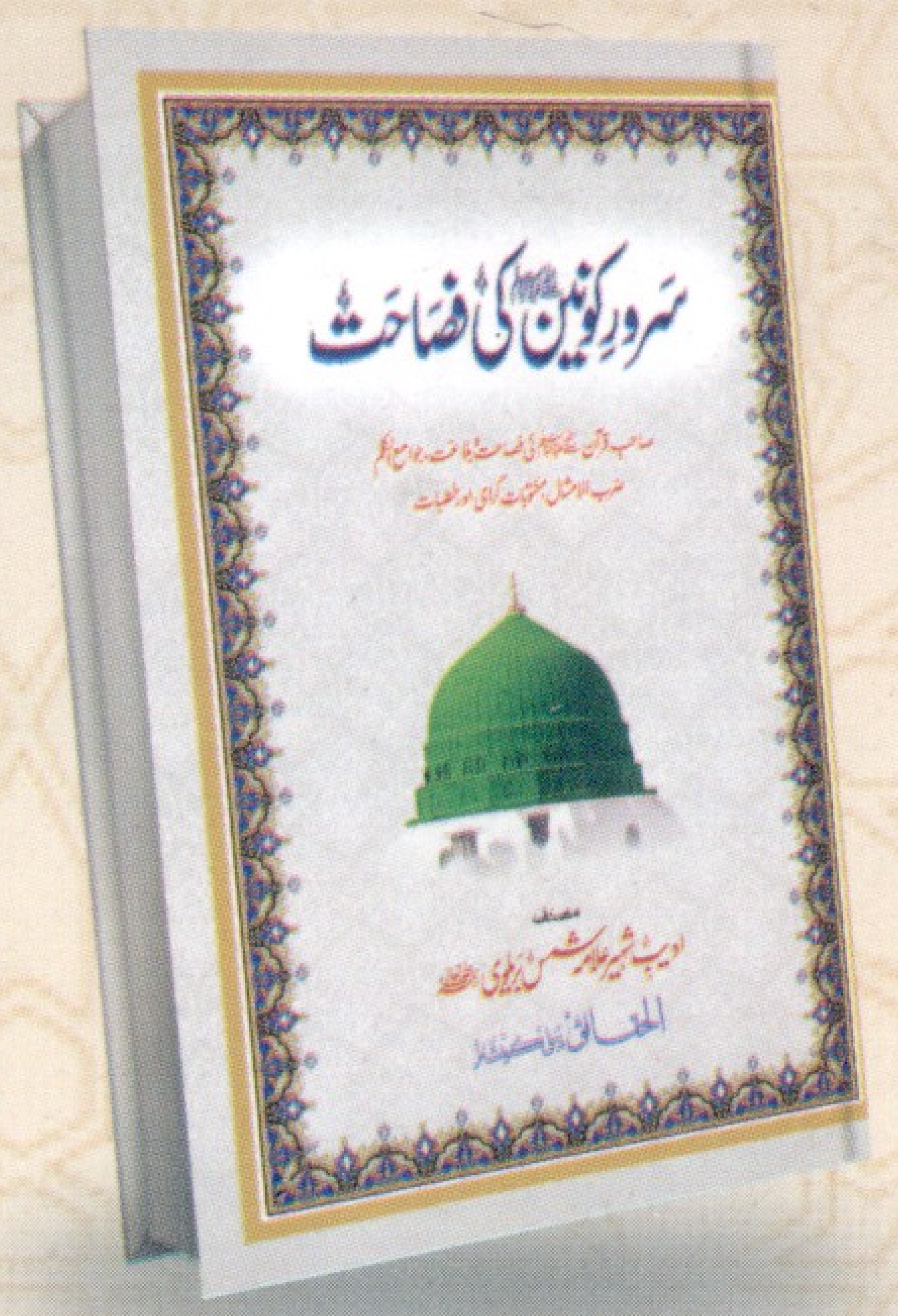
۵۔ محرمان راز کا بیان ہے ہ یہ عصر حاضر کے بعض ''علماء'' کی تالیف ہے اور اسے عوام سے خفیہ رکھا جاتا ہے۔ اس سے اس وقت استفادہ کیا جاتا ہے جب کسی مدرسہ کے صرف پانچ طالب علموں کو بیس ظاہر کر کے خدمت دین کے لیے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے یا بغرض ''تبلیغ اسلام'' سمگلروں سے مفاد حاصل کیا جاتا ہے۔

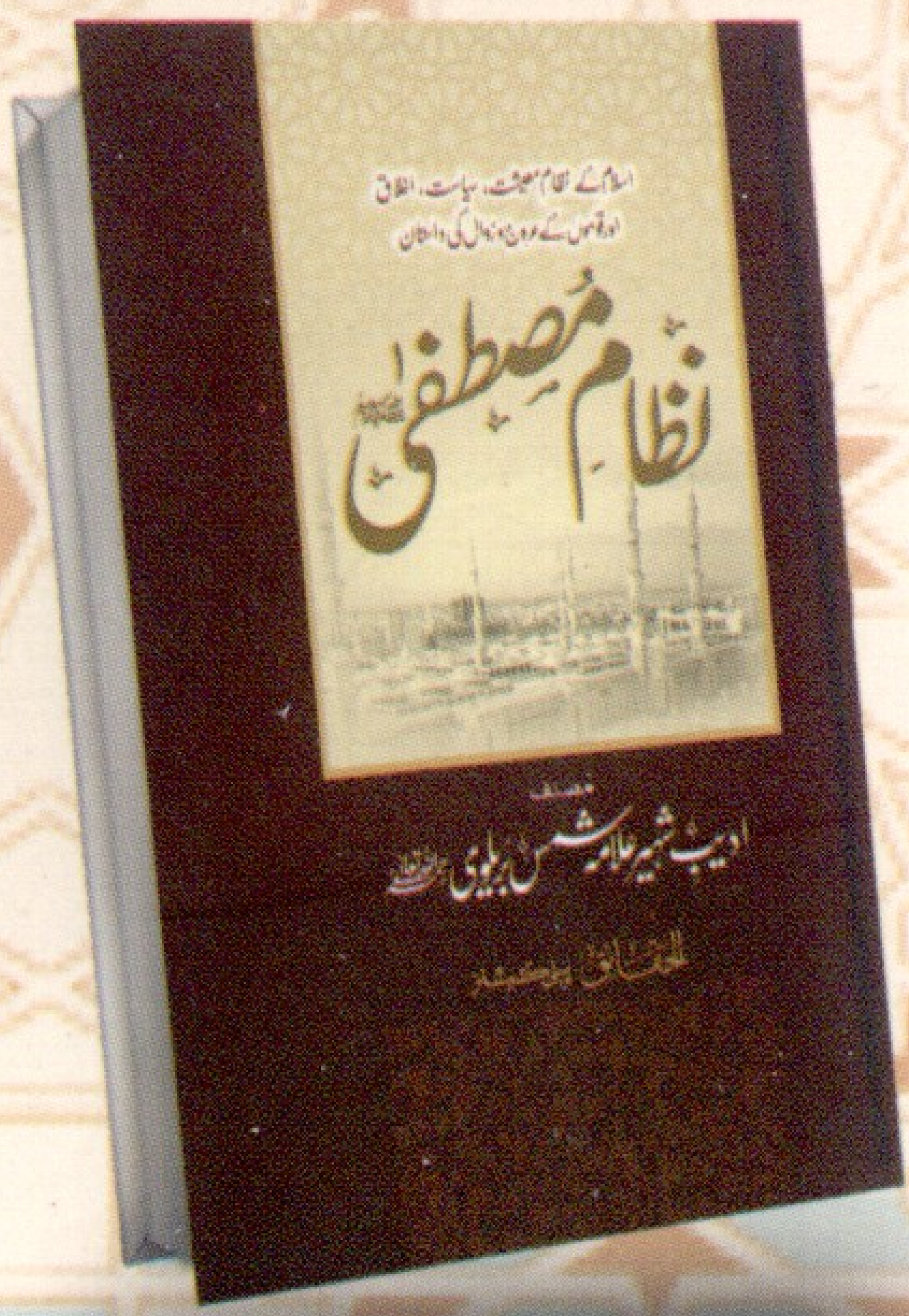
۶۔ مگر جناب ابوالحسن علی ندوی صاحب کے والد جناب عبدالحی صاحب نے ''نزھتہ الخواطر'' جلد ہشتم میں فاضل بریلوی کا ذکر کرتے ہوئے سخت جانب داری کا مظاہرہ کیا ہے۔

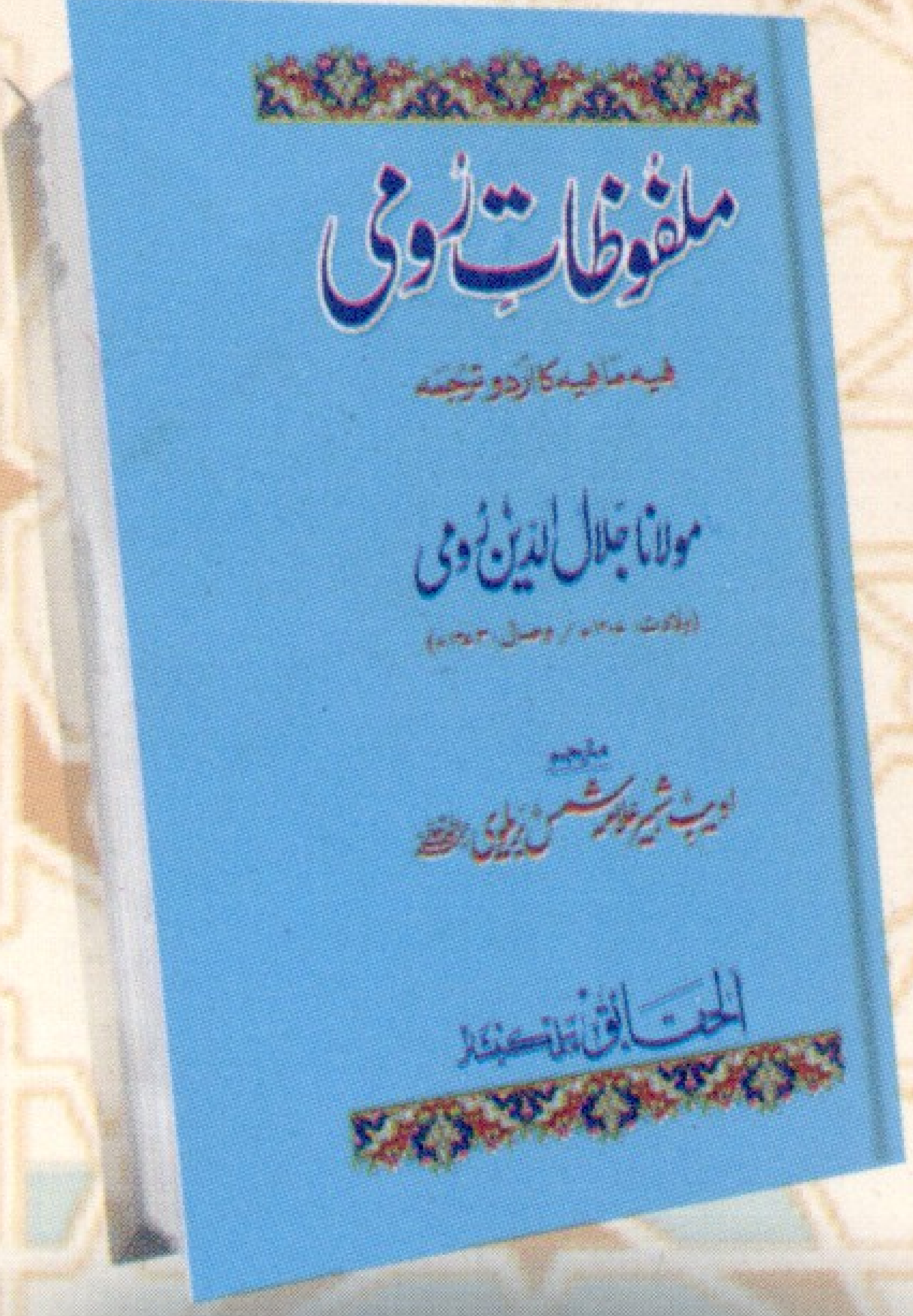
۷۔ ملاحظہ کیجئے۔ ۲۴ جنوری کے اخبارات، خصوصاً ''جنگ'' لاہور، پاکستان ٹائمز لاہور، ''مساوات'' لاہور۔

الحقائق کی مطبوعات









الحقائق پبلی کیشنز

دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور

kashifraza786678@gmail.com

0333-7861895 0300-1090045